

خوبصورتی کیلئے ایک دلفریب تحفہ

اگر آپ اپنے چہرہ و جسم کا رنگ کالے سے گورا تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو ہماری سائنس کے اصولوں سے تیار کی ہوئی فلورا کریم استعمال کریں۔ اس کے چند روزہ استعمال سے آپ کے چہرے پر سے چیچک کے بدنما داغ دھبے اور چھائیاں وغیرہ دور ہو کر آپ کے چہرے و جسم کا رنگ شرطیہ طور پر کالے سے گورا تبدیل ہو جائیگا آپ کے جسم اور چہرے کی رنگت کی یہ تبدیلی آپ کے لئے خوشی اور حیرت ثابت ہوگی۔ لہٰذا ہم دنیا کے سائنسدانوں، ڈاکٹروں اور عام پبلک خریداروں کو چیلنج کرتے ہیں کہ اگر ہماری کریم مندرجہ بالا اوصاف میں ناکام ثابت ہو تو ہم دگنے دام واپس دیں گے۔ بلحاظ صفات اگر اس کریم کی قیمت پچاس (50) روپے بھی رکھی جائے تو تھوڑی ہے۔ مگر رفاہ عام کی خاطر ہم نے اس کی قیمت صرف تین روپے فی شیشی علاوہ خرچ ڈاک مقرر کی ہے جو تقریباً لاگت کے برابر ہے۔ ضرورتمند اصحاب کو ہماری کریم خرید کر فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر جی ایس منوگا۔ انار کلی لاہور



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

عالمگیر سالانہ نمبر ۱۹۴۴ء

فہرست مندرجات ماہ جون ۱۹۴۴ء

علمی و ادبی مضامین

افسانے اور ڈرامے

غزلیں اور نظمیں

(حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا)

ادارہ

ملاحظات

"افسانہ نمبر" کا غلغلہ ادبی فضاؤں میں گونج رہا ہے کہ عالمگیر ایک اور مہکا انگیز مجموعہ پیش کرتا ہے۔!

یہ عالمگیر کا "اکیسواں سالانہ نمبر" ہے۔ سوچیے تو ہر سال تین معرکہ آرا خاص اشاعتیں مرتب کی جاتی ہیں لیکن دیکھنا یہ چاہیے کہ کیا خارجی مشکلات کے علی الرغم عالمگیر کے معنوی معیار پر کوئی ناخوشگوار اثر پڑتا ہے؟ یا کیا عالمگیر "تاریخ ادب" کے اس اہم موڑ پر جدید تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا؟ جہاں تک خارجی مشکلات کا تعلق ہے اس کا تذکرہ ان کالموں میں بارہا ہو چکا ہے کاغذ ناقابل برداشت حد تک مہنگا ہو چکا ہے اور بدقسمتی سے عالمگیر کو سرکاری کوٹا سے بھی مستفید نہیں کیا گیا اس کے باوجود اعلیٰ درجہ کا سفید چکنا کاغذ استعمال کیا جاتا ہے اور ضخامت میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ باقی رہی یہ بات کہ کیا عالمگیر رفتار وقت کا ساتھ دے رہا ہے؟ اس کا جواب عالمگیر کی روز افزوں مقبولیت سے مل سکتا ہے۔ قارئین یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ان کے محبوب ماہنامے کی اشاعت گزشتہ چند ماہ میں تقریباً دگنی ہو چکی ہے اور اس لحاظ سے وہ اردو کے تمام مقتدر اور معیاری ماہناموں کی قیادت کر رہا ہے۔ اس میں مبالغے کا شائبہ تک نہیں "عالمگیر" کو تعداد اشاعت بتانے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی جس کا جی چاہے وہ ڈاکخانہ کے رجسٹروں کی پڑتال کر کے اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔ لیکن اشاعت کی روز افزوں زیادتی سے جہاں عالمگیر کی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے وہاں مصارف میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے تاہم ہماری نظریں خدا کے فضل و کرم کے بعد قارئین کے تعاون پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر وہ نہ صرف اپنی سرپرستی جاری رکھیں بلکہ چند دوستوں میں بھی ترسیع اشاعت کی کوشش کریں اور اس کے علاوہ عالمگیر بک ڈپو سے اپنی ضرورت کی علمی و ادبی مطبوعات بھی طلب کریں تو ہماری مشکلات بڑی حد تک رفع ہو سکتی ہیں اور عالمگیر اس جنگ کے زمانہ میں بھی مستحکم بنیادوں پر بدستور قائم رہ سکتا ہے امید ہے قارئین توجہ فرمائیں گے۔

ہماری دلی خواہش تھی کہ سالانہ نمبر کے مندرجات کا تعارف تفصیل سے کرایا جاتا لیکن افسوس قلت گنجائش کے باعث یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تاہم مختصر الفاظ میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سالانہ نمبر کو ہر جہت سے کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ "مقالات" کا افتتاح علامہ سید جلال الدین افغانی کے شاندار مقالہ سے ہوا ہے اور اشاعات سے بعد ہے امید ہے قارئین اس مقالہ کو پڑھیں گے اور افغانی کے صحیح معنی و مفہوم کو ذہن نشین کر سکیں گے۔ علامہ شبیر احمد برہان پوری نے کافی چھان بین کے بعد ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی کردار نگاری پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ افسانوی ادب میں ایک قابل قدر باب کا اضافہ کرتا ہے۔ "شاہیرادہ بابا کے آٹوگراف" بڑی دلچسپ چیز ہے اور اس کے لیے ہم نادم سیتاپوری صاحب کے ممنون ہیں۔ ناجی صاحب کا مضمون "تاریخ کے ایک نیم متعارف گوشے پر روشنی ڈالتا ہے۔ مولوی ظہور احمد خاں، ناشر ممتاز حسین اور قریشی عبداللہ صاحبان نے "مضامین" میں افسانے کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ افسانے اور ڈرامے سب کے سب جدید تکنیک کے بہترین نمونے ہیں۔ عالمگیر میں رامانند ساگر اور پریتم ناتھ شرما کا شمول نیک فال ہے۔ ان دونوں حضرات کا شمار چوٹی کے افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں طنز، عمیق مطالعہ اور نفسیاتی حقائق کی جھلک ہوتی ہے امید ہے وہ آگے چل کر "عالمگیر" کو اپنے رشحات قلم سے نوازا کریں گے۔ ظہور الحسن ڈار نہایت تیزی سے افسانہ نویسوں کی صف اول کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ "افسانہ نمبر" میں اپنا گھر امتیازی درجہ حاصل کیے بغیر نہ رہا۔ اب "بھوک" کی شدت و کرب ملاحظہ فرمائیے اور افسانہ نویس کی فن کاری کی داد دیجیے۔ میرزا ادیب اور احسان علی شاہ اس مرتبہ بھی آرٹ کی انتہائی بلندیوں پر پرواز کرتے نظر آتے ہیں۔ اختر مرزا نے حیوان کی زبان سے سوسائٹی پر لطیف طنز کی ہے امید ہے باذوق طبقوں سے خراج تحسین حاصل کر سکے گی۔ غلام عباس مولوی کا افسانہ "شاہکار" [illegible] ہے۔ طفیل ملک، شفیق بانو، علی احمد، محمد یونس، شفیق الرحمان، عزیز بیگ، ستور اور ساستی رامنگری کے افسانے بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے دست حقیقت نگار نے قلوپطرہ کو ایک بار پھر زندہ کر دکھایا ہے۔ منظومات کا حصہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ہے۔ یہ خصوصیت صرف عالمگیر کو حاصل ہے کہ [illegible] و قدر ناشناسی کے زمانہ میں بھی اساتذہ سخن کا کلام فصاحت التیام [illegible] کرتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نوجوان طبقہ کی شاعرانہ آواز سے بھی [illegible] یہی وجہ ہے کہ سالانہ نمبر میں قدیم و جدید رنگ دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

خبردار — معلوم ہوا ہے کہ کسی صاحب نے عالمگیر کے خریداروں کی چٹیں چرا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا ہے اس لئے قارئین کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے کہ اگر انہیں کوئی فہرست یا اشتہار وغیرہ بھیجی جائے تو دفتر عالمگیر سے [illegible] اس کے علاوہ قارئین سے درخواست ہے کہ جونہی انہیں اس قسم کا [illegible] تو اس کی اطلاع فوراً دفتر میں بھیج دیں تاکہ مناسب کارروائی کی جا سکے [illegible]

ادارہ

اخبار و افکار

فحش نگاری اور حکومت پنجاب

کچھ عرصہ سے اردو میں فحش لٹریچر کی اشاعت حیرت انگیز طور پر بڑھ رہی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اسے باقاعدہ فن کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جو ادیب اس عجیب و غریب فن کو فروغ دے رہے ہیں وہ اپنے آپ کو "ترقی پسند" اور جدید ادب کے "علمبردار" کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ حالانکہ فحش نگاری کو ترقی پسندانہ ادب سے دور کی نسبت بھی نہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذمہ دار ارکان بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ فحش نگار ادیب ترقی یافتہ ادب کو خواہ مخواہ بدنام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عریاں نویسی کا وہ گورکھ دھندا جو "انگارے" کی صورت میں لکھنؤ کے ایک گوشے سے اٹھا تھا اب "لحاف"۔ "پھسلن"۔ "دھواں"۔ "بد بو"۔ "بارہ گھنٹے" اور بیشمار آزاد نظموں کی آلائشوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہوا ایک عفونت ریز طوفان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور وقت آگیا ہے کہ حکومت کی طرف سے اس کی روک تھام کے لئے انسدادی تدابیر اختیار کی جائیں ہمیں مسرت ہے کہ اخبارات اور رسائل وغیرہ کے احتجاج سے متاثر ہو کر حکومت پنجاب نے اس ضمن میں موثر قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے چنانچہ روزنامہ "پربھات" کے نامہ نگار کو معلوم ہوا ہے کہ حکومت ایسے اداروں کے خلاف شدید ترین کارروائی کرے گی جو فحش نگاری کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو ہم حکومت کو اس فیصلے پر مبارکباد کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں بعض مشکلات بھی ہیں جن پر عبور پانا حکومت کا کام ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ جب بھی دفعہ ۲۹۲ کے ماتحت کارروائی شروع کی جاتی ہے تو ملزم بڑے بڑے آدمیوں کی سفارشیں لے آتے ہیں اور عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ روزنامہ "انقلاب" لکھتا ہے "جب بھی کسی شخص کے خلاف فحش نگاری کا مقدمہ قائم کیا جاتا ہے تو بعض اچھے بھلے معزز آدمی جن میں ایم ایل اے اور سول سروس کے بعض افسر بھی شامل ہیں ملزموں کے حق میں شہادتیں دیکر اس قسم کے لٹریچر کو ترقی پسند ادبیات میں شامل بتاتے ہیں۔ ایسے حالات میں حکومت کو اکثر ناکامی ہوتی ہے۔"

(۲۹ مئی ۱۹۳۶ء)

دراصل بات یہ ہے کہ آج کا ترقی پسند ادیب بہت زیادہ پریشان خیال واقع ہوا ہے۔ اور خیالات و افکار کے لحاظ سے اتنا پختہ کار نہیں ہوتا کہ نوا فتوں کے ہجوم میں کبھی اپنے بنیادوں پر قائم رہ سکے۔ اس لئے قانون کی تلوار دیکھتے ہی اس کی فطری بزدلی عود کر آتی ہے اور وہ خائف و خستہ ہو کر حکام کے پاؤں پر گر پڑتا ہے نیز اس کے بعد اپنی جان بخشی کے لئے قدامت پرستوں کا سہارا لیتا ہے۔ اور سفارشیں اکٹھی کر کے عدالت میں بلکہ معافی نامے کے بعد دوسرا معافی نامہ داخل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ فحش نویس ادیبوں کی پرانی تکنیک ہے۔ اس لئے حکومت کو اس سے آگاہ رہنا چاہئے۔ لیکن اس مشکل کا بہترین حل یہ ہے کہ ایک مجلس مشاورت قائم کی جائے جو اخباروں، کتابوں اور رسالوں کی چھان بین کرتی رہے اور قابل مواخذہ مضامین کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لئے حکومت کو متوجہ کرے۔ اس مجلس میں مستند ادیبوں اور صحیح الخیال نقادوں کی شرکت ضروری ہے تاکہ ایک طرف تو ملزم کو یہ شکایت نہ ہو کہ اس کی "ادبی کاوش" کو قانون کی چھری سے مجروح کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف نقادوں کی آرا کی روشنی میں عدالت بھی کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکے۔ لیکن اس سلسلے میں حکومت پر بہت زیادہ انحصار نہیں رکھا جا سکتا قوم کو خود بھی ان مسائل کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو تجارتی اغراض کے لئے نئی پود کو فحاشی و بداخلاقی کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اگر بلند پایہ نقاد اور کہنہ مشق صحافی ادب کو اغراض کے بازار میں لے آئیں اور ایسے ادبا و شعرا کی حوصلہ شکنی کریں جو اخلاق باختگی اور ہوس پرستی ہی کو ترقی پسندانہ ادب کا جزو خیال کرتے ہیں تو نئے ادیبوں کو چند ٹکیوں کے عوض اخلاق فروشی کی ضرورت محسوس نہ ہوگی اور وہ رسائل بھی جلد اپنے ختم ہو سکیں گے جو ترقی پسند ادب کا چولا اوڑھ کر ان غلاظتوں اور گندگیوں کو عوام میں بکھیر رہے ہیں جن کی بدبو سے انسانیت و شرافت کو ابکائیاں آنے لگی ہیں۔

علامہ سید جمال الدین افغانی کے افادات عالیہ سے!

حقائق و معارف

قومی تعصّب یا عصبیّت

قال اللہ تبارک وتعالیٰ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء۔ قلیلاً ما تذکرون (اعراف) ترجمہ:۔ "جو کچھ تمہاری طرف اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوا اس کا اتباع کرو اور اللہ تعالےٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی اور سرپرست مقرر کر کے ان کی پیروی مت کرو۔ تمہاری عادت ہے کہ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو"۔

"تعصب" کا لفظ خصوصاً ممالک شرقیہ میں عام طور پر زبان زد خلائق ہو گیا ہے۔ ہر ایک سپیکر جو کسی مجلس میں لیکچر دینے کے لئے کھڑا ہو اپنی تقریر کے دوران میں "تعصب" کا لفظ کئی دفعہ ضرور زبان پر لاتا ہے یہاں تک کہ اسی لفظ سے پیراگراف شروع ہوتا ہے اسی پر اس کا انجام ہوتا ہے اور اس کے اثنا میں بھی جا بجا یہ لفظ گھسیڑا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفروضہ مفہوم ان کے نزدیک ہر ایک آفت اور خرابی کی جڑ اور تمام تکلیفوں کا سرچشمہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کامیابی کے راستہ میں عظیم ترین سنگِ راہ ہے اور تمام نقائص اور بداخلاقیوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اہل فرنگ کے مقلدین جن کو اپنے مقتداؤں کی ہر ایک ادا پسند ہے اور جو حق و باطل میں تمیز کرنا نہیں جانتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر اس کی خرابیاں بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی عیوب میں وہ سب سے بڑھ کر بڑا عیب ہے۔ اور کسی سے پرلے درجہ کی نفرت دلانے کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ "متعصب" ہے جس کی مزید توضیح کے لئے وہ فینٹک کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی رائے سے (کسی دلیل کی بنا پر) اختلاف رکھتا ہو تو وہ نہایت طنز آمیز لہجہ میں اس کو "متعصب" کہہ دیتے ہیں جو ان کے زعم باطل میں سو دلائل کے برابر ایک دلیل ہے اور اگر کسی ایسے شخص سے وہ ملاقی ہوں تو فوراً ناک بھوں چڑھا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیں۔

آخر لفظ "تعصب" کا وہ کون سا مفہوم ہے جس کی وجہ سے وہ ان لوگوں کے نزدیک ان تمام مفاسد کی علت العلل قرار پایا ہے اور تمام نقائص اور عیوب کو اسی کا فروع تصور کیا جاتا ہے۔ کیا اس لفظ کا مفہوم درحقیقت اس قدر خوفناک ہے؛ (یا محض ایک ہوّا ہے)

تعصّب کا لفظ عربی زبان کا ہے اس لئے اس کا مفہوم عربوں کی لغت میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ عربی ڈکشنریوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ماخذ عَصَبہ کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں انسان کے وہ رشتہ دار اور اقربا جو اس کے حق میں دست و بازو کا حکم رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت اس کی حمایت اور اعانت کرتے ہیں اور اگر اغیار و اجانب میں سے کوئی اس پر دست درازی کرنا چاہے اور اس کے جان و مال یا آبرو پر حملہ کرے تو وہ اس کی مدافعت کے لئے سینہ سپر ہوں۔ گویا ان کو اس شخص کے ساتھ جس کے وہ عَصَبہ ہیں وہی نسبت ہے جو اعصاب کو جسم کے ساتھ ہے۔ اسی طرح آدمی اپنے عصبہ کے ذریعہ سے دوسروں کے مقابلہ میں طاقت حاصل کرتا ہے۔

تعصّب مصدر ہے اور اس وصف کا نام ہے جو عَصَبہ لوگوں میں پائی جاتی ہے یعنی اس کی حمایت و اعانت کرنا اور اس کی جان و مال اور آبرو کو اپنی جان و مال و آبرو سمجھنا جس کے وہ عصبہ ہیں۔ یہی صفت اگر قوم کے افراد میں پائی جائے تو اس کو اس لفظ کے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے قومی تعصب یا عصبیت کہیں گے اور اگر تم عقل انسانی سے بے بہرہ نہیں ہو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ قوم کی تمام تر طاقت کا انحصار اسی قومی تعصب یا عصبیت پر ہے۔ جس کے مفہوم کو اس قدر بھیانک اور خوفناک ظاہر کیا گیا ہے۔ یہی وصف تو ہے جس کی بدولت قوم کے متفرق افراد میں رابطۂ جمعیّت ظہور میں آتا ہے۔ کسی قوم کو صحیح معنو میں قوم اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ اس کے افراد اس صفت میں ممتاز نظر آئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قوم بمنزلہ ایک جسم کے ہوگی۔ جو اگرچہ مختلف اجزا و اعضا پر مشتمل ہے لیکن بایں ہمہ اس کے تمام نظامات ایک ہی مدبر روح کے ماتحت ہیں لیکن اگر یہ صفت کسی قوم

میں موجود نہیں تو اس کی مثال ایک ایسے جسم کی ہوگی جس سے روح نکل چکی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے یعنی بدن کا ایک ایک ذرہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر ہوا کے جھونکوں کا شکار ہوگا۔ اسی وحدت اور اتحاد کی بدولت جو قومی تعصب یا عصبیت کا نتیجہ ہے ایک قوم دوسری قوم سے گوئے سبقت لے جانے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی عزت و رفعت اور طاقت و قوت کا راز مضمر ہے اور یہی تنافس اور مقابلے کی سپرٹ ہے جو افراد اور اقوام کو مدارج کمال طے کراتی اور بام رفعت پر پہنچاتی ہے۔

"تعصب" کو ایک "روح کلی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو قوم کے تمام افراد میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور اس قوم کا ایک ایک فرد بجائے خود اس روح کلی کے حواس اور مشاعر ہیں اس لئے جب ان حواس اور مشاعر میں سے کسی پر بھی خارج سے کوئی ناموافق اثر ڈالا جاتا ہے تو اس روح کلی کو فوراً اس اجنبی اثر کا احساس ہوتا ہے اور طبعاً وہ اس کی مدافعت کے لئے متوجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی تعصب کی صفت ہے جس سے حمیت عامہ اور قومی ہمدردی کے نتائج ظہور میں آتے ہیں۔ اسی روح کی عمومیت سے احاد امت کے نفوس میں ترفع اور عالی نفسی پیدا ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی ذلت برداشت کرنا گوارا نہیں کرتے اور نہ کسی ایسی خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے ان کی قوم پر کوئی آفت یا ضرر اور نقصان عاید ہو۔

نیز ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کی طبائع کا مستقیم ہونا اور فضائل نفسیہ کو ترقی دینا اسی نسبت سے قوی یا کمزور ہوتا ہے جس نسبت سے کہ اس کے افراد میں تعصب یا عصبیت کی روح کارفرما ہو۔ زندہ جسم کا کوئی عضو بھی جو بےحس اور مفلوج نہیں ہو چکا ہے اس جسم کے دوسرے اعضا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا انسان کے سر کو ہمیشہ بلند رہنے اور قوائے عقلیہ کے مستقر ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ پاؤں میں تکلیف ہو تو وہ اس کا احساس نہ کرے اور اس کی ہمدردی میں شریک نہ ہو؎

چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

اسی طرح پاؤں کا ہر وقت زمین سے مس کرنا اور بدن کے اجزا میں سب کے نیچے رہنا ان کی اہمیت کو کم نہیں کرتا؎

کاندریں دیر چو طاؤس بکار است مگس

بلکہ تمام اعضاء جوارح اپنی اپنی جگہ پر حفاظت و حمایت بدن اور [illegible] جسم کے فرائض بجا لاتے ہیں۔ اسی تعاون و تناصر کا نام تعصب ہے

بنا بریں اگر کسی قوم کے افراد میں تعصب کی روح معدوم ہو جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ قوم من حیث القوم مضمحل اور فنا ہو جائے گی اور جو افراد اس قوم کے باقی ہیں ان کی مثال ان منتشر اور پراگندہ اجزا و ذرات کی ہے جو فنائے جسم کے بعد باقی رہتے ہیں۔ اور جن میں سے بعض تو دوسرے اجسام کا جزو بدن بن جاتے ہیں جو قوانین کون و فساد کا مقتضا ہے۔ یا بصورت دیگر ان پر اس وقت تک موت کے احکام طاری رہتے ہیں جب تک ان میں از سر نو نفخ روح نہ ہو۔ اسی طرح جب کسی قوم میں تعصب یا عصبیت کم یا زائل ہو جاتی ہے تو بطور اس کے نتیجہ کے (حسب منشا قانون قدرت کے) ان میں بزدلی آجاتی ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنا چھوڑ دیتے ہیں جس کے بعد ان کے آپس کے روابط منقطع ہو جاتے ہیں اور ان میں تشتت اور انتشار پیدا ہو کر تقاطع کے جراثیم اپنا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اغیار و اجانب کو مداخلت کا موقع مل جاتا ہے اور وہ انتہائی ذلت اور بےبسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) ہو کر اس کے افراد میں از سر نو تعصب یا عصبیت کی روح پھونک دی جائے اور وہ پھر ایک زندہ قوم بن جائے۔

بیشک تعصب بھی دوسرے اخلاق فاضلہ کی طرح افراط اور تفریط کی آمیزش سے خالی نہیں اور قابل تعریف صرف اس کا درجہ اعتدال ہے جو ہر ایک چیز کا درجہ کمال سمجھا جاتا ہے اور بس۔

تفریط ایک نقص ہے جس کی برائیاں پہلے بیان کی جا چکی ہیں اسی طرح افراط بھی مذموم ہے اور وہ یہ ہے کہ تعصب کے نشہ میں سرشار ہو کر جور و ظلم اور تعدی و دست درازی کا ارتکاب کرے یعنی جس کی عصبیت کے لئے وہ کوشاں ہے بجا و بےجا اس کی حمایت کرے اور صرف اسی کو اعزاز و اکرام کا مستحق خیال کرے دوسروں کو نفرت اور استحقار کی نگاہ سے دیکھا کرے اور چوپایہ جانوروں سے زیادہ انسان کی [illegible] ان کے دل میں نہ ہو۔ الغرض سوائے اپنی قوم کے کسی دوسرے کے حقوق کا قائل نہ ہو اور نہ ہی ان کے جذبات کی کچھ رعایت کرے۔ یہ سب افراط کے نتائج ہیں جس کا سبب عدل اور اعتدال کے صراط مستقیم سے انحراف کرنا ہے۔ اس قسم کے تعصب کے ضرر ارباب بصیرت کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ اس سے قوم کی نیکنامی اور شہرت پر بٹہ لگتا ہے اور اس کی مجد اور عظمت اس سے کم ہو جاتی ہے کیونکہ اجتماعات بشریہ کا نظام قائم رکھنے کے لئے عدل و انصاف کے قوانین کی پابندی

کرنا نہایت ضروری عنصر ہے اور اسی پر اقوام کی زندگی کا انحصار ہے اور ہر ایک طاقت جو قانون عدل کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے۔ اس کا مآل یقیناً اس کا زوال ہوگا۔ تعصب کا یہ درجہ (درجہ افراط) شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ ہے جس کا بیان ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ "جو کوئی تعصب کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں۔"

اگرچہ تعصب کا مفہوم اپنی قوم کے افراد کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور بوقت ضرورت ان کی اعانت کرنا ہے جس کا موجب اصلی رابطۂ نسب اور سوسائٹی کے افراد کا باہمی اجتماع ہے لیکن اہل عُرف نے اس کے مفہوم میں اور وسعت پیدا کر دی ہے اور وہ اس کا اطلاق کسی دینی اور مذہبی جماعت کے افراد کے باہمی تعاون اور تناصر پر بھی کرنے لگے ہیں جن کا باہمی ارتباط صرف رشتۂ مواصلت مذہبی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس قسم کے تعصب کو وہ لوگ نہایت مبغوض اور مکروہ سمجھتے ہیں۔ جن کی ذہنی نشوونما کی ذمہ دار یورپین تعلیم و تربیت ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کا اس طرح خیال کرنا کسی معقول پسندی کا نتیجہ نہیں کیونکہ جس طرح کسی قوم کے متفرق افراد کے لئے نسب یا زبان کا رابطۂ جامعہ ایک مرکز پر جمع ہونے کا موجب ہو سکتا ہے اور ان میں تعصب کی روح پیدا کر سکتا ہے (جس کو بلحاظ اس کے اہم نتائج کے نہایت ضروری خیال کیا جاتا ہے اور اس کو "قومی سپرٹ" سے تعبیر کر کے سٹیجوں پر کھڑے ہو کر نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اس کی مدح سرائی کی جاتی ہے) اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ کوئی جماعت جس کے افراد میں اتحاد مذہب پایا جاتا ہے ان کے اس اتحاد مذہبی کو باہمی ارتباط اور تعاون و تناصر کا ذریعہ کیوں نہ قرار دیا جائے۔ اگر نسب اور زبان اور ملک کا اتحاد کسی قوم کی قومیت بنانے کے لئے کافی ہے تو دین اور مذہب کے اتحاد سے جس کا رشتہ سب سے بڑھ کر مضبوط خیال کیا گیا ہے (اور در حقیقت ہے بھی ایسا) بطریق اولیٰ قومیت کی بنیادیں مستحکم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ نوع انسانی کے اجتماعی ارتقا کے مختلف ادوار میں بلا تفاوت کبھی نسب اور کبھی مذہب کا رابطہ کسی قوم کے شیرازۂ قومیت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا ذریعہ رہا ہے اور ان دونوں قسم کے روابط سے عظیم الشان قومیں وجود میں آتی رہی ہیں جن کے جلیل القدر کارنامے تاریخ میں مذکور ہیں۔

علاوہ ازیں واقعات تاریخی سے قطع نظر کر کے بھی اگر دیکھا جائے تو عقلاً کسی ایک ہم نسب کے دوسرے ہم نسب کی حمایت اور نصرت کرنے اور کسی ہم مذہب کے دوسرے ہم مذہب کے ساتھ اعانت کرنے میں ذرا بھی فرق نہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل ادیان کا تعصب یا عصبیت جس کی بنا اتحاد مذہب پر ہے اگر حدود اعتدال سے تجاوز نہ کرے اور انسان کو جور و ظلم اور نقض عہد یا خیانت ذمہ پر آمادہ نہ کرے تو کچھ شک نہیں کہ وہ تمام دوسرے انسانی فضائل میں ایک عظیم ترین فضیلت ہے جس سے بیشمار فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں اور وہ کسی قوم کے افراد میں قومیت کی روح پھونک کر اس کو بام رفعت پر پہنچا دینے اور مجد و سیادت اور عظمت کے اعلیٰ ترین مراتب پر فائز ہونے کا بہترین ذریعہ اور مقدس ترین رابطہ ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جس کے اتحاد جنس وغیرہ کے روابط مضمحل ہو کر اسی ایک رابطۂ دینیہ میں مدغم ہو جائیں۔ جس کی تاریخی مثال خلافت راشدہ کا زمانہ اور عہد سلف کا اسلام اور مسلمین ہیں۔

ہم نے رابطۂ دینیہ کو مقدس ترین رابطہ کہنے میں کوئی غلطی نہیں کی کیونکہ اسی کی بدولت شخصی اختلافات مٹ کر عزیمت اور عمل کا اتحاد پیدا ہے اور سب کی نظریں ایک ہی نصب العین پر لگی رہتی ہیں اسی طرح قبائل کی باہمی نفرت اور عداوت جس کی بنا دنیاوی اغراض اور مقاصد پر ہوتی ہے اسی کی برکت سے محو ہو جاتی ہے اور تمام وہ اقوام جو جنس، زبان اور ملک کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متباین اور متضاد ہوتی ہیں اتحاد دین و مذہب کی وجہ سے کامل یکرنگی اختیار کر لیتی ہیں، اور سب کی ایک متحدہ خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے دین اور مذہب کی عظمت اور اس کے مجد و شرف کا سکہ دنیا بھر کی دوسری قوموں پر بٹھا دیں۔ جس میں کہ خود اُن کی قومی عظمت اور مجد و شرف کا راز پوشیدہ ہے ان نتائج کا شاندار ہونا یا نہ ہونا اسی تعصب یا عصبیت کی قوت اور ضعف پر منحصر ہے۔ عقل سلیم ان باتوں کو تسلیم کرتی ہے اور تاریخی واقعات اس پر شاہد ہیں لیکن برخلاف اس کے صرف جنس اور زبان یا ملک کا اتحاد نہ تو اس قدر قوی الاثر عصبیت کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس سے ایسے شاندار نتائج ظہور میں آ سکتے ہیں۔

ہمارے زمانے کے بعض مسلم نما زندیق "تعصب دینی" کا جو حمیت اور حرارت مذہبی کا نتیجہ ہے نہایت بدنما پیرایہ میں اظہار کرتے ہیں اور اس کی خرابیاں بیان کرنے سے نہیں تھکتے۔ ان کا خیال ہے کہ تعصب مذہبی جو انسان کو صرف مذہب کی بنا پر اپنے ہم مذہبوں کی حمایت اور اعانت پر اُبھارنے کا موجب ہوتا ہے وہ کسی قوم کے حق میں ان کی ترقی تہذیب و تمدن کا مانع اور اُن میں علم اور فلسفہ کی روشنی پھیلنے کے راستہ میں حائل ہے۔ بقول ان کے مذہبی تعصب جہالت کا نتیجہ ہے۔ اور وہ آدمی

کو اُس کے مخالف مذہب لوگوں پر ظلم و تعدی کرنے اور ان سے نفرت کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو معاشرہ اجتماع کے لئے مضر ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ تمام مفاسد اور خرابیاں "تعصب مذہبی" کو دور کرنے سے دفع ہو سکتی ہیں۔ اور عقول انسانی اور اذہان بشریہ کو مذہب کے تسلط اور اس کی گرفت سے آزاد کر دینا ہی اس کا واحد علاج ہے۔ یہاں تک کہ وہ بعض اوقات یہ کہنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے کہ یہ "تعصب مذہب" اسلام ہی کا آوردہ اور اسی مذہب کے پیروؤں کے ساتھ مخصوص ہے۔

ان کا یہ کہنا سراسر جھوٹ اور باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ہی نے سب سے پہلے اکتساب علوم اور توسیع معارف کی تاکید فرمائی ہے اور تحصیل علم کو ہر ایک مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا ہے۔ وہ انسان کے لئے بہترین اخلاقی معلم ہے اور اپنے متبعین کو اخلاقی فضائل اور آداب جمیلہ کے زیور سے آراستہ ہونے کی تعلیم فرماتا ہے ان کو عدل اور انصاف کی شدت کے ساتھ پابندی کرنے حتیٰ کہ اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی عادلانہ انصاف کا برتاؤ کرنے کی تلقین فرماتا ہے اور ان میں شفقت اور ہمدردی عامہ کی حس کو بیدار کرتا اور تحریک دیتا ہے اگر تمہیں اس میں شک ہے تو ذرا اسلام کی تاریخ اٹھا کر پڑھ لو۔ اور دیکھو کہ عربوں کی وہ قوم جو وحشی اور جاہل ہونے میں شہرۂ آفاق اور ضرب المثل تھی وہی قوم اسلام کی تعلیم اور پیغمبر اسلام کی برکت سے علم و حکمت کی علمبردار ہو گئی۔ اور تہذیب و تمدن میں دوسری اقوام عالم کے لئے نمونہ اور رہنما ہونے کا اس کو فخر حاصل ہوا۔

بیشک "قومی تعصب" کی طرح "مذہبی تعصب" میں بھی بعض اوقات غلو اور افراط پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ جور و تعدی اور اس کا نصب العین مخالفین کا دنیا سے مٹا دینا ہوتا ہے جس کی نظیر حروب صلیبیہ میں پائی جاتی ہے جب کہ مغربی ممالک کے مسیحیوں نے ممالک مشرقی کے مسلمانوں پر صرف اس لئے یورش کی تھی کہ ان کا وجود ان کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ ان ملکوں کا فتح کرنا یا ان ممالک میں مسیحی دین کی دعوت اور تبلیغ کا فرض ادا کرنا ان کے پیش نظر نہیں تھا یا جیسے کہ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے اندلس کے مسلمانوں سے برتاؤ کیا کہ محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کو ملک بدر کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے ظلم و ستم کئے۔ اسی طرح جب پہلے پہل عیسائی مذہب کو سلطنت کا اقتدار حاصل ہوا تو ان کے بادشاہ نے یہودیوں کو قدس میں جمع کر کے ان کو زندہ جلا دیا لیکن ایسی مثالیں بہت کم پائی جاتی ہیں اور کسی اہل مذہب کا یہ فعل ان کی مذہبی تعلیم کا نتیجہ اور جائز تعصب پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تعصب میں غلو اور افراط کرنے کی مثالیں ہیں۔ جس کا ذکر ہم نے اس پیراگراف کے آغاز پر کیا ہے اور اس سے پہلے بھی جس کی بابت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ خود مذہب نے (بشرطیکہ وہ سچا مذہب اور اللہ تعالےٰ کا نازل کردہ ہے) کبھی اس قسم کے تعصب کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہمارا یہ قول ہے کہ تعصب مذہبی میں اس قدر افراط اور غلو کرنا جائز یا مستحسن ہے معاذ اللہ۔

مسلمانوں میں بھی بعض اوقات مختلف ایسے گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے مذہبی تعصب میں غلو اور افراط کا فی الجملہ ارتکاب کیا لیکن ان کا افراط اس حد تک نہیں پہنچا کہ وہ اپنے مخالفین کے استیصال اور ان کو صفحہ ہستی سے معدوم کر دینے پر کمربستہ ہو جائیں۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب مسلمان فاتحین نے جزیرۃ العرب کی حدود سے قدم باہر رکھا اور ایسے ممالک فتح کئے جہاں مختلف مذاہب اور ملل کے پیرو موجود تھے تو انہوں نے یہ قصد ہرگز نہیں کیا کہ ان اقوام کو نیست و نابود کر دیں اور نہ ہی انہوں نے اپنے تسلط اور اقتدار کو ناجائز طور پر ان کے برخلاف استعمال کیا۔ چنانچہ آج بھی اسلامی حکومتوں میں مختلف اقوام آباد ہیں جن کے عقاید اور رسوم مذہبی سے کچھ تعرض نہیں کیا جاتا اور وہ نہایت امن کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان ملک گیری توسیع اور استعمار فتوحات کے دلدادہ تھے اور جو کوئی بھی ان کے سیلاب فتوحات کو روکنے کی کوشش کرتا یا ان کے اسلامی تسلط اور اقتدار قائم کرنے کے راستہ میں سنگ راہ ہوتا وہ اس سے نہایت سختی کا برتاؤ کرتے لیکن بایں ہمہ وہ ہر ایک مذہب کا احترام کرتے تھے۔ ان کے حقوق ذمیت کے مراعات میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ جو غیر مذہب کے لوگ ان کا تسلط اور ان کی حکومت تسلیم کر لیتے تھے وہ ان کی ہر ایک طرح سے حمایت کرتے تھے چنانچہ ان کے مذہب کا ایک اصول ہے جو تمام مسلمانوں میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ لهم مالنا وعليهم ما علينا (یعنی اہل ذمہ کے وہی حقوق ہیں اور وہ ان تمام فوائد کے مستحق ہیں جن کا استحقاق خود ہم مسلمانوں کو حاصل ہے اور ذمہ داریاں بھی ان پر وہی عاید ہونگی جو ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں) ان کا دستور العمل اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان واجب الاذعان تھا کہ "يا ايها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على انفسكم او الوالدين والاقربين (پ۵) ترجمہ۔ مسلمانو! انصاف پر نہایت اچھی طرح قائم رہو اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر ہمیشہ اظہار حق کرو۔ چاہے تمہاری اس حق گوئی سے خود تمہاری ذات کو یا تمہارے والدین کو یا تمہارے رشتہ داروں کو نقصان کیوں نہ پہنچے

البتہ یہ اور بات ہے کہ بمقتضائے بشریت ان سے کسی قسم کی بے اعتدالی ظہور میں آئی ہو ؎

آدمی از سہو و خطا پاک نیست — آب رواں بے خس و خاشاک نیست

مسلمانوں کے تعصب مذہبی میں غلو نہ کرنے کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ کسی غیر مذہب کے آدمی کو مناصب جلیلہ کے حاصل کرنے سے نہیں روکتے ہیں۔ چنانچہ مختلف دول اسلام کے عہد حکومت میں جب کہ ان کے تسلط و اقتدار کا زمانۂ شباب تھا۔ اور ان کی طاقت نقطۂ عروج پر تھی اس وقت میں بھی انھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیروؤں کو حسب لیاقت ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اس کے برابر رواداری اور انصاف آج مغربی اقوام کی آئینی حکومتوں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر بھی مسلمانوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تعصب مذہبی کی وجہ سے دوسروں کے حقوق پامال کرتے اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔

باوجودیکہ مسلمانوں کو دولت اسلام کے آغاز کے زمانے میں پوری قوت اور اقتدار حاصل تھا۔ اور جدھر بھی عنان عزیمت کو پھیرتے تھے فتح اور کامیابی ان کا استقبال کرتے تھے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی انھوں نے دوسری اقوام کے لوگوں کو قبول اسلام پر مجبور نہیں کیا صرف تبلیغ پر اکتفا کی جاتی تھی۔ اور اگر ان کی تبلیغ اور دعوت کو رد کیا جاتا تو وہ اپنی حکومت اور تسلط تسلیم کرانے کے نشان کے طور ان سے ایک برائے نام رقم یا ٹیکس سالانہ بنام "جزیہ" وصول کرتے۔ جو دوسری حکومتوں کے تحصیل مالیہ کے قائم مقام تھا۔ اس برائے نام ٹیکس سالانہ ادا کرنے کے صلے میں ان کو مسلمانوں کے برابر شہری حقوق مل جایا کرتے چنانچہ آج تک کتب فقہ میں یہ مسائل موجود ہیں۔ برخلاف اس کے رومی اور یونانی عیسائیوں نے دنیاوی حکومت اور تسلط و اقتدار حاصل کر لینے کے آغاز پر یہ کیا کہ جس خطہ ملک کو بھی انھوں نے فتح کیا وہاں کے باشندوں کو مسیحی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا چنانچہ مصر اور شام پر مسلط ہوئے تو وہاں کے لوگوں سے یہی سلوک کیا۔ بلکہ خود بلاد یورپ میں بھی ان سے اس قسم کی حرکات سرزد ہوئیں۔

بہرکیف یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات یہ بتانی تھی کہ کوئی ایسا شخص جس کی عقل ماؤف نہیں تعصب مذہبی کے درجہ اعتدال کو نقص اور عیب خیال نہیں کرے گا۔ خصوصاً جبکہ وہ قومی تعصب کو قوم پرستی اور حب الوطنی وغیرہ شاندار القاب سے تعبیر کرتا اور اس کو نہایت اعلیٰ اسپرٹ خیال کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ بحالیکہ تعصب کی ان دونوں اقسام میں ذرا بھی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ مذہبی تعصب "جذبۂ قومیت" کے مقابلہ میں مقدس تر اور مفید تر جذبہ ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اور کس دلیل سے قومی اور وطنی تعصب کو تو اشرف الفضائل خیال کیا جاتا ہے اور اس کو قومیت اور حب الوطن وغیرہ رعب افگن الفاظ سے تعبیر کر کے اس کو عمرانی ترقی کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں "تعصب مذہبی" گو وہ حد اعتدال پر ہو ایک ناجائز اور قابل نفرت نقص اور سب سے بڑا انسانی عیب خیال کیا جاتا ہے۔ خود مسلمانوں کی تو یہ حالت ہے لیکن اہل یورپ کو بالتحقیق معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد و ارتباط کا قوی ترین ذریعہ ان کا رابطۂ دینیہ ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کئے ہوئے ہے انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی طاقت کا راز تعصب دینی میں ہے اور چونکہ یہ یورپین اقوام مسلمانوں کے بلاد و امصار اور ان کی حکومتوں اور ان کے مقبوضات پر خود قابض اور متصرف ہونا چاہتی ہیں اس لئے اُن کی طاقت کو کمزور کرنے اور اُن میں شکست و انتشار پیدا کرنے کے لئے جو اُن کے حصول مقصد کا قوی ترین ذریعہ ہے ان کو یہ مناسب معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے اس رابطۂ اتحاد کو کمزور بنا کر بالآخر کلیتہً تحلیل کر دیں۔ جس کے لئے انھوں نے یہ طریق کار اختیار کیا ہے کہ تبلیغ (پروپیگنڈا) کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں سے مذہبی تعصب کو دور کر دیا جائے۔ تاکہ اس مقدس رابطہ کے زائل ہو جانے پر ان میں تفرق اور پراگندگی پیدا ہو۔ ان کا علاج مطلوب ہے، چنانچہ مذہبی تعصب کے متعلق جو نفرت انگیز اور حقارت آمیز خیالات آج جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اکثر افراد میں پائے جاتے ہیں وہ اسی زہریلے پروپیگنڈا کے اثرات اور نتائج ہیں۔ یہ پروپیگنڈا اسلامی ممالک اور حکومتوں کو ہڑپ کر جانے کی حکمت عملی کا پیش خیمہ ہے کیونکہ یورپ کے سیاستدان دیگر عقلائے روزگار کی طرح اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنا جنس یا ملک اور زبان کے اتحاد پر نہیں بلکہ دین و مذہب کے رابطہ جامعہ نے اور صرف اسی رابطہ نے ان کے شیرازہ جمعیت و اتحاد کو مضبوط اور مستحکم بنائے رکھا ہے لہذا اسی شیرازہ کو بکھیر دینا ان پر فتح پانے کے مترادف ہو گیا۔ چنانچہ بعض بیوقوف اور کم فہم مسلمانوں نے ان کے اس خبیث الاثر پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں یہ خیال جما لیا ہے کہ دینی تعصب ایک قابل نفرت جذبہ ہے اور اس طرح اس مقدس اور قابل احترام جذبہ کو خیرباد کہہ دینے کے بعد اس کی بجائے انھوں نے وہ جذبہ بھی تو اپنے دل میں نہیں پیدا کیا

جس کو "قومیت" اور "حب الوطن" وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی مدح میں وہ اپنے یورپین معلمین کی تقلید میں اس کی تعریف کے گیت گایا کرتے ہیں الغرض از یں سو رانده واز اں سو درمانده۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ان لوگوں کی مثال بعینہ ایک ایسے شخص کی ہے جو اپنے گھر کو تو مسمار کردے لیکن ابھی کوئی دوسرا مکان اس نے اپنے لئے تعمیر نہ کیا ہو اور اس طرح اس کو مجبوراً بیابان میں اقامت گزیں ہو کر باد و باراں اور حر و برد کی تکالیف اور شدائد برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

اسی پروپیگنڈا کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب انگریزوں نے دیکھا کہ اہل ہند کے دلوں میں ابھی تک حکومت کا خیال تازہ ہے کیونکہ سلطنت سے بیدخل ہوئے ان پر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کی دینی اور مذہبی تعلیم میں اس بات کی تحریک موجود ہے کہ وہ اپنی اس گمشدہ متاع کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اقوام عالم کی نفسیات کا مطالعہ کرنے سے ان پر یہ بات بھی منکشف ہوئی کہ مسلمانوں کی حیات ملیہ کی بنا ان کے رابطۂ دینیہ پر ہے اور جب تک وہ اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیم پر پختگی کے ساتھ قائم ہیں اس بات کا اندیشہ ضرور موجود رہیگا کہ وہ کسی نہ کسی وقت کھڑے ہو کر اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اس لئے انھوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو جو بظاہر مسلمان تھے لیکن ان کے باطن نفاق اور زندقہ سے بھرے ہوئے تھے اور جو ہندوستان میں نیچری کہلاتے ہیں ان کو اپنی مطلب براری کا آلہ کار بنایا تاکہ وہ مسلمانوں کے عقائد فاسد کریں اور دینی تعصب سے ان کو نفرت دلا کر ان کی غیور طبائع کے جوش حمیت اور حرارت دینی کو ٹھنڈا کریں اور ان میں کشمکش اور انتشار پیدا کرنے کا باعث ہوں۔ ان اغراض کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے علیگڑھ میں ایک کالج کی بنیاد ڈالی۔ اور ایک موقت التوریج رسالہ کے ذریعہ اپنے خیالات باطلہ کی ہندوستان بھر میں اشاعت کی۔ حکومت برطانیہ کے ارباب حل و عقد نے اس بارے میں ان کی مالی امداد کی۔ اور بعض دیگر نمائشی مراعاتوں سے اس جماعت کے بعض افراد کو سرفراز کیا جس پر یہ سادہ لوح فریفتہ ہو گئے اور جس سے کہ اول الذکر کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے عقائد کمزور اور مضطرب ہو جائیں اور تعصب دینی کا جذبہ ان کے دلوں سے اٹھ جائے تاکہ ان کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہوں اور وہ مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔

یہ بھی یورپین سیاست کا ایک رنگ ہے جس کو ملک ہند کے ارباب سیاست نے تجربہ کے بعد بہت مفید پایا ہے۔ چنانچہ یورپ کی اکثر حکومتوں نے بلاد عثمانیہ اور مصر وغیرہ ممالک اسلامیہ میں اس کا جال پھیلایا ہوا ہے اور جس میں کہ طبقۂ امرا و اغنیا نام نہاد علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اکثر افراد پھنس جایا کرتے ہیں۔ جن کو یہ ارباب سیاست اپنا بہترین آلۂ کار خیال کرتے ہیں۔ ہمیں ان مسلم نما دہریہ اور ملحدوں کے فعل پر کچھ بھی تعجب نہیں آتا۔ جو اُن کا آلۂ کار بننا پسند کرتے ہیں ہمارا تعجب ان سادہ لوح مسلمانوں کے متعلق ہے جو عقائد اسلام پر قائم اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں باایں ہمہ وہ تعصب دینی کو نگاہ نفرت سے دیکھتے اور مسلمانوں کو اس سے نفرت دلاتے ہیں۔ اور اس کو تہذیب و تمدن کے راستہ میں حائل تصور کرتے ہیں۔

افسوس! وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم اپنے ہاتھ سے اپنے گھروں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں اور اس تعلیم و تلقین کے ذریعہ وہ اعدائے دین و ملت کا ان کے زہریلے پروپیگنڈے میں ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں جو دینی تعصب کو دلوں سے محو کرنا چاہتے ہیں اور جو محو ملت کے مترادف ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اغیار و اجانب کو اپنی حکومتیں حوالہ کردیں اور ان کی ابدی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں۔ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ یورپین قومیں ایک طرف تو نہایت بلند آہنگی کے ساتھ تعصب دینی کے خلاف زہر اگلتی ہیں۔ دوسری طرف ان کی سیاسی حکمت عملی کا قانون اساسی یہ ہے کہ دینی مبلغین یعنی مسیحی مشنریوں کی ہر ایک طرح سے حمایت و مساعدت کی جائے۔ اور ان کے مشن کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔ اور اگر کبھی مشرقی ممالک میں سے کسی گوشۂ ملک میں ان کے کسی ہم مذہب پر اتفاقیہ کوئی دست درازی کرلی جائے یا اس کے ساتھ کسی قسم کی بے انصافی ہو الغرض کوئی اس قسم کا معمولی سا واقعہ ہو جائے جس کا وقوع اجتماعات بشریہ میں کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی تو وہ چیخ پکار سے آسمان کو سر پر اٹھا لیتے ہیں اور ممالک متمدنہ مغرب میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور سب متفق الکلمہ ہو کر چلا اٹھتے ہیں کہ ظلم ہو گیا قیامت آگئی۔ اور یوں ہوا اور یہاں ہوا۔ اور پھر اس کا انتقام لینے کے لئے ہر ایک قسم کی تیاری کی جاتی ہے۔ اور فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ رابطہ دینیہ کی بنا پر ہوتا ہے اور پھر بھی خدا جانے کس منہ سے تعصب دینی کی مذمت کی جاتی ہے۔ اور اس سے نفرت دلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ اگر تم یورپ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ باوجودیکہ بلحاظ قومیت ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کے آپس میں ہمیشہ بغض و

عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے - ایک دوسرے کی سیاست کو شکست دینا ان کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے اور ہر ایک حکومت موقع تلاش کرتی رہتی ہے کہ اپنے حریف سلطنت کو زک پہنچائے یا گرداب بلا میں مبتلا کرے بایں ہمہ وہ اپنے کسی ہم مذہب کی حمایت کے لئے جس پر کسی دوسرے مذہب والے نے کسی قسم کی تعدی اور ظلم کیا ہو اپنے تمام قوائے حربیہ اور سیاسیہ کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے چاہے وہ مشرق کے کسی بعید ترین گوشے میں رہتا ہو اور چاہے وہ ہم مذہب بلحاظ قومیت ان سے مختلف ہو -

برخلاف اس کے اگر تمام دنیا میں جو مذہب میں ان سے مغائرت رکھتی ہے ایک طوفان برپا ہو اور کشتوں کے پشتے لگ جائیں تب بھی ان کی رگ انسانیت حرکت میں نہیں آتی اور نہ اُن میں ان کی ہمدردی کا احساس پیدا ہوتا ہے بلکہ غیر جانبداری کا بہانہ کر کے وہ ایک طرف ہو جاتے ہیں - اور دُور سے مخالفین مذہب کی خونریزی کا تماشہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں - بحالیکہ انسان کا انسان پر شفقت کرنا اور اس کی ہمدردی پر مائل ہونا اس کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے - اور اس لئے انسانیت کا اولین فرض ہے - گویا اہل یورپ کے نزدیک دوسرے لوگ چوپائے - جانور بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں اور انسانیت کا دائرہ صرف ان کے ہم مذہبوں تک محدود ہے اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ تعصب دینی سے اس حد تک متاثر ہونا یورپ کے سچے مسیحیوں سے مخصوص نہیں بلکہ ان کے طبائع پرست اور دہریہ ان سے بھی بڑھ کر جوش تعصب دکھاتے ہیں اور اپنی اس عصبیت کو طاقتور بنانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے -

کاش! وہ اس تعصب میں اعتدال کے دائرہ سے باہر قدم نہ رکھتے لیکن غضب تو یہ ہے کہ بسا اوقات وہ حدود اعتدال سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں -

بیشک اہل یورپ کا ہر ایک مناسب و موزوں اور نامناسب و ناموزوں موقع پر دینی تعصب کو ملحوظ رکھنا نہایت عجیب ہے - تم دیکھو گے کہ ان میں سے ایک شخص جو حریت فکر میں اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہے اور آزاد خیال جماعتوں میں رئیس الاحرار مانا جاتا ہے تم اس کے کلام میں ایک ایسا فقرہ بھی نہیں پاؤ گے جس طرح پطرس راہب کی روح تمہیں صاف نہ دکھائی دے بلکہ غور کرنے سے تمہیں معلوم ہوگا کہ اس میں بعینہ راہب مذکور کی روح بول رہی ہے - اگر تمہیں اس کی صداقت میں شک ہے تو مسٹر گلیڈسٹون اور اس کے ہم مشربوں کی سیاسی تقریروں کا مطالعہ کرو -

مسلمانو! اپنی زندگی قائم رکھو اور حیات ملی کو ضائع کرنے کا سامان نہ کرو اپنے ہاتھ سے اپنا خون گرانے سے باز آجاؤ اور اپنی سعادت کو موت سے کم قیمت پر نہ بیچو - تمہارے شیرازۂ قومیت کے استحکام کا موجب صرف یہی رابطۂ دینیہ ہے - اس کو ہاتھ سے مت جانے دو اور اغیار کی ابلہ فریب نصیحتوں اور ملمع تقریروں پر دھوکا نہ کھاؤ - ذرا سمجھ سے کام لو اور رابطۂ دینیت کی اہمیت کو محسوس کرو - جو تمام روابط میں مستحکم ترین رشتۂ مواصلت ہے اور جس کے ذریعہ ترکوں کو عربوں کے ساتھ اور ایرانیوں کو ہندوستانیوں کے ساتھ اور مغربیوں کو اہل مصر کے ساتھ متحد بنایا جا سکتا ہے - اور مختلف اقوام عالم کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے رابطۂ نسب عام سے بڑھ کر یہ رابطۂ (رابطۂ دینیہ) اتحاد اور اتصال کا موجب ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرق کے بعید ترین گوشے میں رہنے والا مسلمان ایک دوسرے مسلمان کے لئے جو مغرب اقصیٰ میں رہتا ہے اس پر کسی قسم کی تکلیف نازل ہونے کے وقت درد محسوس کرے گا - اور ہر ایک ممکن طریقے سے اس کی نصرت اور اعانت کے لئے جہد بلیغ کرنا اپنا فرض سمجھے گا -

بیشک یہ رشتہ ملک، زبان اور نسب کے رشتوں سے بہت بڑھ کر ہے اس لئے اس رشتۂ مواصلت کو طاقتور بنانے کی کوشش کرو اور کسی طرح بھی اس کو کمزور نہ ہونے دو اس میں تمہاری زندگی اور اسی میں تمہاری عزت اور سعادت ہے -

ہاں، ہاں، یہ تعصب دینی کا مقدس جذبہ اپنے میں پیدا کرو لیکن شرط یہ ہے کہ اعتدال کو ہر حالت میں ملحوظ رکھو اور سررشتۂ عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ دو - دنیا کا نظام عدل و اعتدال پر قائم ہے اور کوئی قوم جو عدل و اعتدال کے اصول پر کاربند نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتی - اللہ تعالیٰ سے ڈرو - دلوں کو اس کے خوف سے بھر دو اور حفظ ذمام کے بارے میں اس کے احکام کی تابعداری کرو - ہر ایک کو اس کے حقوق دینے میں ذرا بھی تامل نہ کرو - ہر ایک مذہب و ملت اور ہر ایک طبقہ کے لوگوں سے اچھا برتاؤ کرو - اور دوسرے ارباب مذاہب کے ساتھ جو تمہارے ہم وطن ہیں پڑوسیوں کا سا حسن سلوک ملحوظ رکھو اور یقین کرو کہ تمہارے مصالح و اغراض ان کے ساتھ اور ان کے تمہارے ساتھ وابستہ ہیں - تعصب دینی کو کبھی جور و ظلم اور تعدی و دست درازی کا بہانہ مت بناؤ اور نہ ہی اس کو

دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی حق تلفی کی دلیل ٹھہراؤ۔ خود تمہارا دین اور مذہب تمہیں دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنے اور ان پر تعدی کرنے سے منع کرتا ہے اور پڑوسیوں اور اہل ذمہ کے ساتھ مراعات کرنے کی تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اگر تم اپنے دین اور مذہب کے احکام کی مخالفت کروگے تو اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالےٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ ساتھ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تعصب دینی کے صرف یہ معنی نہیں کہ تم ایک دوسرے کی طرف اہل ہمدردی اور زبانی اظہار ہمدردی پر اکتفا کرو۔ نہیں بلکہ تمہارا فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کی نصرت اور اعانت کے لئے اپنے تمام تر قوائے عاملہ کو استعمال میں لاؤ۔ دوسری اقوام کے مقابلہ میں اپنی قوم کی عزت و سیادت اور غلبہ و تفوق قائم کرنے کے لئے اپنی جان اور اپنا مال خرچ کرنے سے مطلق دریغ نہ کرو۔ اور علوم و فنون کے اکتساب اور دیگر فضائل و کمالات انسانیہ کی تحصیل میں اپنی قوم کو صف اولیں میں جگہ دلانے کے لئے اپنی تمام طاقتیں صرف کر ڈالو۔ تمہارا یہ مقدس جذبہ (تعصب دینی کا جذبہ) تمہارے اتحاد و ارتباط باہمی کا موجب ہو اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ہر ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی بہبود کو اپنی بہبود سمجھے اور اگر اس کو قعر ذلت میں گرا ہوا دیکھے۔ تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بام رفعت پر پہنچا دینے کی کوشش کرے۔ یہ آیہ کریمہ کہ "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب (پ ۶)" ترجمہ (نیکی اور تقویٰ کے امور میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کا ہاتھ مت بٹاؤ۔ اور اللہ تعالےٰ سے ڈرو۔ بیشک اللہ تعالےٰ کا عذاب بڑا سخت ہے) اس موضوع پر کتنا بلیغ اور جامع کلام ہے۔

فصاحت جنگ جلیلؔ

ٹکڑے

کیا آہ تھی جس نے قاتل کی تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے
سب ناوک و خنجر پھینک دیئے شمشیر کے ٹکڑے کر ڈالے

نامہ جو لکھا تھا ظالم کو انجام یہ اس کا دیکھ لیا
خط پھاڑ کے میری قسمت کی تحریر کے ٹکڑے کر ڈالے

کیا جامہ دری کے خوگر ہیں دیوانے تمہاری زلفوں کے
جب جیب و گریباں ختم ہوئے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

تدبیر پرستی خلق کا مشرب ہو نہ کہیں اس مطلب سے
تقدیر نے اکثر دنیا میں تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے

صحرا میں رہا جب تک مجنوں دن قطعِ مسافت میں کاٹے
زنداں میں جو آیا دیوانہ زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

اب دیکھتے ہیں تعمیر کی رفعت تا بہ فلک پھر دیکھیں گے
اک حکمِ خدا نے برق صفت تعمیر کے ٹکڑے کر ڈالے

نالوں کی نہ پوچھو بے اثری آہوں نے کیا یہ طرفہ ستم
جب بس نہ چلا کچھ ظالم پر تاثیر کے ٹکڑے کر ڈالے

وہ ٹکڑے اڑانے آئے تھے، سینے کے، جگر کے، دل کے، مگر
جب آنکھ سے میری آنکھ ملی شمشیر کے ٹکڑے ڈالے

زنداں بلا سے مجنوں کی دشوار جلیلؔ آزادی تھی
وہ یاد تھی لیلیٰ کی جس نے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی حقوق تلفی کی دلیل ٹھہراؤ۔ خود تمہارا دین اور مذہب تمہیں دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنے اور ان پر تعدی کرنے سے منع کرتا ہے اور پڑوسیوں اور اہل ذمہ کے ساتھ مراعات کرنے کی تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اگر تم اپنے دین اور مذہب کے احکام کی مخالفت کروگے تو اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالےٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ ساتھ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تعصب دینی کے صرف یہ معنی نہیں کہ تم ایک دوسرے کی طرف مائل رہو اور زبانی اظہار ہمدردی پر اکتفا کرو۔ نہیں بلکہ تمہارا فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کی نصرت اور اعانت کے لئے اپنے تمام تر قوائے عاملہ کو استعمال میں لاؤ۔ دوسری اقوام کے مقابلہ میں اپنی قوم کی عزت وسیادت اور غلبہ وتفوق قائم کرنے کے لئے اپنی جان اور اپنا مال خرچ کرنے سے مطلق دریغ نہ کرو۔ اور علوم وفنون کے اکتساب اور دیگر فضائل وکمالات انسانیہ کی تحصیل میں اپنی قوم کو صف اولیں میں جگہ دلانے کے لئے اپنی تمام طاقتیں صرف کرڈالو۔ تمہارا یہ مقدس جذبہ (تعصب دینی کا جذبہ) تمہارے اتحاد وارتباط باہمی کا موجب ہو اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ہر ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی بہبود کو اپنی بہبود سمجھے اور اگر اس کو قعر ذلت میں گرا ہوا دیکھے۔ تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بام رفعت پر پہنچا دینے کی کوشش کرے۔ یہ آیہ کریمہ کہ "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب" (پ۶) ترجمہ (نیکی اور تقویٰ کے امور میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کا ہاتھ مت بٹاؤ۔ اور اللہ تعالےٰ سے ڈرو۔ بیشک اللہ تعالےٰ کا عذاب بڑا سخت ہے) اس موضوع پر کتنا بلیغ اور جامع کلام ہے۔

فصاحت جنگ جلیل

ٹکڑے

کیا آہ تھی جس نے قاتل کی تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے
سب ناوک و خنجر پھینک دیئے شمشیر کے ٹکڑے کر ڈالے

نامہ جو لکھا تھا ظالم کو انجام یہ اس کا دیکھ لیا
خط پھاڑ کے میری قسمت کی تحریر کے ٹکڑے کر ڈالے

کیا جامہ دری کے خوگر ہیں دیوانے تمہاری زلفوں کے
جب جیب و گریباں ختم ہوئے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

تدبیر پرستی خلق کا مشرب ہو نہ کہیں اس مطلب سے
تقدیر نے اکثر دنیا میں تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے

صحرا میں رہا جب تک مجنوں دن قطعِ مسافت میں کاٹے
زنداں میں جو آیا دیوانہ زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

اب دیکھتے ہیں تعمیر کی رفعت تا بہ فلک پھر دیکھیں گے
اک حکمِ خدا نے برق صفت تعمیر کے ٹکڑے کر ڈالے

نالوں کی نہ پوچھو بے اثری آہوں نے کیا یہ طرفہ ستم
جب بس نہ چلا کچھ ظالم پر تاثیر کے ٹکڑے کر ڈالے

وہ ٹکڑے اڑانے آئے تھے سینے کے، جگر کے، دل کے مگر
جب آنکھ سے میری آنکھ ملی شمشیر کے ٹکڑے ڈالے

زنداں بلا سے مجنوں کی دشوار جلیل آزادی تھی
وہ یاد تھی لیلیٰ کی جس نے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

غیر مطبوعہ کلام

شاہ ظفر خلد آشیاں تاجدار دہلی

خواب

سرحد نیپال ۔ ۱۰ رمئی ۱۹۴۴ء

بھائی صاحب۔ سلام محبت۔ افسانہ نمبر کا شکریہ جس ترتیب و تہذیب سے آپ نے یہ نمبر ملک کے سامنے پیش کیا ہے اس کی داد دینا مشکل ہے۔ سالانہ نمبر کے لئے شاہ ظفر خلد مقام کی ایک غیر مطبوعہ غزل بھیج رہا ہوں قبول فرمایئے۔ میں نے اسی غزل سے میری کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس ناگپور کے مشاعرے کا آغاز کیا تھا اصل تحریر جو خود شاہ ظفر کے دستِ خاص کی ہے بابائے اردو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے پاس محفوظ ہے۔

مخلص خیر بہوروی نمائندہ خصوصی انجمن ترقی اردو ہند

رات کو تیرے تصوّر میں جو آجائے ہے خواب — خواب میں خوب تماشا مجھے دکھلائے ہے خواب

وہ دل آرام بغل میں نہیں ہوتا جس رات — آن کر چشم کی آغوش میں گھبرائے ہے خواب

خواب اور مرگ ہے یکساں کہ تماشائے جہاں — بند ہو جاتے ہی بس آنکھ کے ہو جائے ہے خواب

یاد قامت میں تری میں ہوں جہاں سے غافل — سچ ہے یہ بات کہ سولی پہ بھی آجائے ہے خواب

صبحِ محشر بھی ہوئی اور نہ کھلی آنکھ مری — دیکھئے پاؤں کہاں تک ابھی پھیلائے ہے خواب

خواب میں گر کبھی آتا ہے وہ رشکِ یوسف — ہمسرِ خوابِ زلیخا مرا بن جائے ہے خواب

سو رہا منزلِ دنیا میں ہی غافل کس نیند — آفتیں سر پہ مسافر کے بہت لائے ہے خواب

بختِ خوابیدہ نہیں جاگتی میری ورنہ — اک جہاں کا مری فریاد سے اڑ جائے ہے خواب

پائے خوابیدہ جو اٹھتا ہے ظفر مشکل سے
نہیں معلوم کہ تلوے کہیں سہلائے ہے خواب

علامہ شفیق مینائی مرحوم

آخری کلام

جوع الارضی کا افسانہ

ساغر کی طرح گردش میں ہے بالائے زمیں ہر میخانہ
خالی ہے شراب تمدن سے گردوں کا الٹا پیمانہ
آباد نگر ہے اجاڑ نگر، ویرانہ بنا ہے کاشانہ
فرزانہ جو ہے وہ سمجھے گا کیا کہہ گیا یہ اک دیوانہ
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

تہذیب جدید کے افسانے لکھ ڈالے فسانہ نگاروں نے
پڑھنے کو حسن و عشق کی بھی قصے گڑھے لاکھوں یاروں نے
رنگیں کیا صفحۂ ہستی کو خونریزی سے خونخواروں نے
دہرا دیا مصرع چبھتا ہوا پی پی کے لہو تلواروں نے
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

ہے قبضۂ قدرت میں اس کے ہر ملک کی ہر کشور کی زمیں
داؤد کو جس نے تخت دیا تھا جس کے سلیماں زیرنگیں
جو فرش زمیں کو ہیں سمجھے ہوئے شاہنشاہی کا عرش بریں
بندے ہیں یہ ایسے خدائی کا قصہ ہی تمام نہ کر دیں کہیں
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

سنتے ہیں سکندر دنیا سے خالی ہی گیا کچھ لے نہ گیا
تیمور کے پائے لنگ کا بھی منزل سے نہ آخر زور چلا
نادر کے قتل عام کا بھی اک وار چلا اور چل کے رکا
سائنس کی بمباری کا بھی ہو جائیگا فیصلہ دیر ہے کیا
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

مغرب سے جو آگ بھڑک اٹھی مشرق پہ بھی انگارے چھائے
پھیلے وہ شرارے فضاؤں میں ٹھنڈے جو تھے وہ بھی گرمائے
رہ رہ کے ہوائی جہازوں کے بادل جو سروں پر منڈلائے
مُردے بھی قبروں میں چونک اٹھے زندے بھی یہ ڈر کر چلائے
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

بستے تھے سمندر پار ادھر ساحل سے جو موجیں ٹکرائیں
طوفاں آگ کا پانی میں اٹھنے لگا سطحیں لہرائیں
ہر سمت پروں کو پھیلائے سائنس کی چیلیں منڈلائیں
دیکھا نہ تھا جس نے پکار اٹھا دیوار و در تک دیکھ کے چلائیں
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

لڑتے ہیں یہ طاقت والے، دولت والے، حشمت والے
نازاں ہیں قوت بازو پر کس بل والے ہمت والے
ضد پہ ہیں اڑے کثرت والے زد میں ہیں یہ قلت والے
بنگال کے فاقہ مست مرے چونکے نہیں عیش کے متوالے
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

سعدی[1] کا مقولہ یاد نہیں باہر ہے حد سے بشر کی ہوس
ہفت اقلیم بھی ہاتھ آئے تو رہے اقلیم دگر کی ہوس
ہر ملک کو حرص حکومت کی دولت کی طمع ہے زر کی ہوس
بندوں کو ساری خدائی کے بھی ڈوبے نہ بحر و بر کی ہوس
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

مخلوق کی بربادی کا سبب کج خلقی ہے یا بداخلاقی
غارتگر عالم بن گئے ہیں تہذیب تمدن کے ساقی
بیمار شفیق تھا دکھا نہ سکا کچھ طبع رواں کی مشاقی
چھوٹی ہے رات کہانی بڑی۔ زندہ محفل صحبت باقی
دنیا کا ورق نہ الٹ دے کہیں جوع الارضی کا افسانہ

[1] ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ
ہمچناں در بند اقلیم دگر

سیماب اکبر آبادی

جادۂ تخیل

الٰہی جادۂ تخئیل میں یہ کیا مقام آیا؟
کہ ہر ہر گام پر روح القدس بہرِ سلام آیا

چمن میں پھر نہ کوئی ضامنِ امن و سلام آیا
وہی تھا انقلابِ وقت جب میں زیرِ دام آیا

خدا کا ہاتھ بن کر انقلابِ تیز گام آیا
مبارک ہو چمن والوں کو وقتِ انتقام آیا

ترے کیا کام طوف و سجدۂ بیت الحرام آیا
گیا بن کر غلام اور واپس آیا تو غلام آیا

طریقِ بیخودی میں ایک ایسا بھی مقام آیا
کہ جب اُن کو پکارا لب پہ اکثر اپنا نام آیا

کمالِ محویت ہے محو ہو کر حسن بن جانا
وہ کیا آیا جو اُن کی انجمن سے ناتمام آیا

مرے اس کیفِ محرومی پہ لاکھوں میکدے صدقے
کہ میں ساقی کی محفل میں گیا اور تشنہ کام آیا

سحر ہوتے ہی جن پھولوں سے لوٹی تازگی تو نے
کبھی اُن کی اُداسی دیکھنے بھی وقتِ شام آیا؟

بنائے بر بنائے تجربہ میں نے نئے رستے
مرا ناکام ہونا جادۂ اُلفت میں کام آیا

محبت تھی ازل کی صبح کا اک نورِ خوابیدہ
مگر لینے لگی انگڑائی جب انساں کا نام آیا

نہ آئی کام اگر دنیا مرے پروا نہیں مجھ کو
یہ کیا کم کامیابی ہے کہ میں دنیا کے کام آیا

مجھے منزل پر اب کیا ڈھونڈتے ہیں قافلے والے
وہی تو میری منزل تھی میں جس منزل میں کام آیا

بسا اوقات محویت میں یوں محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے اب وہ آئے اب کوئی اُن کا پیام آیا

تمہارا سنگِ در یوں ہو گیا تقسیم سجدوں میں
بچا تعمیرِ کعبہ سے تو بت خانے میں کام آیا

وہ اے سیماب کتنے پڑھ رہے تھے مرثیے اوروں کے
لب اُن کے تھرتھرا کر رہ گئے جب میرا نام آیا

راجندر سنگھ بیدی

ایکٹ فیچر

راتوں کی رات قلوبطرہ

قلوبطرہ مصر کے بطلیموس خاندان کی آخری تاجدار تھی۔ وہ مسیح سے ۶۹ سال پہلے پیدا ہوئی۔ تاریخ اسے "نیل کی جادوگرنی" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ کتابوں میں ایسے بڑے بڑے راہبوں اور بادشاہوں کا ذکر آتا ہے جو اس کے حسن کے سامنے دم بھی نہ مار سکے قلوبطرہ کے چاہنے والوں میں جولیس سیزر فاتح روم، ہرمقس اور جرنیل مارک انطونی بہت مشہور ہیں۔

پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح ہمیں قلوبطرہ بھی تاج و تخت حاصل کرنے کے لئے سازشیں کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے اپنے حسن کے بل بوتے پر سیزر کی ہمدردی اور اپنے بھائی چودھویں بطلیموس کو شکست دے کر تخت پر بیٹھ گئی۔ سنا تھ سیزر مرتے دم تک اس حسن کی دیوی کا پجاری رہا۔ ہرمقس بیس سال قلوبطرہ کو مار ڈالنے کی تیاری کرتا رہا۔ تاکہ اس کا وطن سیزر اور اہل روما کے ہاتھوں سے آزاد ہو جائے۔ چنانچہ ہرمقس نجومی بن کر قلوبطرہ کے یہاں ملازم ہو گیا تھا اور قلوبطرہ کی خوبصورت کنیز شارمیاں کے ساتھ مل کر قلوبطرہ کو قتل کرنے کی تیاریاں کرنے لگا...... لیکن .....

(ٹہلنے کی آواز پھر ہرمقس اپنے آپ سے کہتا ہے)

ہرمقس ۔ یہ کیسے ممکن ہے! قلوبطرہ! میں ہرمقس جس نے اپنی زندگی کے پورے چھبیس سال تیری محبت میں گزارے ہیں محض فرعون بننے کے لئے اپنے ہاتھ خون میں رنگوں۔ اس پاپ میں حصہ لوں۔ (کاغذ کی آواز) قلوبطرہ، سیزرین۔ پالیمن برنیس، بطولائس کو دیہ! ان سب کو قتل کروں۔ اور یہ نام شارمیاں نے تجویز کئے ہیں جو خود قلوبطرہ کی طرح خوبصورت عورت ہے (وقفہ) سب سے پہلے قلوبطرہ کا نام ہے۔ آہ، (ہنستے ہیں) نہیں نہیں، میں کس قدر کمزور ہوں۔ میں اپنی زندگی کے مقصد سے بہت دور چلا گیا ہوں۔ میں مصر کی رنگین مزاج اور عیاش ملکہ کی محبت کا دم بھرنے لگا ہوں۔ اس قلوبطرہ کی محبت کا دم جس نے اسکندریہ کے کھلے بازاروں میں ربۃ الیسیس کا تاج پہن کر چلنے کی گستاخی کی ہے۔ (جیسے دانت پیس کر) اگر زندہ رہ گئی ملکہ قلوبطرہ! ——

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

ہرمقس ۔ رات کے ایک بجے! کون ہے؟

(باہر سے ایک دھیمی آواز آتی ہے)

ہرمقس ۔ شارمیاں؟ (اپنے آپ سے) اور کون ہو سکتا ہے شارمیاں کے سوا۔ مجھے شارمیاں کی نگاہوں اور اپنی کمزوری سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شارمیاں مصر کی آزادی کا عظیم مقصد چھوڑ کر مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور میں اپنے آسمان کا ٹوٹا ہوا تارہ! قلوبطرہ کی محبت کا قیدی... لیکن ..... (شارمیاں داخل ہوتی ہے)

شارمیاں ۔ آقا تم ابھی تک نہیں سوئے۔ اسکندریہ کے تمام چرند پرند، تمام ناچنے والی لڑکیاں اور ان کے شرابی عاشق نیند کا شکار ہو چکے ہیں۔ لیکن میرے آقا ابھی تک ..... اوہو! میر ہرمقس! میں نے آج تمہارے بستر کی سلوٹیں بھی تو نہیں نکالیں اور نہ تمہارا لباس قندیل کے پاس رکھوایا ہے میں اس کوتاہی کے لئے بہت پشیمان ہوں۔

ہرمقس ۔ میں تمہاری مہربانیوں کے لئے بہت ہی ممنون ہوں شارمیاں بلکہ انہی مہربانیوں کی طرف تمہاری توجہ دلانا چاہتا ہوں یہ عنایات میرے لئے کچھ زیادہ ہیں۔

شارمیاں ۔ (مچل کر) میں سب کچھ جانتی ہوں ہرمقس۔ لیکن یہ نہیں جانتی کہ محبت کے بدلے کچھ مانگا بھی جاتا ہے۔ کیونکہ محبت اپنا بدل آپ ہے۔

ہرمقس ۔ شاباش شارمیاں! تمہیں اپنے وطن سے ایسی ہی بے لاگ بے غرض محبت ہونی چاہئے۔ وہ محبت جو اپنا بدل آپ ہے

اور جس کے عوض کچھ بھی نہیں مانگا جاتا - کچھ بھی نا ......

شارمیان - (ایک ہلکی سی چیخ) اوہ!

ہرمقس - کیا ہوا شارمیاں!

شارمیاں - (آہستہ آہستہ) کیا ہوگا ہرمقس! یہی کبھی کبھی میرے سینے میں ایک درد اٹھا کرتا ہے - ایک بہت ہی شدید درد، میرا دل عام گوشت پوست کا بنا ہوا ہے - کاش وطن سے محبت کرنے والوں کی طرح وہ بھی عنوبل برج کا سیاہ پتھر ہوتا ——— جب مصر اہل روما کے ہاتھوں آزاد ہو جائے گا - ہرمقس تو یہ درد بھی خود بخود مٹ جائے گا - ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگا -

ہرمقس - میرے قریب آؤ شارمیاں! ——— ہاں یوں بتاؤ تم نے قلوبطرہ کو قتل کرنے کی کیا ترکیب سوچی ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ میں اسے ان ہاتھوں سے قتل کروں - کیا کوئی اور یہ کام نہیں کر سکے گا -

شارمیاں - ہونہہ! میرے آقا جس مصر کی آزادی ہر بات پر مقدم ہے - تم اس نیک کام کو اپنے ہاتھوں سے کیوں سرانجام نہیں دیتے -

ہرمقس - (ایک چیخ) اوہ،

شارمیاں - کیا ہوا ہرمقس؟

ہرمقس - کیا ہوگا شارمیاں! میرے دل! انوبل برج کے سیاہ پتھر میں سے بھی ایک ٹیس اٹھا کرتی ہے - یہ بھی شاید مصر کی آزادی کے بعد خود بخود مٹ جائے گی -

شارمیاں - (طنزاً ہنستے ہوئے) مصر کی آزادی (دہراتے ہوئے) مصر کی آ..... زا..... دی . ہرمقس ہم دونوں کو مان لینا چاہئے کہ ہم دونوں اس سے بہت بہت دُور چلے گئے ہیں - کل دعوت میں جب قلوبطرہ نے اپنا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا اور ہم لوگوں نے مل کر تمہیں شاہ عشق کا خطاب دیا تو میں حسد کے مارے جل گئی - اور تم بھی جو ایک سانولی مگر خوبصورت عورت سے محبت کرنے کی وجہ سے سیزر کا مذاق اُڑایا کرتے تھے - اب قلوبطرہ کو مارنے کا کام خود کرنے سے ہچکچاتے ہو - کیا رب زریع کے عبادتخانے کے سوار کا بیٹا ہرمقس جو مصر کو آزاد کرانے کے لئے پیدا ہوا ہے قلوبطرہ کی سی عشرت پسند عورت کا غلام ہو کر رہ جائے گا -

ہرمقس - (ہنستا ہے) تاج؟ قلوبطرہ کا تاج: یہ رہا قلوبطرہ کا تاج!

...... (تاج کے پھینکنے کی آواز) میں اس کی اتنی بھی پروا نہیں کرتا شارمیان! جتنی تمہارے بدن کے کسی چیتھڑے کی - تم خود ہی بتاؤ کیا تم قلوبطرہ سے کم خوبصورت ہو! لیکن مصر کی آزادی ......

شارمیان - میں تمہارے تعریفی کلموں کو خوب سمجھتی ہوں — ہرمقس کاش تم اپنے الفاظ کو میری خوبصورتی کی سچی یا جھوٹی تعریف تک محدود رہنے دیتے - .... اور مصر کی آزادی کے الفاظ ......

(سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز)

ہرمقس - یہ کون آرہا ہے شارمیاں؟

شارمیاں - ٹھہرو میں دیکھنے جاتی ہوں - (جاتی ہے اور اُلٹے پاؤں گھبرائی ہوئی دوڑی آتی ہے)

شارمیاں - (گھبرائے ہوئے) ہرمقس، ہرمقس، قلوبطرہ، اگر اس نے اس وقت مجھے یہاں دیکھ لیا تو اسے ہماری سازش کا پتہ چل جائے گا - بتاؤ، جلدی بتاؤ، ہرمقس میں کہاں چھپ جاؤں؟

ہرمقس - (حواس باختہ) چھپ جاؤ، چھپ جاؤ - اس پردے کے پیچھے - یہ تمہارا رومال شارمیاں - یہ تاج کرسی پر رکھتی جاؤ - اس سنہری کرسی پر -

قلوبطرہ - (تھکی اور ہانپتی ہوئی) میرے نجومی!

ہرمقس - ملکہ ذی وقار کو ناچیز ہرمقس کا سلام -

قلوبطرہ - اوہ ..... اوہ کس قدر تھک گئی ہوں میں ہرمقس! نجومی کے آسمان کا راستہ کتنا ٹیڑھا ہوتا ہے اور اسے طے کرنا کتنا مشکل، لیکن میرے نجومی آج میرا یہی جی چاہتا تھا کہ تجھے تیری خلوت گاہ میں ملوں - اسی لئے میں نے ان لمبی سیڑھیوں کا سفر اکیلے ہی طے کیا ہے -

ہرمقس - مصر کی والا تبار ملکہ نے یہاں قدم رنجہ فرما کر ناچیز کی بہت ہی عزت افزائی کی ہے -

قلوبطرہ - میں تمہاری بہت ممنون ہوں ... لیکن یہ کیا یہاں مجھے کسی چیز کی خوشبو آتی ہے - جیسے بہار کے خاتمے پر آخری پھولوں کی آیا کرتی ہے .... اور تم، تم کھوئے کھوئے سے کیوں دکھائی دیتے ہو - یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تمہارے دل میں کوئی ہم ارادہ ہے جو پورا نہیں ہو پاتا -

ہرمقس ۔ (ذرا پیچھے ہٹتا ہے اور ٹھوکر لگنے سے میز پر گر جاتا ہے) اوہ!

قلوبطرہ ۔ کیوں ہرمقس! کتنا خوبصورت اور سڈول ہے تمھارا چہرہ ۔ لیکن آسمان پر رینگتے ہوئے ستارے اپنی ٹیڑھی چالوں کے نقش تمھارے چہرے پر بھی ڈال جائیں گے ۔ جانتے ہو تمھارے چہرے پر لکیریں پڑنے سے سب سے زیادہ دکھ کسے ہوگا ۔ ہرمقس مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ میں جو تجھے جی جان سے چاہتی ہوں، کاش میں ایک سال، ایک مہینہ، ایک گھنٹہ کے لئے سیاسی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک محبت کرنے والی سادہ دل عورت بن جاؤں ۔ آہ ملکہ قلوپطرہ نے کس بے دردی سے عورت قلوبطرہ کا گلا گھونٹ کر اسے ہمیشہ کے لئے مار ڈالا ہے ۔

ہرمقس ۔ مصری ملکہ! میں کتنا خوش ہوں لیکن ۔ ۔ ۔ ستاروں کے پوچھنے والے کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قلوبطرہ ۔ اے مغرور مصری! مجھے اس بات پر مجبور نہ کر کہ میں اپنے جادو کو تجھ پر آزماؤں ۔ بھلا کون سی عورت اس بات کو سہارے گی کہ تو اسے حقیر سمجھ کر اس کی طرف مائل نہ ہو ۔ اور تمھیں ایک عورت کی محبت کی کیا قدر ہو سکتی ہے ۔ وہ محبت جو دل میں چھپی ہوئی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگا دیتی ہے ۔ بڑے بڑے فاتح میرے ہاتھ کے دیئے ہوئے تحفوں کو سینے اور آنکھوں سے لگا کر رکھتے ہیں ۔ چاند ستارے میرے دیکھنے کے لئے سرگرداں ہیں ۔ لیکن تم ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے یقین ہے کہ کل میں نے جو تاج تمھیں دیا تھا وہ بھی تم نے ادھر کسی کونے میں رکھا ہوگا ـــــ لو! یہ میری بات سچ نکلی ۔ وہ پڑا ہے میرا تاج کرسی پر ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ رومال ۔ ۔ ۔ ۔

ہرمقس ۔ (گھبرا کر) رومال ۔ ۔ ۔ ۔ رو ۔ ۔ ۔ ۔ مال ۔

قلوبطرہ ۔ ہاں رومال، اس کے کنارے کتنے نفیس کاڑھے ہوئے ہیں (ہنستی ہے) اس میں بہار کے پھولوں کی خوشبو آتی ہے ۔ یہ کسی بھولی ایسی خوبصورت عورت کا رومال ہے (ہنستی ہے) (طنزاً) ہرمقس یہ لطیف چیز ایسے کرخت ماحول میں کس طرح آ گئی ـــ ہوں ــــ جان گئی میں ــــ کتنے بھولے بھالے دکھائی دیتے ہو تم ــــ ایک لومڑی سے بھی زیادہ مسکین ــــ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی حسینہ ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے ۔ اور جلدی میں اپنا رومال ۔ ۔ ۔ ۔

ہرمقس ۔ اے بلند اقبال ملکہ کہاں ایک معمولی نجومی اور کہاں یہ رازونیاز ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہیں جانتا یہ رومال یہاں کیسے آ گیا ـــ شاید ان باندیوں میں سے کسی کا ہوگا جو ہر روز مجھے کھانا پہنچانے آتی ہیں ۔

قلوبطرہ ۔ اوں ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھتی ہوں، وہ ایسی ہی چیزوں سے دل بہلاتی ہیں ۔ جو اپنے وزن سے دُگنا ہونے کی قیمت رکھتے ہو اس قسم کے رومال کو تو میں قلوبطرہ کی شایانِ شان سمجھتی ہوں لیکن ہرمقس! اڈر ومت، میں نہیں چاہتی کہ تمھاری محبوبہ کا رومال میرے پاس رہے ـــ لو، لے لو یہ رومال، اور اپنے سینے سے لگا لو ۔

ہرمقس ۔ مجھے اور کسی سے محبت نہیں ہے ملکہ والاقدر ۔ میرا دل عنوبِس کا سیاہ پتھر ہے لیکن اس میں بھی کبھی کبھی ایک ٹیس اٹھا کرتی ہے ۔ اگر میری ملکہ کو اس بات کا یقین آ جائے تو ہرمقس اسے باہر پھینک سکتا ہے (جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دور سے آواز آتی ہے) یہ لیجئے اب وہ پانی کی موجوں میں تیر رہا ہے رومال ۔ ۔ ۔ ۔ (واپس آتا ہے)

قلوبطرہ ۔ (شاہانہ انداز میں ہنستی ہوئی) ذرا قیاس کرو ہرمقس! وہ عورت جس کی الفت کی نشانی کے ساتھ تم نے ایسا سلوک کیا ہے اگر پردے کے پیچھے کھڑی ہو اور تمھاری یہ حرکت دیکھ لے تو کیا کہے ۔ یقیناً میری غیر حاضری میں تم میرے تاج کے ساتھ بھی وہی سلوک کر سکتی ہو ۔ لو ۔ ۔ ۔ ۔ اس تاج کو بھی سمندر کی موجوں میں پھینک دو ۔

ہرمقس ۔ اے نیلی آنکھوں والی ساحرہ! کاش تم میرا طلسم بنا رہنے دیتیں ۔ کاش میں اپنے آپ کو زیادہ دیر دھوکا دے سکتا ۔ کہ مجھے قلوبطرہ سے بالکل محبت نہیں ہے ۔ اے عالم تاب حسینہ کیا تم مجھ سے شکست کا اعتراف چاہتی ہو ۔ تو لو ۔ ۔ ۔ ۔ ہرمقس آج سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو تمھارے قدموں پر نثار کرتا ہے ۔ (قدموں پر گرتا ہے) کیا تم اسے ٹھکراؤ گی تو نہیں، بولو ۔ ۔ ۔ ۔ قلوبطرہ جس کے بال شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح ہیں ۔ جس کے لب ایک جلتے ہوئے زخم کے کناروں کی طرح ہیں ــــ بولو ــــ بولو ــــ

قلوبطرہ ۔ ہرمقس! میرے ہرمقس! (گالوں کو تھپکتی ہے) میں تمھیں صرف یہ کہنے کو آئی تھی ۔ کہ دن رات تاروں کی گنجلک

میں نہ پھنسے رہا کرو۔ تمہاری گلاب کی پتی جیسے چہرے پر میں فکر کی ملامت دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ کل رات میں اسی وقت تمہیں اپنے خلوت خانے میں مدعو کرتی ہوں۔ اب مجھے چلنا چاہیئے۔ (دور سے نقارے بجنے کی آواز آتی ہے) سنو۔

ہرمقس۔ سبح کاذب کے نقارے بھی بجنے لگے ہیں۔ (جاتی ہے)

(وقفہ۔ شارمیاں کی سسکیوں کی آواز)

ہرمقس۔ شارمیاں ۔۔۔ شارمیاں ۔۔۔

شارمیاں۔ ہرمقس! تم تو قلوبطرہ کے تاج کی اتنی بھی پروا نہیں کرتے جتنی شارمیاں کے بدن کے کسی چیتھڑے کی ۔۔۔ لیکن بدنصیب شارمیاں کے رومال کے کنارے تو سنہرے تاگو سے کاڑھے ہوئے ہیں۔ ہرمقس میرا رومال تو ایک ذلیل چیتھڑا نہیں ہے (رونے لگتی ہے) میں مصر کی آزادی نہیں چاہتی۔ میں مصر کی آزادی نہیں چاہتی۔

ہرمقس۔ شارمیاں! شارمیاں! کیا بدنصیب ہرمقس مصر کی آزادی چاہتا ہے؟

۔۔۔۔ (وقفہ) ۔۔۔۔

ہرمقس کے دل میں قلوبطرہ کی محبت اور جذبہ انتقام ایک دوسرے سے الجھتے رہے، ٹکراتے رہے۔ اس کے ارادوں اور خیالوں کے گھروندے بنتے اور ڈھے جاتے۔ آخر انتقام نے محبت پر فتح پائی اور ہرمقس قلوبطرہ کو قتل کرنے چل دیا۔ لیکن حسن پھر فتح یاب ہوا۔ محبت پھر اثر انداز ہوئی اور قلوبطرہ کو دیکھ کر ہرمقس ناکام واپس پلٹ آیا۔

کچھ عرصہ گزر گیا ۔۔۔ اور روما کے بادشاہ اکٹوییس اور قلوبطرہ کی سلطنتوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں ہرمقس نے حکیم المپس کے بھیس میں قلوبطرہ کو جنگ سے بھاگنا پڑا۔ قلوبطرہ اور ہرمقس کی محبت یہاں ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد قلوبطرہ کی محبت خیز زندگی میں ہمیں مارک انطونی نظر آتا ہے۔ مارک انطونی شاہ اکٹوییس کے خلاف قلوبطرہ کا مددگار تھا۔ ان دونوں کی ملاقات پہلے پہل سکندریہ میں ہوئی۔ اور انطونی قلوبطرہ کو دل و جان سے چاہنے لگا۔ محبت کی رنگین پینگیں بڑھتی رہیں۔ حسن و عشق ابھی نزدیک تر آ رہے تھے کہ انطونی سے جال ستاں فریب کیا گیا۔ اسے کہا گیا کہ قلوبطرہ زہر پی چکی ہے۔ انطونی نے یہ سن کر خود بھی زہر کا ایک پیالہ پیا اور ..... ہوا کی سی تیز رفتار سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے انطونی کو قلوبطرہ کے محل ..... آ پہنچے۔

آواز۔ ملکہ قلوبطرہ ۔۔۔ ملکہ قلوبطرہ!

قلوبطرہ۔ (دروازے کے قریب جاکر) نیچے کون ہے ایراس؟

ایروس۔ ہاں ملکہ میں ہوں ایروس۔ میں بڑی مشکل سے آقا انطونی کو یہاں لایا ہوں۔ آقا نے زہر کھا لیا ہے۔ اس کا جسم بہت بھاری ہو رہا ہے۔ اور وہ اپنے آخری دموں پر ہیں۔

قلوبطرہ۔ (روتی ہوئی) انطونی۔ میرے پیارے انطونی ..... شارمیاں، شارمیاں، المپس، کوذیدس، رسی لانا۔ میں نیچے نہیں جا سکتی۔ تمام دروازے بند ہیں۔ مجھے اپنے انطونی کو اوپر کھینچ لینے دو۔ مجھے اسے اپنے ہاتھوں سے چھو لینے دو اس سے پہلے کہ اس کے جسم کی گرمی ختم ہو جائے۔

(رسی آتی ہے اور انطونی کو اوپر کھینچا جاتا ہے۔ انطونی اوپر آتے ہوئے راستہ میں بڑے خوفناک انداز سے کراہتا ہے)

قلوبطرہ۔ آہ انطونی۔ تو نہیں دیکھتا میرے بال ویسے ہی لمبے ہیں میری آنکھیں ابھی تک نیلے پانی والی جھیلیں ہیں۔ فقط ان میں طوفان امنڈ آیا ہے۔ میرے جان سے پیارے انطونی! میں تجھے اپنے ہاتھوں سے شراب کا آخری جام دے کر پھر اپنی زندگی ختم کر ڈالوں ......

(پیتا ہے)

قلوبطرہ۔ انطونی! میرے محبوب، میرے آقا! ظالم اور سفاک انطونی، تجھے یہ کیسے جرأت ہوئی کہ تو مجھے دنیا میں ذلیل ہونے کے لئے چھوڑ جائے۔ کیا تو چاہتا ہے کہ میں اکٹوییس کے رتھ کے پیچھے روما کی گلیوں میں چلوں تاکہ اوکٹویا مجھ پر تھوک دے۔ قلوبطرہ آہستہ خرام نہیں ہے۔ دیکھ وہ تیرے ہمرکاب ہے۔

انطونی۔ قلوبطرہ! شراب کے آخری جام نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں تمہیں اپنی قسم دے کر کہوں کہ تو مرنے کا ارادہ ترک کر دے۔

(چیخنے کی آواز)

المپس۔ شارمیاں یہ کس کی چیخ ہے۔ کس قدر خوفناک ہے یہ!

شارمیاں۔ یہ تو میا کے ایک باشندے کی چیخ ہے۔ اسے ملکہ نے تجربے کے طور پر سانپ سے کٹوایا ہے۔ تاکہ وہ سکرات کے عالم کا دور دیکھ سکے۔

المپس۔ یہ چیخ نہیں، یہ شعری کی لعنت ہے جو قلوبطرہ پر نازل

ہونے والی ہے۔ کیونکہ اس نے زیم کے پوشیدہ خزانے عیاشی میں لُٹا دیئے۔ جہنم کا راستہ اب ان لوگوں کے لئے کھل گیا ہے اور مصر کے سب دیوتے......

قلوبطرہ ۔ خاموش ابلیس.... میں تمہارے دیوتاؤں سے خائف نہیں۔ اگر جہنم میں بھی انسان رہتے ہیں تو میں وہاں بھی ملکہ ہی بن کر راج کروں گی۔ کم از کم اتنی بات ضرور ہے کہ اگر میں ایک دفعہ ملکہ بن چکی ہوں تو ابدالاباد تک ملکہ ہی رہوں گی۔

انطونی ۔ (چیخ کر) آہ!

قلوبطرہ ۔ انطونی..... میرے انطونی!

انطونی ۔ کہو میری محبوبہ! تم نے مجھے اپنی قسم دی کہ تم میرے بعد زندہ رہو گی۔ اور ہاں قلوبطرہ! ——— جب پہلی بار تو مجھے سکندریہ کے ساحل پر ملی تھی اور تیری کنیز نے تیرے حسن کی تعریف میں گیت گائے تھے۔ کیا کہا تھا تیری آنکھیں اس طرح ہیں جیسے پورے چاند کا پانی میں عکس، تیرے پاؤں اس طرح ہیں جیسے دو گلابی کنول ——— آہ!

قلوبطرہ ——— وہ رات!

قلوبطرہ ۔ آہ انطونی وہ راتوں کی ملکہ رات!

انطونی ۔ راتوں کی رات قلوبطرہ..... اور قلوبطرہ مجھے وہ اپنا محبوب گانا سناؤ۔ کوئی انھیں دل بے قرار مل جائے۔

قلوبطرہ ۔ (چیخ کر) آہ.... لو لے جاؤ اب اس سانپ کو۔ میں نے اس کے زہر کو اب اپنے سینے میں پیوست کر لیا ہے۔

انطونی ۔ قلوبطرہ..... قلوبطرہ... تم نے کیا کیا۔ تم نے کیا کیا.....

ایروس ۔ ملکہ....

شارمیاں ۔ ملکہ......

قلوبطرہ ۔ اب میں تمہارا محبوب گانا گاؤں گی انطونی!

(ایک دردناک آواز میں گانا گایا جاتا ہے)

کوئی انھیں دلِ بے قرار مل جائے۔
مری خزاں کے گلے میں بہار مل جائے
کسی کا سحرِ نظر چارہ ساز ہو جائے
کسی کی آنکھ مسافر نواز ہو جائے

(اس کے بعد اور چیخوں کی آواز آتی ہے۔ انطونی اور قلوبطرہ ایک دوسرے کا نام لیتے ہوئے موت کی آخری ہچکیاں لیتے ہیں)

سروش ملیح آبادی

شاعر کا سجدہ؟

عبودیت سے جو اک روز قلب گھبرا یا
تو نقشِ بندگی دل سے مٹا دیا میں نے

گلا کے آہنی زنجیرِ آدمیت کی
نشیمنِ بشریت جلا دیا میں نے

شفق کی مے کو ستاروں کے جام میں بھر کر
صنمکدے میں قمر کے بہا دیا میں نے

سنہرے ابر سے ٹپکا کے زندگی کی شراب
چراغِ زیست کی لَو کو بڑھا دیا میں نے

بلند اتنا ہوا میرا شہپرِ پرواز
چراغِ شمس و قمر کو بجھا دیا میں نے

لرزتے رہتے ہیں جس جا پہ شہپرِ جبریل
وہاں سے بھی قدم آگے بڑھا دیا میں نے

جبیں پہ اپنی ستاروں کا تاج کج کر کے،
اُلوہیت کا چمن جگمگا دیا میں نے

ستارا اک چمک اٹھا ضمیرِ قدرت میں
حریمِ قدس کا پردہ اٹھا دیا میں نے

ازل کے روز جو چھوٹا تھا قلبِ آدم سے
وہ دل کے ساز پہ نغمہ سنا دیا میں نے

نہ دیکھی میں نے وہاں جب شعاعِ برقِ جمال
تو پھر نگاہ کا پردہ جلا دیا میں نے

روپہلے نور نے حلقے میں لے لیا مجھ کو!
سروشؔ سجدے میں سر کو جھکا دیا میں نے

میرزا ادیب

دھک دھم

دھک، دھک۔ دھک دھک! دھم دھم دھم دھم ——— یکلخت چونک کر، یک لخت گھبرا کر اس نے اپنا برف کی طرح سرد، یخ آلود ہاتھ چھاتی کے اوپر رکھ دیا۔ تیزی کے ساتھ دھک دھک کرتا ہوا دل سینے سے نکلا جا رہا تھا۔ اور کلیجہ نہ معلوم کن تاریک گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ دھم دھم دھم دھم! بڑا بڑا مکانوں کے ایک ساتھ گرنے کا دھماکا اس کی روح میں گونج اٹھا ——— اندر ہی اندر ایک چیخ اٹھی اور اس کے خشک حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ دھک دھک ٹن ٹن ——— رات کے سناٹے میں کلاک کی آواز ہتھوڑے کی طرح اس کے دھڑکتے ہوئے دل سے ٹکرانے لگی۔ یہی لحظہ ٹکراتی رہی اور پھر سناٹا ——— ایک خوفناک، ایک دہشت انگیز سناٹا!

لیمپ کی ہلکی نیلی چبھتی ہوئی روشنی میں کمرے کی دیواروں، چھت کی چھوٹی بڑی کڑیوں اور چارپائی کے عین سامنے میز کے اوپر رکھے ہوئے چینی کے برتنوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھیں تھک گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ میں، اس کی پیشانی پر، اس کے سر کے ہر حصے میں بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے ہیں۔ اور کمرے کی ہر ایک چیز تیز نشتر بن کر ان پھوڑوں میں گھستی چلی جا رہی ہے۔ درد سے بے قرار ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈیلوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ وہ بیٹھی رہی، کانپتی ہوئی، لرزتی ہوئی، دہشت سے سمٹی سمٹائی جیسے غرق ہوتی ہوئی کشتی میں ہچکولے کھا رہی ہو۔ جیسے اس پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا ہو ——— دھک دھک ——— دل کی دھڑکن پھر کانوں میں گونجنے لگی۔ جسم کا ہر عضو ایک زہرناک جذبے کی چنگاریوں میں سلگنے لگا۔ دل کی گہرائیوں سے زہریلا دھواں اٹھ اٹھ کر ذہن کی سطح پر پھیلنے لگا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ کلاک کی آواز برابر سے ہو ہو کر گرتی ہوئی دیواروں کی طرح اس کے اعصاب سے ٹکرانے لگی۔ چینی کے برتن آپس میں ٹکرانے لگے۔ کمرے کی دیواریں ٹکرانے لگیں۔ دھک دھک دھک۔ دھم دھم دھم دھم ——— !

"خالد کے ابا! ——— خالد کے ابا ——— خالد!"

"سکینہ! ——— سکینہ!!" اس کا شوہر چارپائی سے چھلانگ مار کر اس کے پاس آ گیا۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟ پھر ڈر گئیں۔ تمہارے ہاتھ کتنے سرد ہیں؟ کانپ کیوں رہی ہو ——— ؟"

"اوہ ——— میں ——— خالد کہاں ہے ——— میرا خالد ——— !"

"یہ ہے تمہارا خالد ——— بیچارہ ڈر گیا ہے۔"

"نہ معلوم مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میرے کلیجے پر ہاتھ رکھو ——— ڈوبتا جا رہا ہے۔ خالد! ڈرو نہیں بیٹا! میری گود میں آ جاؤ۔ دیکھو بچے کا جسم کتنا سرد ہے ——— خون ہے ہی نہیں ——— خالد کے ابا مجھے معاف کر دو ——— بڑی شرمندگی سے معافی مانگتی ہوں ——— تم کو بہت تنگ کر رہی ہوں۔" آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اس کے ہلدی کی مانند زرد رخساروں پر بہنے لگے۔

"سکینہ! انسان بھیانک خواب دیکھتا ہے تو اسے بھلا دیتا ہے۔ تم یہی سمجھو تم نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا ——— وہ سب واقعات بھیانک خواب کے سوا اور ہیں ہی کیا؟ بھلا دو نہیں ——— سب کچھ بھول جاؤ ——— !"

"ہاں ——— بھلا دوں گی ——— مگر ———" اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ——— نہیں بھلا سکتی ——— نہیں بھلا سکتی ——— سب کچھ سامنے آ جاتا ہے ——— خون ——— دھماکا ——— آگ ——— !"

"تمہارے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔ اسی لئے ہر وقت ڈرتی رہتی ہو۔ وہ سیب کا مربہ کہاں ہے۔ دو تین قاشیں کھا لو ———"

تھوڑی دیر کے بعد وہ چارپائی پر جا کر پھر لیٹ گئی۔ اور آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر نیند تو رہی ایک طرف چند لمحوں کی غنودگی بھی اس کے دل و دماغ سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ رات کے خوفناک سناٹے میں کلاک کی ٹک ٹک اس کے کانوں کے پردوں پر پیہم ضربیں لگا رہی تھی۔ اور پھر دل کی دھڑکن، دھک

دھک دھک دھک۔ سانس رکتا ہوا محسوس کرکے اس نے انتہائی بے چینی اور کرب کے عالم میں آنکھیں کھول دیں اور دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر کو دیکھنے لگی ——— ایک وسیع عمارت، فضا کی شفق آلود پہنائیوں میں گم ہوتے ہوئے مینار، عمارت کے نیچے بے پناہ انسانوں کا ہجوم، چلتی ہوئی گاڑیاں، موٹریں ——— اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ——— ڈوبتا چلا گیا ——— اچانک بچے کا ننھا سا ہاتھ اس کی گردن سے چھوا۔ ڈوبتا ہوا دل تھم گیا۔ بچے کے دونوں ہاتھ اس نے اپنی گردن کے گرد حمائل کر دیئے۔ اور ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ بچے نے آنکھیں کھول دیں ——— "سو رہو خالد ———! ابھی رات ہے میرے بچے۔ سو جاؤ ———!" خالد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ برآمدے کی تمام چیزیں ایک ایک کرکے اس کی نظروں کے سامنے ناچنے لگیں۔ چینی کے منقش برتن، الماری کے اوپر کھڑکی پر لٹکتا ہوا سرخ پردہ، تپائی پر رکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب۔ ان تمام چیزوں سے اس کی نگاہ گزرتی ہوئی تصویر پر جم گئی۔ تصویر کے عین نیچے پلنگ پر اس کا شوہر سو رہا تھا۔ منہ کھلا ہوا ——— چہرے کا رنگ زرد ——— جسم بے حس و حرکت ———

سرخ پردہ ہوا کے جھونکے سے اس کے شوہر کے اوپر لہرایا۔ خوف و دہشت سے اس کا دل لرزنے لگا۔ دھک دھک دھک دھک۔ آگ گرتی ہوئی دیواریں ——— چیخ پکار ——— دھم دھم دھم دھم

وہ چیخ اٹھی۔ "خالد کے ابا، خالد کے ابا، بھاگو۔ بھاگو۔ خالد ——!"

"سکینہ! سکینہ! پاگل ہو گئی ہو۔ کدھر جا رہی ہو؟"

"اوہ ——— میں ——— میں پاگل ہو گئی ہوں ——— میں پاگل ہو گئی ہوں۔"

"سکینہ ———!" شوہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "سکینہ! اب عقل سے کام لو۔ بیچارے بچے کی نیند حرام کر دی ہے تم نے۔ کس قدر سہم گیا ہے۔ رو بھی نہیں سکتا۔ پہلے ہی اس کی حالت کافی خطرناک ہے۔ کھیلتے کھیلتے خود بخود ڈر جاتا ہے اب تم ———"

"لیکن میں خود حیران ہوں۔ یہ کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ کسی ایسی جگہ لے چلو مجھے جہاں کوئی مکان نہ ہو ——— کوئی دیوار نہ ہو ——— کوئی آواز نہ ہو ———"

"کوٹھے پر سوؤ گی ———؟"

سکینہ مایوسی سے سر ہلانے لگی۔ "نہیں، میں کدھر چلی جاؤں، کہاں چلی جاؤں ——— اماں جان کو بلا لاؤ۔"

"رات کے ڈھائی تین بج گئے ہیں۔ اتنی دور سے آسکیں گی وہ؟"

"تو ———" وہ سسکیاں لیکر رونے لگی۔ "خدا کے لئے اس سرخ پردے کو ہٹا دو۔ اس کلاک کو بند کر دو، اور یہ منحوس تصویر بھی، سب کچھ ہٹا دو یہاں سے۔"

"سکینہ!" اس کا شوہر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "صبح تمہیں کسی نئے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔"

"نہیں دوا سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے بیہوش کرکے میرے اندر جو کچھ ہے اسے نکال دو۔ یہ زندگی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے کوئی ایسی دوا کھلا دو کہ میں کبھی ہوش میں نہ آسکوں۔ ہر وقت بیہوش پڑی رہوں۔ یہی میرا علاج ہے۔ دیکھو میرا دل کس طرح دھڑک رہا ہے اور کلیجہ ———! ہر وقت دھماکا ہوتا رہتا ہے اس کے اندر ——— دھم دھم دھم۔ دھم ——— اور ———"

اس نے بیوی کا ٹھنڈا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "سکینہ ———! یاد ہے شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تم نے کیا کہا تھا اک دن۔ رات میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے اور میں نے کہا تھا اسے بھلا دو۔ اسی دن تم نے اسے بالکل فراموش کر دیا۔ پھر کبھی اس کی طرف اشارہ تک نہ کیا۔ ان واقعات کو بھی ایک بھیانک خواب سمجھ کر ہمیشہ کے لئے بھلا دو۔"

"مگر یہ جو کچھ دیکھا ہے اسے بھیانک خواب نہیں سمجھ سکتی۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ ان آنکھوں سے ——— ان کانوں سے ——— وہ ———"

"پھر بھی زندگی میں بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ انسان کو ہزاروں صدمے سہنے پڑتے ہیں۔ مجھے دیکھو! کس طرح سب کچھ بھول چکا ہوں۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔ تمہاری صحت پہلے سے بہت گر چکی ہے۔ نہ چہرے پر وہ شادابی ہے۔ نہ باتوں میں وہ گرمجوشی۔ کل رات سوتے میں بڑبڑا رہے تھے۔ ہائے وہ دن کتنا منحوس تھا جب میں نے گھر سے باہر قدم نکالا تھا، وہاں جانے کے لئے۔ اس دن مر کیوں نہ گئی ———؟"

اس کا شوہر اس کی قمیص کے دامن سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"بسا بسایا گھر لٹ گیا ———"

"اب چھوڑو بھی یہ ذکر ———" اس کے شوہر نے کسی قدر تلخ لہجہ میں کہا۔

"اور خدا جانے میرے چاند کو کیا ہو گیا ہے۔ رشید نے کل شام زور سے ننھے پیٹی پر مارا، سہم گیا میرا بچہ۔"

"خدا کے لئے اب لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے پاس کرسی پر بیٹھا رہتا ہوں۔ تمہارے قریب کھڑا رہتا ہوں۔"

"نہیں تم اپنی چارپائی پر جاؤ۔ یہ لیمپ بجھا دو۔ روشنی میں

چھت اور دیواروں کو دیکھ کر ڈر جاتی ہوں "

اس کا شوہر ایک آدھ گھنٹے کے بعد اسے پوری طرح مطمئن کر کے اپنی چارپائی پر چلا گیا۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ اس نے پلنگ کے شیشے کو ہاتھ بڑھا کر چھوا۔ دیوار کو چھوا، تکئے کو چھوا اور آنکھیں بند کر کے دل بہلانے کے لئے اپنی ازدواجی زندگی کے گزشتہ دور یاد کرنے لگی سب سے پہلے اس نے ظفر کو اپنی پھوپھی کے یہاں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ شاید ارکیٹروں کا شائق مگر طبیعت کا تیز میلا —— چند دن کے بعد ان کی منگنی ہو گئی۔ وہ دن کتنے مسرت پاش، کتنے کیف آفریں تھے۔ ایک دوسرے کی یاد میں کھوئے رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی فقط جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب، پھر شادی ہو گئی۔ نئی مسرتوں کی روشنی نے ان کی زندگی کو منور کر دیا —— پھر چار سال کے بعد ایک صبح کو ——

اس کا ذہن واقعات کی لہروں میں بہنے لگا۔

سمندر کی سہمگیں موجیں —— نئی دنیا نئی زندگی نئے حالات، اور —— اور پھر —— دھک دھک دھک —— اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اوخدا —— او خدا! تو بڑا قادر ہے، تو بڑا کریم ہے —— مری بار کیوں دیر اتنی کری!"

مگر اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر اس کی انگلیاں دیوار سے مس کرنے لگیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہلکی سی آواز میں پکارا —" خالد کے ابا! خالد کے ابا۔" مگر کوئی جواب نہ ملا۔

ہر طرف ایک جنون انگیز، خوفناک، وحشت اثر سکوت، ہر جانب ایک گہری، مہیب، ہولناک تاریکی، صرف اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ دھک دھک دھک دھک۔ ٹن ٹن ٹن ٹن۔ دھم دھم دھم دھم۔

یکایک اس کے کلیجے کو زور سے دھچکا لگا۔ ایک اور دھچکا —— مسلسل دھچکے ——

"خالد کے ابا۔ خالد کے ابا!"

"سکینہ!"

"خالد کے ابا —— خال —— اوہ۔" کوئی چیز دھم سے زمین پر گری چیخیں بلند سے بلند ہونے لگیں۔ ظفر نے بجلی جلائی۔ سکینہ دروازے کے پاس پڑی تھی۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"سکینہ! یہ تو نے کیا کیا —— ؟"

"میں کہاں ہوں —— میرا خالد —— بھاگو —— بمباری —— شعلے آگ —— مکان کی دیواریں —— چھت —— !"

"سکینہ! یہاں بمباری کہاں؟ ہم برما سے ہزاروں میل دور آ گئے ہیں۔ تم اپنے وطن میں ہو "

"تو پھر یہ کیا ہو جاتا ہے —— ؟ یہ کیا ہو گیا تھا؟ —— میرا خالد خیریت سے ہے؟"

"ہاں —— !" اس کے شوہر نے اُسے بازوؤں پر اُٹھاتے ہوئے کہا "آگ بجھانے والا انجن نیچے سے گزر رہا تھا —— سکینہ تمھیں کیا ہو گیا ہے —— زندگی کس طرح گزرے گی؟"

"کس طرح گزرے گی؟ —— کس طرح؟" دونوں ایک دوسرے کو رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

رُباعیات

افسر احمد نگری

محبت منزلِ اسرار بھی ہے
محبت جادۂ دشوار بھی ہے
کوئی تعجب سے اگر پوچھے تو کہہ دو
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

مسلماں صاحبِ شمشیرِ ادراک
مسلماں محرمِ اسرارِ لولاک
بایں اوصاف یہ مردِ حق آگاہ
نصیبِ عشق و مستی تودۂ خاک

(خان بہادر) رضا علی وحشت کلکتوی

جذبۂ وحشت

جُدا کریں گے نہ ہم دل سے حسرتِ دل کو
عزیز کیوں نہ رکھیں زندگی کے حاصل کو

اُمید رکھتی ہے سرگرمِ جستجو دل کو
خدا دراز کرے عمرِ سعیٔ باطل کو

پسند آئی ہے منجدھار کشتیٔ دل کو
مرا سلام ہے اب دُور ہی سے ساحل کو

لڑی نہ تھی سرِ منزل ہنوز آنکھ سے آنکھ
وہ نیچی نظریں اُڑا لے گئیں مرے دل کو

جبھی ہے لطف کہ اک جوشِ جذبۂ توفیق
کشاں کشاں مجھے لیجائے کوئے قاتل کو

خبر ہوئی نہ اُنھیں میرے مضطرب دل کی
غلط خیال ہے یہ "دل سے راہ ہے دل کو"

نشانِ زندگیٔ دل ہے بیقراریٔ دل
ہے دل کی موت اگر چین آگیا دل کو

کٹھن ہے کام تو ہمت سے کام لے اے دل
بگاڑ کام نہ مشکل سمجھ کے مشکل کو

کسی کا تیرِ مژہ لیکے آیا مژدۂ عیش
جگر کو نیش مبارک ہو اور خلش دل کو

وہ کام میرا نہیں جس کا نیک ہو انجام
وہ راہ میری نہیں جو گئی ہو منزل کو

کیا نگاہ نے تیری علاجِ بے تابی
کہ دی اک آن میں تعلیمِ بیخودی دل کو

وہ طول کھینچا بلا کا ترے تغافل نے
کہ صبر آ ہی گیا میرے مضطرب دل کو

فریب کھاتا ہے ہر ہر قدم پہ منزل کا
وہ کیا کرے کہ نہ دیکھا ہو جس نے منزل کو

ستم نصیبِ تغافل ہوں ایسے بخت کہاں
کہ سنگِ جور ترا پوچھے شیشۂ دل کو

نہاں اگرچہ ہے محفل سے سوزِ دل میرا
مگر یہ راز ہے معلوم شمعِ محفل کو

تری نگہ کبھی ہشیار کو کرے غافل
کبھی کرے وہی ہشیار اپنے غافل کو

میں اور ڈروں تلاطم سے قعرِ دریا کے
کنارے چھوڑ کے آیا ہوں آپ ساحل کو

چمک چمک کے ڈراتی ہے کیا مجھے اے برق
کہ پہلے ہی سے تو میں رو چکا ہوں حاصل کو

بلا کی ہوتی ہے وحشت کی بھی غزل خوانی
کہ اک سرور سا ہوتا ہے اہلِ محفل کو

مولوی بشیر احمد برہانپوری

نذیر احمد دہلوی کی کردار نگاری

دنیا میں بعض مصنفین ان گنت تصنیفات کے مالک رہ چکے ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں بجز لفاظی کے نفس مضمون مفید دکار آمد ہوتا ہے نہ محاکات و کردار نگاری کی کوئی خوبی پائی جاتی ہے۔ فطرت نگاری اور لفظی جزئیات کے لئے انسان در اصل کی طرف سے خاص قسم کا دل و دماغ عطا کیا جاتا ہے۔ جسے عطیۂ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھنا چاہیئے۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے ؎

شیئان عجیبان هما ابرد من یخ
شیخ یتصبّی و صبی یتشیخ

(ترجمہ:- دو چیزیں ایسی ہیں جو عجیب و غریب ہونے کے علاوہ نہایت ان میں بے جوڑ ہیں۔ ایک تو سن رسیدہ اشخاص کا بچوں کی سی حرکات کرنا ہے اور دوسرے کم سن اطفال کا بوڑھے لوگوں کی طرح مشیخت بگھارنا)

بلحاظ اخلاق نظر غائر سے دیکھا جائے تو واقعی اس قسم کی حرکات و سکنات ہر نوخیز یا کہنہ سال شخص کو فاتر العقل ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مگر یہی عیب ایک فسانہ نویس، ڈرامہ نگار اور عکاس فطرت شاعر کی شہرت و عظمت میں چار چاند لگانے کے لئے کافی ہے۔ اور خصوصاً اس وقت انتہائی استعجاب کا باعث ہوتا ہے جبکہ شاعر افسانہ نگار متقی پرہیزگار، شب زندہ دار ہو اور پھر مذہبی غلو نہایت کٹر اور پاک نمازی کہلایا جائے۔

حضرت امیر مینائی اور ریاض خیرآبادی اس لئے قابل ستائش مانے جاتے ہیں کہ ہر دو حضرات نے اپنا دامن کبھی بادہ نوشی سے ملوث نہیں کیا اور باوجود انتہائی زہد و اتقا کے رنگینی کی تعریف و توصیف میں اسقدر جولانی طبع دکھلائی ہے کہ ہر کس و ناکس کو ان پر شبہ ہوتا ہے۔ انھیں کے شیدائی ہونے کا شک ہوتا ہے۔ بعینہ یہی حال شمس العلماء

مولوی نذیر احمد دہلوی کا سنئے جنہیں ایام طفولیت سے لیکر ریعان جوانی تک کبھی آرام و سکون میسر نہیں ہوا۔ اور وہ خورد سالی سے عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایسے ظالم مولوی کے پنجۂ استبداد میں جکڑے رہے جس کی بیوی نے تا بلوغ ہم نذیر احمد کے ہاتھوں مصالحہ پسوانے میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ مولانا کے موصوف کے تمام سوانح عمری میں کہیں ایسا واقعہ نظر نہیں آتا کہ انہوں نے کبھی آزادانہ روش میں گام زنی کی ہو۔ یا میلوں ٹھیلوں میں یا رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت کی ہو۔ یا نقالوں اور بھانڈوں کا تماشا دیکھا ہو۔ چونکہ ان کا بیشتر وقت تعلیم و تعلم میں گذرا۔ اس لئے استانیوں اور معلموں کا جو خاکہ ان کے فطرت نگار نے کھینچا ہے وہ اصلیت پر مبنی ہے۔ مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان کا خامۂ معجز نگار ہر قسم کے کردار کو اصلی رنگ میں ظاہر کرنے پر بدرجۂ اتم قادر ہے۔ کردار نگاری کے علاوہ مولانا کی عبارت میں ظرافت محاکات اور برجستہ الفاظ کا موزوں استعمال پایا جاتا ہے۔ معمولی بات کو بھی وہ اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ وہ بات سننے والے کے لئے فردوس گوش ہو جاتی ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال بغیر صنعات کے نہیں کرتے اور صنعات بھی اسقدر موزوں و چسپاں ہوتی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر گھنٹوں سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی سچا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ جیسے:-

(۱) اصغری نے دیانت کو بلایا اور پانچ روپے نکال اس کے ہاتھ دیئے اور کہا گھنٹے والے کی دکان سے بہت عمدہ قلاقند ڈیڑھ سیر کے ٹکڑے سے پیچھے کی مٹھائی۔ شاہ تارا کی گلی سے موتی پاک چاندنی چوک سے ترنجات، نیل کے کٹرے سے کمو تلی دال اور خانم کے بازار سے کشمش ابھی جا کر لاؤ۔

(مراۃ العروس)

) محلے میں جو آدمی بازاری طور کے رہتے ہیں تم نے انہیں کی
بیوں کو بہن بنا رکھا ہے۔ رات دن بھوندو بھٹیارے کی بیٹی
یا، بجھو قلعی گر کی بیٹی زلیخن، ممو سقے کی بیٹی رحمت، بتولن کنجڑے
نبیج سلمی تمہارے پاس گھسی رہتی ہیں۔ آخر محلے میں قاضی
یف حسین، حکیم شفاء الدولہ، منشی ممتاز احمد، مولوی روح اللہ
سن رضا یہ لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ ان کی بہو بیٹیاں ہمارے
ر آتی جاتی ہیں، تم کسی سے بات نہیں کرتیں۔

اہ کلیم :- سنتا ہوں کہ ان دنوں بڑے میاں (والد) نماز
ت پڑھا کرتے ہیں۔

ھلا بھائی :- تو کیا اسی کو آپ نے خلل دماغ قرار دیا ہے؟

م :- تو کیا خلل دماغ کے سر میں سینگ لگے ہوتے ہیں؟
ہیں کہ آپ سمجھتے تھے کوئی بڑا بھاری جلسہ کرتے کہ شہر میں نام
. اٹھتے بھی تو اونگھتے ہوئے۔ دو چار مرتبہ میں نے ان کو
ہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ یہ نوری جولاہہ تو امام بنتا
ا اور محلے کے سقے۔ حجام۔ کنجڑے۔ مسجد کے مسافر وغیرہ
س کے مقتدی ہوتے ہیں۔ اور انہیں میں یہ حضرت بھی
ایت نماز ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھ کو اس قدر شرم آئی
کہ میں نے ادھر کا رستہ چلنا چھوڑ دیا۔ اور یہ نمازی جو
ان کے ہمنشین ہیں اسقدر ذلیل ہیں کہ دعوت کے لقموں
سجد کی روٹیوں پر ان کی گزر ہے۔ (توبۃ النصوح)

زنانہ مدرسہ کی استانی یہ بات لڑکیوں کے ذہن نشین
ناچاہتی ہے کہ زمین دو حصوں پر منقسم ہے۔ اور سمندرو
مختلف نام ہیں۔ معلّمہ نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا تھا
درج ذیل ہے۔ پڑھئے اور سر دھنئے :-

وہ :- جس طرح مکان کے ہر ایک حصہ کا علیحدہ نام ہوتا ہے
ا غسل خانہ۔ آبدار خانہ۔ باورچی خانہ۔ توشہ خانہ۔ بالاخانہ۔
ن۔ غلام گردش۔ سائبان۔ اصطبل۔ خانہ باغ۔ پائیں باغ
نشین۔ دالان وغیرہ۔ اسی طرح زمین کے حصوں کے نام رکھ
ئے ہیں۔ جو حصہ پانی میں ڈوبا ہے اس کو بحر اعظم کہتے ہیں
جو پانی سے کھلا ہے اس کو براعظم۔ بحر اعظم کے بھی کئی ٹکڑے
ہے لال سمندر۔ کالا سمندر۔ ہرا سمندر۔ ہند کا سمندر۔ شمالی
ر۔ جنوبی سمندر۔ انہیں ٹکڑوں کے نام ہیں۔
(نبات النعش)

مولانا نذیر احمد کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کردار قابل
تعریف ہیں:-

(۱) کم سن بچوں کا کردار (۲) پیشہ وروں کا کردار (۳) مولویوں کا
کردار (۴) پرانی استانی کا کردار (۵) لونڈیوں یا خادماؤں کا
کردار (۶) ماماؤں کا کردار (۷) جو فروش گندم نما دوستوں کا کردار۔
ان کی مثالیں ذیل میں درج ہیں:-

(۱) ہریالی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ میاں کو خوش
رکھنے کے لئے اپنے سوت کے بچے معصوم کو بہت پیار کرتی تھی
اُسے نہلاتی۔ دُھلاتی۔ سر میں تیل ڈالتی۔ آنکھوں میں سرمہ
لگاتی۔ ہمیشہ میوہ مٹھائی اُس کے لئے لگا رکھتی۔ اس لئے وہ
آٹھوں پہر چونسٹھ گھڑی ہریالی کے پاس رہتا۔ ایک دن
گھر میں کپڑا آیا۔ ماں غیرت بیگم نے چاہا کہ معصوم کی بھی اچکن
قطع کرے۔ لونڈی بھیجکر معصوم کو بلوایا۔ اُس نے بہت کچھ
اُس کی دلجوئی کی مگر وہ نہ مانا۔ زمین میں لوٹ گیا۔ جانے پر راضی
نہ ہوا۔ ہریالی نے کہا! بڑی اماں کے ہاں کیسے کیسے بہار کے
کپڑے آئے ہیں۔ جلدی بھاگ جاؤ کہ اچکن بیونتی جائے۔
بڑی اماں کہہ رہی ہیں "آنکھیں میچیں کون آئے! آنکھیں
میچیں کون آئے! معصوم آدھی دور گیا تھا کہ غیرت بیگم نے
کہا لانا تو دیئے میں آگ کا بڑا سا انگارا اس کمبخت ناشدنی
کا منہ جھلس دوں! نگوڑا باون کا بد، گندی بوٹی کا لباھنڈ
شوربا۔ آخر اپنی اصالت پر گیا۔ کنجنی کو ماں بنایا۔ میرے
سامنے اگر کسی مردار کو ماں کہا ہوگا۔ تو جیبھ پکڑ کر کاٹ ڈالوں گی
یہ سن کر معصوم پھر بھاگ گیا۔ اور ڈیوڑھی میں کھڑا ہو غیرت
بیگم کے چڑانے کو پکار پکار کر چھوٹی اماں چھوٹی اماں کہتا تھا۔
اور جہاں غیرت بیگم نے دیکھا آڑ میں ہو گیا۔ اور پھر ذرا سی دیر
میں سامنے آکر چھوٹی اماں! چھوٹی اماں کہنے لگتا۔ (فسانہ مبتلا)

(۲) جب سکہ کا رواج نہ تھا۔ اُس وقت لوگ مبادلۂ اشیاء
کیا کرتے تھے۔ اس مکالمہ میں پیشہ وروں کے کردار کا نقشہ
خاصی طرح کھینچا گیا ہے:-

موچی:- ایک موچی جولاہے کے پاس طرحدار جوتی بنا کر لے
گیا۔ اور کہا شیخ جی! دیکھو تو گردن کا دانہ دار چمڑا۔ بلیچی ہوئی
نوک۔ کھڑی ہوئی ایڑی۔ کمبخت کے پان۔ اونچی دیواریں۔
کمایا ہوا تلا۔ کھیسے نہ سورت۔ بگڑیگی۔ بھراؤ کام نہیں۔ برس روز

سے کم چلے تو اُلٹی میرے سر مارنا۔ مگر مجھکو گارڈھے کا ایک تھان چاہئے
آٹھ سے نہ ہو تو چھ سے دس گز کا پنہا چاہئے۔
جولاہا۔ چودھری! جوتی تمہاری سرس اور تھان بھی جیسا
چاہتے ہو موجود۔ سوت بھی گول ہے۔ راچھ بھی بھنی دار ہے۔
خوب ٹھک ٹھوک کر بنتا ہے۔ ماڑی کا نام نہیں۔ مگر وہ پہلی
جوتی جو تم نے دی ہے اب تک بنی کی بنی ہے۔
موچی۔ ارے شیخ جی! تین برس کی جوتی اب تک؟
جولاہا۔ کیونکہ دن بھر تو کارگاہ میں بیٹھا رہتا ہوں۔ آٹھویں دن
پینٹھ جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ جوتی پر ایسی زد کیا پڑتی ہے
دوسرے بھائی! میں غریب ہوں۔ پاؤں بھی جوتے ہولے
رکھتا ہوں۔
موچی ناامید ہو کر سنار کے پاس پہنچا اور کہا کیوں لالہ
جی تم کو جوتی کی ضرورت ہے؟
سنار۔ ہاں بھائی، اچھے آئے! دس دن سے ننگے پاؤں
پڑا پھرتا ہوں۔ اور اس کے بدلے زیور بھی وہ بنا کر دوں کہ تمام
برادری کا ہے کو کسی کے پاس نہ نکلے۔
موچی۔ اجی ساہ جی کہاں ہم اور کہاں زیور۔ دیکھو کہ چیتھڑے
لگائے رہتا ہوں۔ بچوں کے پاس ٹوپی تک نہیں۔ گھر والی
پھوہڑ، لہنگا گھٹنے گھٹنے تار تار ہو گیا۔ مجھے تو صرف کپڑے کی ضرورت
ہے۔
سنار۔ کپڑے کی ضرورت ہو تو شیخ نمازی کے پاس جاؤ۔
موچی۔ گیا تو تھا۔ اس کے پاس جوتی موجود ہے۔ لالہ جی بہت
برا ہوا! مجھ غریب کی جوتی اینڈ کر رہ گئی۔
(سکے کا رواج اسی لئے عمل میں آیا کہ کسی کی ضرورت
اٹکی نہ رہے) (بنات النعش)

۳۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کٹر مولوی تھے اور ہمیشہ شرع
کے پابند رہے۔ تاہم ملا نما گروہ جب جب موقع آیا انہوں نے
مولویوں اور مذہبی باتوں کا خاکہ اڑانے میں کوئی کسر اٹھا نہ
رکھی۔ جیسے:۔

(الف) اگر ابا جان کو یہی منظور تھا کہ میں بڑا ہو کر مسجد کا ملا نایا
قبرستان کا قرآن خواں بنوں یا لنگر خانہ خیراتی کا ملا گدا بنوں
تو مجھکو آغاز ہی سے ایسی تعلیم کی ہوتی کہ اب تک کچھ نہیں تو دو
چار جگہ تو کر آیا ہوتا۔ پنجایت میں میری قرأت کی دھوم ہوتی۔
تراویح میں میرے لہجہ قرآن خوانی کی شہرت اڑتی۔ کہیں مردہ مرتا
نماز مجھکو ملتی۔ کہیں قربانی ہوتی کھال میرے پاس آتی۔ صدقے کا
میں اڑھنیا ہوتا۔ زکوٰۃ کا ٹھیکیدار۔ دعوتوں کا مستحق۔ خیرات
کا حقدار۔ (توبۃ النصوح)

(ب) مولوی یا ملا نما قسم کے آدمی پرلے سرے کے مغرور ہوتے
ہیں۔ کبھی راہ میں ان سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو نہ آداب کرتے
ہیں نہ تسلیم نہ بندگی۔ دور ہی سے السلام علیکم کا پتھر کھینچ مارتے
ہیں۔ ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ سر نہیں ہلاتے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ
سو قدم سے ہاتھ پھیلائے مصافحے کے لئے لپکتے ہیں۔ گویا
چیل جھپٹا مارنے کے لئے پھڑپھڑاتی ہوئی چلی آ رہی ہے ؎
دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں (توبۃ النصوح)

نوٹ:۔ اسی کتاب میں ایک جگہ ملا نا نے مولویوں کو مردہ شو
اور قل آعوذیئے لکھا ہے۔

(ج) ابن الوقت کے خلاف جو کفر کے فتوے لکھے گئے تھے۔
ان میں سے ایک فتویٰ ہماری نظر سے بھی گزرا۔ فتویٰ کا ہے کو
تھا اچھا خاصہ اقلیدس کا پہلا مقالہ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ مربع
مستطیل۔ بیضوی سب شکلوں کی مہریں اس میں تھیں اور
بعضی تو کف دست کے برابر چوڑی چکلی تھیں۔ طغرے کیسے
کیسے پیچیدہ کہ ہمایوں کی بھول بھلیاں کی کیا اصل ہے۔ دلی
کا فتویٰ اور دلی ہی کے علماء کی مہریں اور پھر سمجھ میں نہیں
آتا کہ کون کس کی مہر ہے۔ آخر نہ رہا گیا۔ پوچھنا ہی پڑا کہ کیوں
صاحب یہ خادم الشریعت الغرا ومروج الملت البیضا المحمدیہ
الحاج الشیخ ابو الفضائل محمد ابن الشہیر معین الدین الحنفی القادری
الاویسی المازندرانی ثم البخاری کون بزرگ ہیں؟
صاحب فتویٰ:۔ آہا! نہیں پہچانا۔ یہ وہی مولوی صاحب ہیں
جو موچیوں کی مسجد جمعہ کے جمعہ وعظ کہا کرتے ہیں۔
ہم:۔ بارے مولوی صاحب کی مہریں بھی فتووں پر ہونے
لگیں؟۔
صاحب فتویٰ:۔ [illegible] مہر نہ کراؤ تو وعظ
میں نام [illegible] ہیں کہ معاذ اللہ! گمراہ
بیچارے ہیں [illegible] مسائل میں دونوں
طرف والے [illegible] کسی کا دل نہیں دکھانا
(ابن الوقت)

توبۃ النصوح کے آخری صفحات میں حوالیوں کے کردار کے ثبوت میں وہ گفتگو بھی قابل دید ہے جو ریاست دولت آباد کے صدر الصدور اور کلیم کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ گفتگو عربی اور منطقی الفاظ سے پُر ہے۔

مولانا نذیر احمد صاحب کے مندرجہ ذیل کردار بھی قابل تعریف ہیں:-

قدیم زمانے کی اُستانیوں کا کردار

"اور مکتبوں میں دن بھر کی قید اور اُستانیوں کی سختی تھی۔ پڑھنا کم اور ماما گیری کا کام کرنا بہت۔ دن بھر میں پڑھتے تو صرف دو حرف۔ صبح و شام خانگی کام میں مصروف۔ پڑھتے وقت جہاں چپ کی اور اُستانی جی کی نظر پڑ گئی تو آفت آ گئی۔ اور کام کو پوچھو تو صبح آنے کے ساتھ گھر میں جھاڑو دی۔ اُستانی جی۔ اُستاد جی اور دس بارہ خلیفہ جی بلکہ پڑوسیوں تک کے بچھونے تہ کیے اور چار چار پانچ پانچ لڑکیوں نے مل کر کمبخت بھاری بوجھل چارپائیاں اُٹھائیں۔ پھر آن کی جو شامت آئی تو سیپارہ لے کر بیٹھیں۔ منہ سے آواز نکلی اور اُستانی نے جوتی پھینکنی شروع کی۔ اور دو چار جو کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اُٹھی تھیں کام دھندے میں لگ گئیں۔ کسی نے اُستانی کے لڑکے کو گود میں لیا۔ بوجھ کے مارے کمر ٹوٹی جاتی ہے۔ مگر مار کے ڈر سے اُسے لادے لادے وقت ٹالتی پھرتی ہے۔ پٹتی ہوئی لڑکیوں کی آواز کان میں چلی آ رہی ہے۔ دل ہے کہ اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے۔ کسی نے رات کے جھوٹے برتن مانجھنے شروع کیے۔ گٹے پڑ گئے ہیں۔ اور کسند سے رہ رہ جاتے ہیں۔ چھوٹی بہن پٹ رہی ہے اور چلا کر کہہ رہی ہے کہ اچھی اُستانی جی میں مر گئی۔ اچھی میں تم پر واری گئی۔ اچھی خدا کے لئے نہ مارو میں خلیفہ جی کی لونڈی ہو گئی۔ ہائے رے! ہائے رے! ری اماں اری آپا! اور آپا ہیں کہ مارے خوف کے جھائیں جھائیں برتن مانجھ رہی ہیں۔ پھر دوپہر کو اُستانی جی ہیں کہ لیٹی ہیں اور معصوم بچیاں پنکھا جھل رہی ہیں۔ اور دل منا رہی ہیں کہ الٰہی ایسی سوئیں نہ پھر نہ

(مرآۃ العروس)

لونڈیوں اور خادماؤں کا کردار

یوں دیکھنے اور کہنے کو تو حسن آرا اکیلی مکتب میں بیٹھی مگر کوئی درجن بھر لونڈیاں اور کوڑی بھر سہیلیاں اُس کے ساتھ تھیں۔ لونڈیوں کا تو یہ قاعدہ تھا کہ بے ضرورت بھی ہر دم چاروں طرف سے حسن آرا کو گھیرے رہتیں۔ اور کچھ نہیں تو بات بات میں خوشامد۔ بات بات میں تعریف اور ذرا چھینک بدلی کہ سب بول اُٹھیں بسم اللہ بسم اللہ۔ اچھینک لی تو سب چلائیں شکر الحمد للہ۔ انائیں ہیں کہ چپکے ہی چپکے قل ہو اللہ کی تسبیحیں پڑھ کر پھونک رہی ہیں۔ اتائیں ہیں کہ بار بار ان پکا دم کرتی جاتی ہیں۔ اور جو کہیں حسن آرا نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو کوئی جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی۔ کوئی چونری پارہ مال بلانے کھڑی ہو گئی۔ کوئی بولی واری جاؤں گلوری کھا لو یا گوٹے ہی کے دو دانے منہ میں ڈال لو۔ دیر ہوئی منہ بدمزہ ہو گیا ہو گا۔ کوئی کہنے لگی صدقے گئی! ایک گھونٹ شربت پی لو۔ نگوڑے ہونٹھ ہیں کہ سوکھے چلے جاتے ہیں۔ پیڑیاں بندھ گئی ہیں۔ بھاڑ میں جائے ایسا پڑھنا۔ اللہ لگے ایسے مکتب کو! منہ تو دیکھو کیسا ذرا سا نکل آیا ہے۔ یہ کہہ کر جلدی سے ایک چٹ چٹ بلائیں لے حسن آرا کو گلے سے لگا لیا۔ جس شخص پر حسن آرا کی طرح ایسی لونڈیوں کا غضب الٰہی اور ایسے نوکروں کی بلا مسلط ہو اُس کے مزاج کا درست رہنا تعجب کی بات ہے۔ فرشتہ بھی ہو تو ایسی صحبت میں تو بہ توبہ بھوت سے بدتر ہو جائے۔

آوارہ گرد جعل ساز عورتوں کا کردار

محمد عاقل نے اپنی بیوی مزاجدار بیگم سے کہا کہ قصبہ میں ایک ٹھگنی (آوارہ گرد عورت) آئی ہوئی ہے۔ اُسے گھر میں نہ آنے دینا۔ کئی گھروں کو لوٹ چکی ہے۔ مزاجدار بیگم شدت سے بے وقوف تھی۔ وہ ہر کسی سے جلد مل جاتی تھی۔ ایک روز وہ جعلساز عورت حجن کا بھیس بنا اُس کی گلی میں آئی۔ بیوقوف عورتوں کے پھسلانے کے لئے وہ طرح طرح کے تبرکات پاس رکھا کرتی تھی۔ مثلاً تسبیح۔ خاک شفا۔ زمزمیاں۔ مدینہ منورہ کی کھجوریں۔ کوہ طور کا سرمہ۔ خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا۔ عقیق البحر

کی تسبیح - مونگے والے۔ نادِ علی - پنجسورے اور بیسیوں دوائیں مرزا جدار نے زلفن کے ذریعے جگن کو اپنے ہاں بلایا۔ جگن نے ایک ہی نظر میں مرزا جدار کو تاڑ لیا کہ عورت جلد ڈھب پر چڑھ جائیگی پہلے چند چیزیں سستی دیں۔ مرزا جدار لالچ میں آگئی اور کہا جو چیز سستی ہو لایا کرے مجھے دکھایا کیجئے۔ ایک دن چھوٹے موتیوں کی ایک جوڑائی اور کہا یہ ایک بیگم کی ہے جن کو پیسوں کی سخت ضرورت آپڑی ہے۔ جوہری دو سو آنکتا ہے۔ میں تم پر احسان کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے صرف پچیس روپے بھی دوگی تو میں بیگم کو منالونگی۔ یہ چیز ہاتھ سے نہ جانے دو ورنہ پچھتاؤگی۔ مرزا جدار بیگم نے کہا اس وقت پیسے نہیں ہیں مجبور ہوں۔ کہا اچھا پہنچیاں بیچکر خرید لیجئے۔ مرزا جدار نے کہا گھر میں اور کوئی آدمی نہیں ہے کہ صرافے میں بھیجا جائے۔ ٹھگنی نے کہا۔ لائیے میں بیچ لاؤں۔ اور ان دوسرے زیوروں کا ڈورا بھی ڈلوا لیجئے۔ کیسا میلا میلا اور بے رونق نظر آتا ہے۔ اپنی ماما کو ساتھ کر دیجئے اُسی کے سامنے سب کام ہوگا۔ مرزا جدار نے زلفن کو ساتھ کر دیا کہ جگن کے ساتھ رہے۔ ٹھگنی نے زلفن سے کہا کہ بی ذرا گھر جاؤ اور بیگم سے کہو کہ ناک کی کیل جو اُجلوانے کے لئے دی تھی گھر ہی پر رہ گئی ہے۔ زلفن کیل ڈھونڈنے کے لئے گئی اور ادھر ٹھگنی زیورات لے کر چمپت ہوگئی۔ بہیترا تلاش و جستجو کی گئی مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

ماماؤں کا کردار

ماما عظمت محمد کامل کے گھر میں بہت کچھ غبن کر چکی تھی۔ محمد کامل کی والدہ نے پرانا سکہ بٹھا رکھا تھا۔ اصغری جو نئی نئی بیاہی ہوئی آئی اس نے باورچی خانہ میں دخل دینا شروع کیا۔ یہ بات ماما عظمت کو ناگوار گزری۔ ایک دن اصغری نے ماما سے کہا او بی! کیسا نیلا نیلا تیلا ہی اٹھا لائی ہو۔ اور چوگنے دام دھرے۔ یہ تو ایک پیسے کا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اصغری کو پورا یقین ہوگیا کہ ماما عظمت اس گھر کو موسنے پر تلی ہوئی ہے۔ ماما آفت کا پرکالہ تھی۔ اصغری کے خلاف محمد کامل اور بیگم کے کان بھرنے شروع کئے۔ پان چھالیا سے لے کر جو کچھ سودا سلف گھر میں آتا ماما اس کے تگنے چوگنے دام بتاتی۔ باہر سے جو پیچھے بکنے آتے سب اپنے گھر پہنچاتی۔ اور گھر سے باہر جو جتنے جاتے اُن میں سے بھی نصف چُراتی تھی۔ شب برات کا حلوہ مہینوں پہلے کی طرح سکھا سکھا کر بیچا کرتی۔ اصغری کو اپنے میکے کی ماما کفایت النسا سے یہ پتہ چلا تھا کہ ماما عظمت بہت غبن کرتی ہے۔ ایک دن ماما عظمت اصغری کے پاس گئی وہاں ماما کفایت بیٹھی ہوئی تھی۔ کفایت نے کہا کیوں بُوا عظمت یہ کیا ماجرا ہے۔ چوری کون نہیں کرتا۔ دیکھو بی اصغری موجود ہیں سات برس تک برابر خدمت کی۔ اللہ رکھے امیر گھر اور امیری خرچ۔ ہزار دو ہزار کا سودا انہی ہاتھوں سے آیا حق دستوری کے سوا کبھی کوڑی نہیں لیا۔ اتنا تو ہر نوکر کا دھرم ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر نمک حرامی میں داخل ہے۔ ماما عظمت نے کہا بُوا میرا حال کون نہیں جانتا اب میری بلا چھپائے میں تو چراتی اور لوٹتی ہوں۔ لیکن نہ آج سے بلکہ سدا سے میرا یہی کام ہے۔ ذرا میری حالت پر بھی نظر کرو۔ اور دیکھو کہ اس گھر میں کس بلا کا کام ہے۔ اندر باہر میں اکیلی۔ چار نوکروں کا کام میرے اکیلے کے دم پر پڑتا ہے۔ پھر بوا بے مطلب تو کوئی اپنی ہڈیاں یوں پیلتا نہیں! یہ سمجھ کا پھیر ہے۔ چار آدمی کے بدلے میں اکیلی ہوں۔ چار کی تنخواہ بھی مجھ اکیلی کو ملنی چاہئے۔

یہ ماما کئی بار نکالی گئی تھی۔ مگر نئے بزاز۔ سنار۔ قصاب۔ کنجڑے جن جن سے اس کی معرفت ادھار ہوتی تھی تقاضے کے لئے آموجود ہوتے۔ اس ڈر کے مارے پھر بلالی جاتی تھی۔ اس گھر میں کپڑا۔ غلہ اور دیگر اشیائے خوردنی اُدھار آتی تھیں۔ اور سب چیزیں ماما عظمت کی معرفت بیگم کے نام لکھی جاتی تھیں اس لئے کھلے خزانے کہتی تھی کہ میرا نکلنا آسان نہیں ہے۔ گھر نیلام کرا کے نکلونگی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دونگی۔ ساہوکار نے جا در پے قرض کا تقاضا کیا تو عظمت نے گھر کی بیگم کو ڈرا دیا کہ اگر جلد قرض ادا نہ ہوا تو سرکاری حکم سے مکان کی قرقی ہو جائیگی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے ایک مکان پر چسپاں شدہ اشتہار اُتار کر کامل کے پھاٹک پر چپکا دیا اور کہا کہ لو بی! سرکاری حکم پر آلگا ہے۔ اب تم جانو اور ساہوکار۔ یہ اشتہار شہر میں [illegible] لگائے گئے کہ لاٹ صاحب کی تشریف آوری کے وقت [illegible] اپنے اپنے مکان صاف اور [illegible] رکھیں۔ اصغری کو ماما عظمت کی یہ تمام کارستانی معلوم [illegible] خیر اندیش ماما کو [illegible] تحریر کیا کہ [illegible]

محمد فاضل صاحب (خسر اصغری) کو بھی ساتھ لیتے آتے۔
بدرو رخصت لے کر آئے۔ ساہوکاروں کو بلا کر حساب کیا تو
بہت سی اشیاء جو ماما عظمت نے بہی کھاتے میں لکھائی
تھیں جھوٹی ثابت ہوئیں۔ کنجڑے۔ قصاب۔ کپڑے والا۔ گراں
فروش سب کے بہی کھاتے جانچے گئے۔ ہر ایک کے بہی
کھاتے میں ماما عظمت کا کافی سے زیادہ غبن نظر آیا۔ اور ایک
دستہ قرض صرف بیگم صاحبہ کے نام اور تمنا روپیہ ماما عظمت
کے ذمے نکلا۔ اس میں سو روپے کی وہ رقم بھی تھی جو مولوی
محمد فاضل نے ساہوکار کو ادا کرنے کے لئے بھیجی تھی اور ماما
عظمت پوری کی پوری رقم ہضم کر گئی تھی۔ یہ حال دیکھ کر
مولوی صاحب نے ماما عظمت کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس
نے بہت کچھ منت سماجت کی لیکن مولوی محمد فاضل صاحب
مطلق نہ پسیجے۔

جھوٹے دوستوں کا کردار

ثانیاً اور جھوٹے دوستوں کے ثبوت میں مرزا ظاہردار
بیگ کا کردار قابل تعریف ہے جو درج ذیل ہے۔ اسمیں
جنوں کی زبانی جو حکایت درج ہے وہ فن مکالمہ نویسی میں
اپنا جواب نہیں رکھتی۔

ظاہردار بیگ نے اپنے آپ کو ایک خوش باش جمعدار کا
وارث بتا کر کلیم کے ہاں خوب گھوتیاں کیں۔ یہ ظاہردار بیگ
یونہی بنا ٹھنا چھیلا بنا اکڑتا اینٹھتا ادھر ادھر پھرا کرتا تھا
نہ یہ صاحب ثروت نہ شاندار جمعدار کا والی وارث۔ کلیم کے دل
میں اس کی بڑی عزت تھی اور سمجھتا تھا کہ وہ عالی شان
دیوڑھی میں رہتا ہے۔ اس لئے جس رات کلیم باپ سے
ناراض ہو کر بھاگا وہ سیدھا ظاہردار بیگ کی تلاش میں
روانہ ہوا اور شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا مرزا کے
مکان پر پہنچا۔ ابھی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے
[illegible] بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے
[illegible] کنڈی کھٹکھٹائی تو جواب ندارد۔ آخر کنڈی کھڑکھڑائی تو دو
لونڈیاں اندر سے نکلیں۔ ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں
[illegible] رات گئے کیا کام ہے۔
[illegible] جاؤ مرزا کو بھیج دو۔
[illegible] کون مرزا ؟

کلیم۔ مرزا ظاہردار بیگ جی کا مکان ہے۔
لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہردار بیگ نہیں ہیں۔
کلیم۔ تو کیا ظاہردار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں
ہیں ؟
لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ متوا ظاہر دار
بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔
دوسری لونڈی۔ اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے
کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا
ہے۔
کلیم کی طرف مخاطب ہو کر: کیوں میاں وہی ظاہردار بیگ نا
جن کی رنگت زرد زرد۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل۔
اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں ؟
کلیم۔ ہاں ہاں! وہی ظاہردار بیگ۔
لونڈی۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اپلوں کی
ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اس میں
رہتے ہیں۔
کلیم نے آواز دی۔ مرزا ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے
باہر تشریف لائے۔ کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے آہا!
آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ بندہ کو پہن کر سونے کی عادت
نہیں۔ ذرا کپڑے پہن کر آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔
کلیم۔ کہاں چلئے گا؟ میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے
کی نیت سے آیا ہوں۔
مرزا۔ چلئے تو اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ
ہے۔ میں ابھی آیا۔
کلیم نے مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا ایک پرانی سی ویران
وحشت ناک مسجد ہے۔ چمگادڑوں کی بیٹ سے زمین پر
کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ بڑی دیر کے بعد مرزا آئے تو
کہا بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے خفقان
کا عارضہ ہے۔ میں مجبور ہوں۔
کلیم۔ بندہ کا تو اس وقت گھر پلٹ کر جانے کا ارادہ نہیں
انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ میں بھوکا ہوں۔ پیٹ میں
کچھ پڑ جائے تو کسیقدر طمانیت ہو۔
ظاہردار بیگ۔ مرد خدا اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں

ایک علاج ہے کہ چھدامی بھر بھڑبھونجے کے یہاں سے گرم گرم
خستہ چنے بھنا لاؤں۔ بس دھیلے کے بجائے اور تمکو کافی ہونگے
ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا چشم زدن میں باہر گئے
اور چنے منگوا لائے اور لائے۔

مرزا:- یار! ہم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت
بھاڑ مل گیا۔ واللہ! ہاتھ تو لگاؤ کیسے جھلس رہے ہیں۔
کسقدر لذیذ ہیں۔ سوندھی سوندھی خوشبو ہے! تعجب ہے
کہ عطرساروں نے مٹی اور خس کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے
چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال
بھی کیا چیز ہے! بندہ نے سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے
میں جامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ تلف کر جاتا ہے۔ بھئی تمہیں
میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوبصورت اور خوش قطع
سڈول چنے تم نے پہلے کبھی دیکھے تھے؟ دانوں کی رنگت
دیکھنے کی بنتی ہے کیسی اچھی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما
یوں تو صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن
چنے کی لذت کوئی نہیں پاتا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ چنا حضرت
میکائیل کی خدمت میں گیا اور فریاد کی کہ یا حضرت میں نے
ایسا کیا قصور کیا کہ جہاں میں نے زمین سے سر نکالا تیر ستم
مجھ پر چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم
مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ
تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے میری کونپلوں کو توڑ توڑ کر آدمی
ساگ بناتے ہیں اور جب بار ور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے
آدمی ٹڈی بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے
نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھس
بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا
دانہ اس کو چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں
بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ گھنگھنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے
آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا
حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح بیباکانہ چٹر پٹر بولنا
سنکر حاضرین دربار اسقدر خوش ہوئے کہ ہر شخص اسے
کھانے کو دوڑا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں۔
کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔

(توبۃ النصوح)

سرحدی پٹھانوں کی طاقت کا مظاہرہ

غدر سے پہلے سلاطین (شاہزادوں) کو کبوتر بازی و
بٹیر بازی کے علاوہ کشتیاں لڑانے کا بھی شوق تھا۔ یار لوگوں
نے صاحب عالم کے سامنے ذکر چھیڑا کہ حضور آجکل شہر میں
ولایتی میوہ فروش آئے ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ
شاہی اکھاڑے کے پٹھے کی کشتی قرار پا جائے تو بڑا مزا آئیگا۔
صاحب عالم یہ بات سنکر پھڑک گئے۔ اور فرمایا تمہاری
قسم کیا بات پیدا کی ہے۔ واقعی ولایتی کی کشتی کا خوب مزہ
آئیگا۔ دیکھیں تو وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔ اور سوالوں نے
کچھ دے دلاکر راضی کر لیا۔ ولایتی ایسا موٹا تازہ تھا کہ اس
پر نہیں ٹھیرتی تھی۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکی ہوئیں
میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ پانچ گز سے مست ڈھیے
کی سی بو ایسی سخت آتی تھی کہ ناک سڑی جاتی تھی۔ بیٹھو پر ہینگ
کا مشکیزہ تھا۔ ادھر جوتیوں سے ادھر مشکیزہ سے چیڑ چیڑ
کی آواز چلی آتی تھی۔ اکھاڑے کے تمام پٹھے اس کے سامنے
ایسے نظر آتے تھے جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے۔ اکھاڑے
میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڈ پیل رہا تھا۔
کوئی تین سوا تین من کی جوڑی ہلا کر دونوں ہاتھ کے کرتب دکھا
رہا تھا۔ اتنے میں غل ہوا کہ پٹھان آگیا۔ تمام تماشائیوں کی
ٹکٹکی اس پر بندھ گئی۔ اس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا
دم فنا ہوا۔ استاد نے دست بستہ عرض کی۔ صاحب عالم!
اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے پٹھے اپنے وقت کے رستم
و اسفندیار ہیں۔ لیکن سرکار راجہ میں کے چاقو کو قصائی کے
بغدے سے بھڑاتے ہیں۔ ساری عمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا
ہے۔ تعمیل حکم میں مجال عذر نہیں۔ پچھڑ بیٹھے تو نہیں۔ مگر اس کے
ہاتھ تو ملاحظہ فرمائیے کہ صرف کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانا
مشکل ہے۔

صاحب عالم۔ آغا تمہارا جی چاہے اس پٹھے کے ساتھ کشتی
لڑو۔

آغا۔ ہم سب سے کشتی لڑے گا!

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا اور کہا کہ غنیمت ہے
ایک کی دارو دو۔ سارے کا سارا اکھاڑا اس اکیلے کو پیٹ ڈالے

جو چوہاؤں تیج یار قصے سب چلاتے تھے آغا ہیں کہ مطلب از جا نمی جنبد اینے کی لاٹھ کی طرح جمے کھڑے ہیں۔ آغا نے ایک کو اس بغل میں دبایا۔ دوسرے کو دوسری بغل میں اپنے نزدیک اُس نے آہستہ دبایا تھا۔ مگر ان میں کا ایک آج تک کُب لئے پھرتا ہے۔ اور دوسرا مدتوں تک خون تھوکتا رہا۔ (موعظۂ حسنہ)

مولانا نذیر احمد نے اپنے بیٹے کے نام ایک خط لکھا تھا۔ اُس میں صحت و ورزش کے فوائد گنائے تھے اور مثال کے طور پر مندرجہ بالا نقل تحریر فرمائی تھی۔ چونکہ مولانا کے مزاج میں ظرافت کا عنصر بدرجہ غایت تھا۔ اس لئے اس حکایت میں بھی انہوں نے حسب عادت ظرافت سے کام لیا ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ باوجود شمس العلما ہونے کے مولانا نے بھانڈوں کے کردار کو بھی سپرد قلم کرنے سے گریز نہیں کیا اور صحیح معنوں میں یہ پارٹ نہایت خوبی و برجستگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

بھانڈوں کا تماشا

مبتلا کے چچا میر متقی اپنے بھائی کے دوران حیات میں حج کے لئے چلے گئے تھے۔ مبتلا باپ کے پیچھے آزاد، فاسق و فاجر ہوگیا تھا۔ رات بھر گھر میں محفل رقص و سرود گرم رہتی بھانڈ، قوال، کنچنیاں اور بدمعاشوں کا جمگھٹا رہتا۔ محلے کے خدا پرست اور نمازی دق ہوکر مسجد میں جا جا کر سوتے تھے۔ چند ماہ کے بعد میر متقی حج سے لوٹے۔ آدھی رات گئے بھائی کے گھر پہنچے۔ بہت کچھ چیخے چلائے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اس لئے یہ بھی مسجد میں جا پہنچے اور وہیں رات گزاری۔ لوگوں سے بھتیجے کے حالات سنے۔ بہت افسوس کیا۔ صبح مبتلا کے گھر آکر آواز دی۔ رات کے جاگے ہوئے جلدیا دکار سوئے پڑے تھے۔ جب میر متقی کے آنے کی خبر سنی ہوش گم ہوگئے۔ کچھ بھاگ نکلے بچے کھچے صحن میں آکھڑے ہوئے۔ اتنے میں بھانڈوں نے حسب ذیل ایک نقل کرنی شروع کر دی۔ وہ درج ذیل ہے:-

پہلا بھانڈ:- اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ شور مچانے لگا۔

دوسرا بھانڈ۔ کیا ہے بے کیا ہے؟ یہ شور و غل کیوں مچا رکھا ہے۔

پہلا بھانڈ۔ ابے احمق تو نے نہیں سنا کہ حضرت کے چچا مکہ معظمہ سے تشریف لائے ہیں۔

دوسرا بھانڈ۔ کون چچا۔ ابو جہل یا ابولہب؟

پہلا دوسرے کے منہ پر زور سے طمانچہ مار کر "چپ رہ مردود!" کیا کفر بکتا ہے۔ ابے حضرت پیغمبر صاحب کے چچا نہیں ہمارے پیر و مرشد حضرت مبتلا کے چچا۔

دوسرا بھانڈ۔ الحمد للہ! پھر ڈرنے کی کیا بات ہے آئیے ہم سب مل کر ان کو چچا بنائیں۔ حج نصیب ہونے اور سلامتی سے واپس آنے کی مبارکباد دیں۔ ناچ دکھائیں گانا سنائیں۔

پہلا بھانڈ۔ دوسرے کے منہ پر طمانچہ مار کر۔ ابے توبہ کر توبہ! کہیں اوپر سے آسمان نہ ٹوٹ پڑے۔ سید۔ آل رسول۔ مولوی۔ حاجی جو ابھی ابھی خدا کے گھر سے پھر ہوئے چلے آرہے ہیں کہیں ناچ دیکھتے ہیں؟ گانا سنتے ہیں؟ ان کے عندئے میں ناچ دیکھنا حرام اور گانا سننا ممنوع ہے۔ ان کے نزدیک رنڈیاں جہنم کی چھپٹیاں اور بھانڈ دوزخ کے کندے ہیں۔

دوسرا بھانڈ۔ ہائے میرے اللہ! رنڈیوں نے دوزخ میں بھی بھانڈوں کو نہ چھوڑا۔ نرے کندے ہوتے تو ذرا دیر میں جلتے۔ اور کیوں صاحب یہ سب لوگ (مبتلا اور اس کے ساتھی) کیا ہوں گے۔ ان پر کیا بپتا پڑیگی؟

پہلا بھانڈ۔ کہتے ہیں یہ بھاڑ میں بھونے۔ کڑھائی میں تلے اور بھٹی میں جلائے جائینگے۔

دوسرا بھانڈ۔ ہاتھوں کو ہولے ہولے گالوں پر مارتے ہوئے۔ الٰہی توبہ الٰہی توبہ! خدا دوزخ کی آنچ سے بچائے اور بھانڈوں کو بھوت بنائے۔ آسیب بنائے۔ جو چاہے سو کرے۔ مگر دوزخ کے کندے نہ بنائے۔ بھلا یہ حاجی صاحب چاہتے کیا ہیں؟

پہلا بھانڈ۔ چاہتے یہ ہیں کہ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ خدا کی بندگی کرو اور جو روپیہ رنڈیوں بھانڈوں کو دیتے ہو غریبوں اور محتاجوں کو دو۔

دوسرا بھانڈ۔ بھئی بات تو واجبی ہے۔ رنڈیوں کا
دینا محض فضول ہے۔ رہے بھانڈ۔ سو اُن سے بڑھ کر غریب
اور محتاج کون ہوگا۔ یہ کہہ کر عمامہ باندھ۔ پائنچے ٹخنوں سے
اونچے کر جس طرف کھڑا تھا اُسی رُخ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ
دئے۔ اور نماز ہی کی حالت میں کہا بھائی ٹک کھول دو اور
مولوی، حافظ جی، زوار یا واعظ جو ہوں اُن کو آنے دو۔
کہ وہ بھی نماز میں شامل ہو جائیں۔ بھانڈ صف بستہ
ہو کر مقتدی بنے۔ ذرا دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک نے صف سے
نکل کر امام کی پیٹھ پر ایک دوہتڑ مارا اور کہا کہ اسے بدعتی
یہ کیسی بے رخی اور بے وقت کی نماز پڑھ رہا ہے۔ اگر مولوی
محمد اسمٰعیل کے مقلد سن پائیں تو مارے کفر کے فتوؤں
کے اُتو کر دیں۔

امام! ابے تو کیا جانے یہ صلاۃ الخوف ہے!

تھوڑی دیر کے بعد پیچھے کی صف سے پھر ایک آدمی
آگے بڑھا اور امام کا عمامہ اُتار کر اُس نے تڑا تڑ دس بیس
تھپیڑے رسید کئے۔ امام اپنا سر ہلاتا یہ کہتا ہوا بھاگا۔
کر توبہ توبہ! کفر کا فتوی آگیا۔ یہ سُن کر مارنے والے نے کہا
ابے ڈرمت۔ فتوی نہیں! تیری عبادت کا صلہ ہے۔

امام۔ عبادت کا صلہ ہے تو اس میں مقتدیوں کا بھی حق
ہے۔ پھر تو اس سرے سے اُس سرے تک بلا امتیاز جوتی
کاری ہونے لگی۔ رنڈیاں، بھڑوے، میر محفل اور تماشائی
سب پر آفت آئی۔ سب کے سامنے پٹنے کی وجہ سے
مبتلا کی ایسی سٹی گم ہوئی کہ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگا
اور ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

ایک ڈپٹی کلکٹر کی کلکٹر سے ملاقات

میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ مہینوں
سوچنے اور خیال کرنے کے بعد ٹھیل ڈھکیل کر خود کو کوٹھی پر
پہنچاتا ہوں۔ مگر افسروں کی وہی پہلی سی بے لطفی پاتا ہوں۔
کوٹھی کے احاطے میں پہنچتے ہی اردلی کے سپاہی ادھر اُدھر
چھپے ہوئے ایسے چپ ہو جاتے ہیں گویا انہیں سانپ سونگھ
گیا ہے۔ احاطہ اتنا لمبا ہوتا ہے جیسی شیطان کی آنت۔
کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے دم پھول جاتا ہے۔ جب میں ملاقات
کو گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ موسم گرما تھا اور لُو کے جھکڑ چل رہے تھے
گھنٹوں کوٹھی کے ادگرد پھرتا رہا۔ کھانستا کھنکارا۔ مگر بیسیوں چپراسیوں
میں سے کسی نے میری بات نہ پوچھی۔ کمبخت دیکھتے ہیں اور جان
بوجھ کر کنی کترا جاتے ہیں۔ کھڑے کھڑے طبیعت اُکتا گئی اور
جی چاہا کہ واپس چلا جاؤں۔ اتنے میں ایک اردلی نظر آیا منہ پھیر
کر کہا کیوں جمعدار ملاقات کا کوئی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ اس نے
کہا آج تو ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ شاید ہی موقع ملے۔ مگر
آپ کچھ دیر بیٹھئے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ میں نے
کہا بھائی کہاں بیٹھوں؟ یہ سُن کر اُس نے ایک کرسی دی
جس کا تکیہ اور ایک بازو ندارد تھا۔ میں جب جب دریافت کرتا
تو یہ پتہ چلتا کہ ابھی کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے
کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ اب کھانے کی میز پر
ہیں۔ میں لاحول پڑھتا اور دل ہی دل میں بُرا بھلا کہہ کر چپ
ہو رہتا۔

آخر ہزار خرابی میری طلبی ہوئی۔ جا کر ابھی کرسی پر پوری
طرح بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اردلی نے کہا کہ سررشتہ دار
صاحب آ گئے ہیں۔ میں ملجا و ماوی آدھی کرسی پر اس طرح ٹکا
ہوا تھا جیسے اُڑے پر۔ گلدم کہ صاحب بہادر نے کہا اچھا آنے
بولو! اور میری طرف مخاطب ہو کر کہا گرمی توبہ! میں نے گردن
جھکا کر کہا کہ خداوند گرمی کے تو دن ہیں۔ میرے حلقے میں تو
لُو سے کئی آدمی مر گئے۔ امید تھی کہ لوگوں کا مرنا سُن کر چونک
پڑیگا اور پوچھے گا کب مرے۔ کہاں مرے اور کتنے مرے
لُو کا ہندوستانی علاج کیا ہے۔ غرض آدمی کا دل بولنے کو چاہے
تو بہتیرے حیلے ہیں۔ مگر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ اب
سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے۔ اور میری اور
صاحب کی اس تپاک سے ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ۔
اس اثنا میں صاحب نے مجھ سے پوچھا اور سچ سچ (کیا اور کتنا
چاہتے ہو) یہ سُنتے ہی میں حقارت آمیز غصے سے بھرا ہوا اُٹھ
کھڑا ہوا اور کہا بندہ فقط سلام کے لئے حاضر ہوا تھا۔ ہماری ملاقات
کیا خاک۔ بامزہ بھی جانے کہ جانا اٹھا اور چولھے کی طرح بیٹھا۔
گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکی۔ افسوس
ہے تو یہ ہے کہ کاش سررشتہ دار اور اردلیوں کو میرا اس طرح
بے نیل مرام لوٹنا معلوم نہ ہوتا جب میں کوٹھی کے پاس کھڑا کھڑا

گھنٹوں سوکھا کیا اس وقت اردلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا لیکن جونہی گھر جانے کے لئے میں نے بگھی میں قدم رکھا چپراسیوں نے آگھیرا۔ میں متعجب کہ یا اللہ! یہ حشرات الارض کی طرح یکایک کہاں سے پیدا ہو گئے! میں نے بہتیرا ٹالنا چاہا کہ تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ یا عید پر خیال کیا جائے گا۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور ایک کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں دے کر کہا کہ اس پر چٹھی لکھ دیجئے۔ میں جب جب لکھنے کی کوشش کرتا وہ میرا ہاتھ تھام لیتے۔ اور میرے منہ کی طرف دیکھتے۔ آخر میں نے ایک روپیہ کاغذ میں لپیٹا اور دینا چاہا۔ وہ زیادہ کا اصرار کرنے لگے۔ آخر میں نے وہ روپیہ والی پڑیا باہر پھینک دی اور کوچوان کو بگھی ہانکنے کا اشارہ کیا۔ گھر پہنچا تو ایک صاحب کہنے لگے اللہ اکبر! ڈپٹی صاحب آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی! کون وقتوں سے آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔

دوسرے صاحب۔ بندے کا بھی ارادہ آج کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا بس آج کسی کی دال نہیں گلتی۔

لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں اندر ہی اندر دل میں خوش ہو رہا ہوں کہ بھلا ہے۔ خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔ (ابن الوقت)

مولوی نذیر احمد صاحب کسی کی تعریف یا توہین کرتے ہیں اس وقت ایسے برجستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اس شخص کے عیب و ہنر کا بعینہٖ نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اسی خوبی نے ان کے فن کردار نگاری کو زیادہ درخشاں و تاباں کر دیا ہے۔ ذیل کی دو مثالیں قابلِ تعریف ہیں۔

(۱) انگریزی دانوں کی مذہبی معلومات

نوجوان لڑکے جو کالج کے فارغ التحصیل فضیلت کے خطاب اور لیاقت کی سندیں لیکر درس گاہوں سے نکلتے ہیں۔ ان کو تمام ملکوں کی نئی اور پرانی تاریخیں خوب مستحضر ہوتی ہیں۔ جغرافیہ میں شاید ان کی معلومات اس درجہ کی ہو کہ سمندر کی مچھلی ہیں۔ یا پہاڑ کے کوّے یا افریقہ کے ریچھ یا آسٹریلیا کے لنگور یا امریکہ کے بن مانس یا تبت کے دنبے۔ یا تاتار کے مینڈھے یا عرب کے بدّو یا یورپ کے یا ہندوستان کے بھیل۔ وہ انگریزی میں شاید ایسی مہارت رکھتے ہوں کہ گویا اُنکی مادری زبان ہے۔ ریاضی میں وہ شاید بطلیموس ہوں۔ علم ہیئت میں وہ اپنے زمانہ کے فیثاغورث اور فلسفے میں افلاطون ہوں۔ غرض اُن میں علوم دنیا کی اس طرح جامعیت ہوگی کہ شاید اُن کا کوئی نظیر نہ ہو۔ مگر وہ نہ مذہب کے معتقد۔ نہ خدا کے بندے نہ رسول کی اُمت نہ بادشاہ کی رعیت نہ باپ کے بیٹے نہ بھائی کے بھائی۔ نہ دوست کے دوست نہ قوم کے ساتھی۔ نہ برادری کے شریک نہ وضع کے پابند۔ نہ رسم کے مقلد۔ (فسانۂ مبتلا)

(۲) اوائل عمر میں ابن الوقت کا مذہبی شغف

اٹھارویں برس کی عمر تک ابن الوقت کا یہ رنگ رہا جیسے کسی بڑے عابد متشرع کا ہوتا ہے۔ وہ نوافل و مستحبات کا اسقدر اہتمام رکھتا تھا کہ ایسا اہتمام فرض و واجب کا خدا ہم کو نصیب کرے۔ پانچوں وقت جامع مسجد کی اوّل جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد، اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد۔ صلوٰت التسبیح۔ منزل فیل۔ دلائل الخیرات حزب البحر اور خدا جانے کتنے اور وظائف پڑھتا۔ جمعہ کے دن کبھی اسکے گھر جانیکا اتفاق ہوا ہے تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایام بیض کے روزے داخل معمولات تھے۔ پھر مدت تک ترک حیوانات اور چلّہ کشی وغیرہ مذہبی ریاضتوں کی زحمت اُٹھاتا رہا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ وہ شاید شاہ صاحب سے بیعت کرنے والا ہے۔ پھر ایک زمانے میں اسکو ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرف میلان رہا۔ پھر جو سنبھالا تو غدر سے پہلے پادریوں کا ایسا گرویدہ رہا کہ شب و روز انہیں کیا تذکرہ کرتا۔ اور نوبل صاحب کی صحبت میں اس کے مذہبی خیالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ خود انگریزوں میں جا ملا۔ (ابن الوقت)

مندرجہ بالا کرداروں کے علاوہ مرأۃ العروس میں حسن آرا کا اور دیہات کی تعویذ گنڈے والی نانی کا کردار۔ توبۃ النصوح میں کلیم اور فطرت کا کردار۔ فسانہ مبتلا میں وکیل ناظر اور ہریالی کنجڑن کا کردار قابل تعریف ہے۔ ہریالی کی نشست و برخاست اور طرز گفتگو بھی قابل ستایش ہے۔ الغرض شمس العلما مولوی نذیر احمد کردار نگاروں کی صف اوّل میں جگہ پانے کے مستحق ہیں +

علی اختر حیدرآبادی

انوار

یہ حُسنِ بہاراں یہ لطافت گُلِ تر کی
نکھری ہوئی موجیں ہیں یہ ذوقِ نظر کی

کب آئی ترے ہجر کی شب کس نے بسر کی
سوچوں میں اسے جب کہ تمنا ہو سحر کی

اے دل وہ مآلِ غمِ پنہاں نظر آیا
ظلمت میں کرن پھوٹ رہی ہے وہ سحر کی

وہ سامنے ہیں اور انھیں ڈھونڈ رہا ہوں
یعنی مری آنکھوں کو تمنا ہے نظر کی

ہستی کا نگہباں ہے جنوں وہ تو یہ کہئے
تعمیر ہی کیا خاکِ سرِ راہگزر کی

دنیا سے تباہی کا گلہ کر تو رہا ہوں
مرضی نظر آتی ہے مگر اس میں اُدھر کی

بیخود ہے ہر اک روح ہر اک ذرہ ہے بیدار
یہ حُسن ہے اُن کا وہ لطافت ہے نظر کی

وحشت زدہ عشق کی منزل کو نہ پوچھو
صحرا میں ہوئی شام گلستاں میں سحر کی

دل میں کوئی حسرت ہے نہ ارمان مگر اب بھی
ہر آہ کے ہمراہ اُمیدیں ہیں اثر کی

بڑھتے ہی گئے اور حجابِ رُخِ ہستی
کیا بات ہے اے عقل تری شانِ خبر کی

آتا ہے یہ اب یاد کہ فرقت میں تمہاری
کیا شکل ہوئی تھی مرے اُجڑے ہوئے گھر کی

کیا شوق ہے کیا حُسن جنوں کیا ہے سکوں کیا
اللہ رے شوخی تری دزدیدہ نظر کی

اختر مرے سینے میں ہیں اسرارِ حقیقت
ہے مجھ سے بنا عقل کے آئینِ خبر کی

رامانند ساگر

جنگ کے باعث

دفتر سے لوٹتے ہی مجھے تار دکھایا گیا۔ ایف۔ آئی۔ میں فیل ہو جانے کے باعث میرا چھوٹا بھائی کشمیر سے بھاگ آیا تھا اور والد صاحب نے لکھا تھا کہ فوراً جموں پہنچ کر اسے راستہ ہی میں روک لو۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ آخری گاڑی جانے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں ایک تیز رفتار تانگے میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچا۔ صرف ایک منٹ رہ گیا تھا۔ میں بھاگتا ہوا بکنگ آفس تک گیا اور ایک نوٹ کھڑکی میں سے آگے بڑھا دیا — "ایک ٹکٹ جموں — جلدی کیجئے بابو جی!"
بکنگ کلرک نے نوٹ لوٹاتے ہوئے کہا۔ "آپ صرف تین گھنٹہ دیر سے آئے ہیں —"

"تو کیا گیارہ بجے پر گاڑی نہیں جاتی —؟"

"جی نہیں — اب صرف دو گاڑیاں جموں جاتی ہیں۔ جنگ کے باعث باقی سب بند ہو گئی ہیں۔"

مایوس ہو کر میں سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ اب کیا کیا جائے۔ مجھے جلد از جلد جموں پہنچ جانا چاہیئے۔ کیونکہ جو لاری کل صبح کشمیر سے چلی ہے وہ کل دو بجے سے پیشتر جموں پہنچ جائے گی — یہی سوچتا ہوا میں تانگہ میں بیٹھ گیا۔ اور پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے کسی بس سروس کی کوئی ٹرک رات کے وقت جموں مال لے جا رہی ہو میں تانگہ کو لاریوں کے مختلف اڈوں میں لئے پھرا۔ لیکن صبح سے پہلے جانے کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ اور پھر اس بات کا بھی کیا بھروسہ تھا کہ صبح لاریوں والے بروقت چل پڑیں گے۔ وہ لوگ تو محض ایک سواری کی کمی کے باعث مقررہ وقت سے گھنٹہ دو گھنٹہ کے تجاوز کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ لیکن اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ بہرحال جب "بس سروس" والوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ ان کی لاری ٹھیک چھ بجے صبح روانہ ہو جائے گی تو مجھے ایک گونہ اطمینان ہو گیا کیونکہ ہزاروں روپے کی اشتہار بازی کے زور سے وہ اپنی باقاعدگی اور بہترین لاریوں اور بہترین انتظام کے ذریعہ سے مسافروں کو غیر معمولی سہولتیں مہیا کرنے کا دعویٰ ایک مدت سے کرتے چلے آرہے تھے۔

صبح ساڑھے پانچ بجے جب میں اُن کے اڈے پر پہنچا تو ابھی کلینر لاری کے گیس پلانٹ میں سے بجھے ہوئے کوئلے نکال رہا تھا۔ نئے کوئلے بھرنے میں کوئی ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ اتنی دیر میں ان کا کلرک بھی آگیا۔ میں نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ بک کرائی اور قریب سے گزرتے ہوئے ہاکر سے اخبار خرید کر پڑھنے لگا۔ پہلی ہی خبر تھی کہ "مارشل ویول کو ہندوستان کا وائسرائے بنا دیا گیا۔" اور اس کے ساتھ ہی مختلف ہندوستانی لیڈروں کے بیانات۔ جن میں سے ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مارشل ویول کو ڈیفنس آف انڈیا وائسرائے کہنا چاہیئے۔ میں سوچنے لگا کہ جنگ کے ان دنوں میں اور پھر کانگریس کے تمام لیڈروں کی گرفتاری کے بعد ہندوستانیوں کو دانشمندانہ طور پر جنگی امداد کے کاموں میں لگائے رکھنے کے لئے برطانوی حکومت کے لئے اور چارہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ میں نے اچانک گھڑی جو دیکھی تو ساڑھے سات بج چکے تھے — دماغ سے تمام سیاست ہوا ہو گئی۔ آخر میرے لئے جلد از جلد جموں پہنچنے کے مقابلہ پر نئے وائسرائے کے تقرر کی اہمیت ہی کیا تھی۔ یوں بھی ابھی تک جنگ کم از کم پنجاب سے بہت دور تھی۔ چنانچہ ہماری محفلوں میں نئی آنے والی فلموں کے متعلق جتنی گرماگرمی سے بحث ہوتی تھی اتنی جاپان کے ارادوں۔ لنڈن پر شدید بمباری یا افریقہ میں آٹھویں فوج کی شاندار فتح کے متعلق کسی صورت میں نہ ہو سکتی تھی۔ آخر سارے جہاں کا درد ہمارے ہی دل میں کیوں ہو اور اس وقت اس مشہور و معروف "بس سروس" کی لاری کے پہیئے جو کسی بدنصیب کے قسمت کے چکر کی طرح حرکت کرنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ میری تمام تر توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ میں نے وہاں کھڑے ہوئے کلرک سے پوچھا۔ "تمہاری کمپنی تو اپنی باقاعدگی کا بہت ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہے لیکن ....."

"اجی آپ جانتے ہی ہیں —" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "کہ یہ بے قاعدگی محض جنگ کے باعث پیدا ہو گئی ہے اب گاڑیاں بند ہو جانے کے باعث لوگ لاریوں میں زیادہ سفر

کرنے لگ گئے ہیں "

"اسی لئے شاید آپ کو اب باقاعدگی کی ضرورت نہیں رہی ـــ"

وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور میں ذرا پرے ہٹ کر اس وسیع و عریض بورڈ کو دیکھنے لگا۔ جس پر پینٹ کئے ہوئے "بس سروس" کے بڑے بڑے الفاظ کم از کم ایک فرلانگ کے فاصلے سے صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ اور جن کے رنگوں کی خوبصورتی ایک چونا گچ قبر کی طرح اندرونی حقیقت پہ پردہ کئے ہوئے تھی۔

آخر گھنٹی بجی اور ڈرائیور چالان ہاتھ میں لئے ہوئے لاری میں داخل ہوا ایک جھٹکا لگا اور لاری سرکلر روڈ پر دوڑنے لگی۔

لاہور سے نکلتے ہی ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ لیکن چند میل جانے پر بارش زور پکڑ گئی کھڑکیوں پہ کینوس لٹکا دیا گیا۔ لیکن چند ہی منٹ کے بعد لاری کی چھت میں سے ہو کر پانی کے قطرے میرے کپڑوں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے بہتیرا ادھر ادھر ہو کر بچنے کی کوشش کی۔ لیکن بیسود۔ اس وقت شاید خدائی احکام میرے آڑے آ گئے اور بارش یکلخت تھم گئی لیکن بقول غالب اگر بارش ایک گھنٹہ برسے تو ہماری چھت تین گھنٹہ برسے پانی کے موٹے موٹے قطروں نے تھمنے کا نام نہ لیا سا ور اب تو وہ قطرے پہاڑوں سے مٹی بہا کر لانے والے دریاؤں کی مانند چھت پر پڑی ہوئی کوئلے کی بوریوں میں سے سیاہی کی اچھی خاصی مقدار میرے کپڑوں کو سیراب و گلدار کرنے کے لئے لا رہے تھے۔ بچاؤ کی کوئی اور صورت نہ دیکھ کر ڈرائیور نے مجھے درمیانہ سیٹوں پر چلے جانے کو کہا۔

درمیانہ سیٹ پر دو مرد اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک عورت پکی عمر کی تھی۔ دوسری کی عمر کے متعلق صحیح اندازہ لگانا کچھ مشکل سا تھا۔ یوں تو وہ پندرہ سولہ سال کی دکھائی دیتی تھی لیکن اس کی قسم ان عورتوں کی سی تھی جن کے بدن میں پچیس تیس سال کی عمر تک ایک شباب نما کساؤ اور جلد میں ایک گل اندامانہ شگفتگی رہتی ہے کچھ وہ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے متعلق میں یہ اندازہ بھی نہ کر سکا کہ یہ ان دونوں میں سے کس کی بیوی یا لڑکی ہے؟

دوسری عورت دوپٹے کو سر سے میں لپٹے ہوئے ہاتھ سے اپنے چہرے کا نچلا آدھا حصہ ڈھانپے شکرے کی سی تیز نظروں سے میری آنکھوں کی ہر حرکت بلکہ شاید میری آنکھوں سے عیاں ہونے والے ہر جذبہ کو تاڑ رہی تھی۔ میں نے سینڈل میں سے پیر نکال کر اس کے انگوٹھے سے دوسرے پاؤں کو کھجانے کی کوشش کی تو میں نے دیکھا کہ اتنی سی حرکت بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ مجھے اس عورت سے ڈر لگنے لگا۔ یہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی آنکھیں کسی افسانوی دیو کی آنکھوں کی طرح اتنی وسیع ہوتی ہیں کہ ان میں محلے کے محلے سما جاتے ہیں اور محلے کے کسی بھی پوشیدہ اور تاریک ترین مقام پر کی گئی کوئی بھی بات ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ نوجوان محبوبوں کی سب سے بڑی دشمن اسی قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ سماج جیسی موہوم ہستی کو تو لوگ خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں اور اس وقت وہ عقابی نظریں مجھ پر کچھ اس طرح حاوی تھیں گویا کہہ رہی ہوں کہ "دیکھ تو سہی تو اس لڑکی کی طرف ـــ" لیکن میں نے کئی مرتبہ اپنی بے بس نگاہوں کے ذریعہ اسے سمجھانے کی کوشش کرنی چاہی کہ حسن راہگزر سے اگر کوئی راہ و رسم پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو تو اہل نظر کے لئے شیوۂ حسن پرستی کے مطابق آنکھوں ہی آنکھوں میں حظ اٹھانا کچھ گناہ نہیں اور پھر ایسا بصیرت افروز حسن روز روز کہاں ـــ" لیکن اتنی ہمت نہ پڑی۔ میں ان دو آدمیوں کی باتیں سننے لگا۔ باہر بوندا باندی پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ شمال کی جانب سے ایک کالی گھٹا ٹڈیوں کی فوج کی طرح بڑھی چلی آ رہی تھی۔

چیک کوٹ پہنے ہوئے شخص نے پوچھا۔

" وہ آپ کے ماموں زاد بھائی جو تھے۔ وہ جنہیں آپ نے ایک مرتبہ میرے پاس ملازمت کے لئے بھیجا تھا۔ وہ کہاں ہیں آج کل؟"

دوسرے آدمی نے محض گھٹیا سے کالے ملیشیا کی ایک نکر اور ایک آدھے بازوؤں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے اپنی چپلی میں سے پاؤں باہر نکال کر ٹخنے کے قریب کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

" وہ پچھلے مہینہ سکنڈ لفٹیننٹ بھرتی ہو کر فوج میں چلے گئے "

"چلو بیکاری سے تو نجات پا گئے۔"

"اور شاید زندگی سے بھی۔" اس نے پھر چپلی میں پاؤں اڑاتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کے جواب سے ہنسی آ گئی۔ اتنے میں پہلے صاحب نے پھر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اب کچھ اچھے پیسے مل جاتے ہیں؟"

"جی اچھے کیا ملیں گے۔ بس کسی طرح زندہ رہنے کی سبیل ہے۔ اب جنگ کے باعث پندرہ روپے مہنگائی الاؤنس بھی ملتا ہے۔ چنانچہ کل ملا کر ساٹھ ایک روپے بن جاتے ہیں "

میں سوچنے لگا کہ آج کل جبکہ ماہرینِ اقتصادیات کی ملکے میں

ہنگائی کا یہ عالم ہے کہ روپے کی قیمت قبل از جنگ کے معیار کے مطابق چالیس فیصدی رہ گئی ہے۔ یہ شخص ساٹھ روپے میں کس طرح گزر بسر کرتا ہوگا۔ اور پھر یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایک سچے ہندوستانی کی طرح پندرہ سولہ سال کی عمر ہی سے اس کے یہاں بچے پیدا ہونے شروع ہو چکے ہوں گے اور پھر جنگ کے باعث دلوں میں جو پریشانی سی پیدا ہو گئی ہے اس سے پناہ لینے کے لئے ہندوستانیوں کے پاس جنسی رغبت بڑھانے کا جو طریقہ ہے اس کے باعث اب تو اس کے ہاں بچوں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو چکا ہوگا۔ چنانچہ کچھ بعید نہیں کہ میاں بیوی رات کو خالی پیٹ ہی سوتے ہوں۔ اور اس کے مقابلہ پر اگر اس کا ماموں زاد بھائی کمیشن لیکر فوج میں چلا گیا ہے تو وہ آسے جان بوجھ کر موت کے قریب جانے پر طعنے دے رہا ہے۔ جیسے خود اُسے ابھی سیکڑوں سال اور جینے کا یقین ہو۔ مجھے اس بات پر افسوس ہونے لگا کہ عام ہندوستانیوں میں اتنی جرات کیوں نہیں کہ وہ زندگی کو داؤ پر لگا کر جوا کھیل سکیں تاکہ جب تک جیتتے رہیں زندگی کا نام عیش و کامرانی ہو اور اس کھیل میں ہار جائیں تو موت سے ہمکنار ہو جائیں۔ موت بھی وہ ــــ جس سے اس جوئے کے بغیر بھی کہیں پناہ نہیں۔ اس کا ماموں زاد بھائی یقیناً خوب موقع شناس تھا، اسے جب موت آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو وہ ایک کمیشنڈ آفیسر تھا اور پانچسو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ اور پھر موت بھی کیا یونہی آجائے گی جب آتی ہے تب تو گھر میں بیٹھ کر بھی اس سے پناہ نہ مل سکے گی۔ چنانچہ ایسے موقع کو چھوڑتا کیوں؟ ــــ اتنا اچھا موقع بھی تو جنگ ہی کے باعث ہے۔ ورنہ یوں ہمیشہ ہی زندگی کا جُوا بھی اتنے بڑے منافع پر نہیں کھیلا جا سکتا۔

اتنے میں ایک لینڈ و باڈی کار کیچڑ کے چھینٹے اُڑاتی ہوئی لاری کے پاس سے آگے نکل گئی۔ اس کے ہارن کی لمبی سی آواز دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔ کلرک نے اپنی پھسلی ہوئی عینک کو ناک کے بانسے پر جماتے ہوئے کار کی پچھلی نمبر پلیٹ کو غور سے پڑھا اور پھر دوسرے صاحب کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"دیکھی آپ نے یہ کار ــــ؟ رائے بہادر چھجو رام کھنہ جا رہے ہیں ــــ!"

دوسرے صاحب نے اپنی سیٹ سے تھوڑا سا اٹھ کر دور ہوتی ہوئی کار کو دیکھا اور "ہوں" کہہ کر پھر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔

"دیکھیے جاں، ہینگ کی ایک پٹی بندھی ہوئی ہے۔ شاید سیر کی غرض سے پہاڑ پر جا رہے ہیں۔"

کلرک نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کار کے پیچھے بندھی ہوئی پیٹی کو عینک کے پیچھے سے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"اب تو یہ بھی شاید اٹھائیس روپے کی بوتل آنے لگی ہے۔ کہاں جنگ سے پہلے کا وقت جب سات آٹھ روپے میں بڑھیا سے بڑھیا وسکی مل سکتی تھی۔ اتنا ہی نہیں جنگ کے باعث کئی ضروری چیزیں تو ملتی ہی نہیں۔ دس پندرہ روز کی بات ہے کہ میں نے شمپین کی ایک بوتل حاصل کرنے کے لئے اتنی کوشش کی لیکن کہیں سے نہ مل سکی۔"

"جی ہاں۔ جنگ نے تو چیزوں کو آگ لگا دی ہے" کلرک پیشہ صاحب بولے۔ "دیکھیے کہاں آٹا دو روپے من آتا تھا۔ اور آج کل چودہ روپے من آتا ہے۔ غریب آدمی کے لئے تو بھوکوں مرنے کے سوا جیسے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ اناج کا یہ عالم ہے اور کپڑا تو بس ــــ غضب ہی ہو گیا ہے۔ میرے پاس اب دو قمیصیں اور دو نکریں رہ گئی ہیں۔ گرمیاں ہیں تو گزر ہو رہی ہے۔ سردیاں آئیں گی تو جانے گھاس لپیٹ کر باہر نکلنا پڑے۔ سنتے ہیں حکومت نے کپڑے اور سوت کا سٹہ بند کرا دیا ہے جس سے قیمتیں گر رہی ہیں۔"

ان کی بات کا پہلا حصہ تو دوسرے صاحب نے نہایت بیزاری کے عالم میں سُنا۔ ان کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔ "کیا آٹے کے متعلق بکواس شروع کر دی۔ میں نے سولہ بوری گندم اندر رکھی ہوئی ہے۔ شراب کی مہنگائی کا تمہیں علم ہی کیا ہے؟" لیکن جب اس نے کپڑے اور سوت کے متعلق ذکر چھیڑا تو فوراً چمک کر بولے۔ "جنگ کیا چھڑی ہے کہ بس حکومت کی بن آئی ہے۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت نت نئے قانون بنا دیا ہے اور غور کیجئے تو جو بھی قانون بنتا ہے اس کا اثر غریبوں پر پڑتا ہے۔ حکومت نے کپڑے اور سوت کی قیمتوں پر تو کنٹرول کر لیا لیکن لکڑی اور لوہے کی قیمتوں کی طرف کیوں دھیان نہیں دیا۔ جو اتنی بڑھ گئیں کہ ہم آپ اس کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ لکڑی جنگل سے مل جاتی ہے اور لوہا کانوں سے ــــ اور اسی رائے بہادر چھجو رام کی قسم کے لوگ ان چیزوں کے بیوپار کے باعث آج لکھ پتی بنے پھر رہے ہیں۔ ورنہ اس کی اوقات جو ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ جنگ سے پہلے پچاس روپے کا منشی تھا۔ سٹے میں کہیں چار پانچ سو کا داؤ لگ گیا۔ بس تب سے بیوپاری بن بیٹھا ہے۔

اور آج جنگ کے طفیل لکھپتی بن گیا ہے۔ حکومت اس طرف تو دھیان نہیں دیتی اور کر دیا ہے کپڑے پر کنٹرول۔ تاکہ مجھ سے غریب بیوپاری بیچارے مارے جائیں ـــــ اچھا بھئی! تم ہی فیصلہ کرو۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں چالیس روپے ماہوار کا ملازم تھا۔ گزشتہ سال سٹے میں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ کمائے۔ مارکیٹ میں ساکھ قائم کی۔ اسی ساکھ کے بھروسے اتنا مال اکٹھا کر رکھا تھا۔ کہ اس نئے آرڈی نینس کے باعث پون لاکھ گھاٹے کے پھیر میں ہوں۔ اب تم ہی بولو یہ بے انصافی نہیں تو کیا ہے؟ مجھ سے کتنے ہی غریب آدمیوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہو گی۔

اس وقت تک بارش نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ اور اب درمیانہ سیٹوں پر بھی چھت سے ٹپکنے والے قطروں کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ انہی قطروں سے بچ بچاؤ کی کوششوں میں میری انگلیاں ایک دو مرتبہ اس نوجوان عورت کے مخملی جسم کے کسی نہ کسی حصہ سے چھو گئی تھیں۔ لیکن اتنا سا غیر ارادی لمس بھی دوسری عورت کی تنکے کی سی تیز نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکا تھا اور مجھے دونوں مرتبہ سر سے لیکر پاؤں تک ایک جھرجھری سی آ گئی تھی۔ اس لمس کے باعث یا ان عقابی نظروں کے خوف سے۔ اس کے متعلق میں کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ اسی دوسری عورت کے خوف سے میں چاہنے پر بھی اس حسینہ کی طرف جی بھر کر نہ دیکھ سکا تھا۔ اور اس تشنہ تکمیل ذوق کے باعث میرے دل و دماغ میں ایک عجیب طرح کی جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

بہرحال ہمیں تھوڑی ہی دیر میں مجبوراً درمیانہ سیٹیں بھی خالی کرنی پڑیں اور ہم پانچوں کے پانچوں لاری کے پچھلے حصہ میں چلے گئے وہاں پہلے ہی دیہاتی قسم کے آدمی ڈربے میں بند مرغیوں کی طرح ایک کے ایک اوپر لدے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو وہاں بہت تکلیف ہوئی ڈرائیور کو اور اس کے ذریعہ "بس سروس" کے مالکان کو بہت کچھ کھری کھری سنائیں۔ لیکن اس بیچارے نے ان سب کے جواب میں نہایت معصومیت سے محض اتنا کہا۔

"جناب کیا کیا جائے۔ جنگ کے باعث ٹین بہت مہنگی ملتی ہے۔ اب کون نئی ٹین چھات پر لگوائے۔ ٹوٹی ہوئی ٹین کے باعث آپ کو یہ تکلیف ہو رہی ہے۔"

ان دونوں اصحاب نے وہاں آکر بھی اپنی گفتگو جاری رکھی۔ دراصل وہی صاحب اپنے ساتھی کو اب مفصل طور پر اپنی گزشتہ سال کی کامیابی کی داستان سنا رہے تھے۔ جیسے ختم کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"اب دوست میری ہمت پر عش عش کر رہے ہیں کہ کس طرح میں نے صرف چھ ماہ میں بغیر کسی خاص تردد کے روئی اور سوت کے سٹے میں کم از کم ساٹھ ہزار روپیہ کمایا۔ اگر اس مرتبہ یہ آرڈی نینس ..."

اس سے آگے میں کچھ نہ سن سکا۔ میری نگاہیں سامنے کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے دیہاتیوں کی طرف منتقل ہو گئیں۔ جن کی دھوپ سے سیاہ ہو گئی ہوئی پشتوں پر صدیوں کی مشقت و محنت کا بوجھ لدا ہوا تھا میں سوچنے لگا کہ کتنا فرق ہے ـــــ! اس شخص نے صرف چھ مہینوں میں اور کسی خاص تردد کے بغیر ساٹھ ہزار روپے کما لئے اور ادھر یہ لوگ ہیں جو جانے کتنی صدیوں سے کڑاکے کے جاڑوں اور جون کی جھلسا دینے والی دھوپوں میں سر کا پسینہ ایڑی تک بہاتے ہوئے محنت کرتے آ رہے ہیں لیکن انھیں کئی صدیوں کے بعد بھی یہ یقین یا اعتماد حاصل نہیں ہو سکا کہ انھیں دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا رہے گا۔ اور پہننے کے لئے اس پھٹے ہوئے گاڑھے کے سوا انھیں آج تک اور کچھ میسر نہیں آ سکا ـــــ اور کبھی کبھی تو وہ بھی ۔۔۔۔۔۔

وہ لوگ بھی اپنی گفتگو میں مشغول تھے۔

"سنا ہے چوہدری پورب کی طرف کہیں بنگال میں قحط پڑا ہوا ہے۔"

"ارے ہواں تو پڑنا ہی تھا ـــــ جنگ جو چھڑی دہی ہے برکھا کیسے ہو ۔۔۔۔"

کہیں قریب سے کوئی لونڈا بول اٹھا۔ "لیکن اپنے ہاں تو ابکے کھوب پھسل ہوا ہے ـــ"

"اپنی بھلی کہی۔ ارے ہیاں تو نہریں ہیں۔ تو کھیتی کو پانی مل جاوے۔ ہواں تو برکھا ہو جب پھسل ہو۔ نا ہو تو نا ہو ـــ"

"پر چوہدری برکھا کو کیا ہوا ہے ـــ"

"ابے اتنا بھی نا جانے ـــ یہ جو بادل ہووے ہیں اندر دیوتا کے حکم سے یہ سمندر میں پانی پینے جاویں۔ اب پہلے ہی دن ریڈیو پر سنا تو تھا کہ سمندر میں جہازوں کی لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ اب بول بادل کہاں سے پانی لاویں۔"

"ریڈیو کی بھی بھلی کہی ـــ" وہی لونڈا پھر بول اٹھا۔ "جمّن کہہ رہا تھا کہ یہ ریڈیو والے اور اخباروں والے جو جی آوے جھوٹ سچ لکھ ماریں یا جس کسی سے کوئی بات سنی وہی لکھ دی۔ ماس روز

وہ شیتو کے گھر ایک مہمان آیا تھا نا ــــ اُس نے جنگ کی بڑی نئی خبریں سُنائیں ــــ"

اس کے چاروں ساتھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ اور وہ سنانے لگا ۔

" کہو رہے تھا کہ ایک دن جرمن روس کے مکان میں گھس گیا ۔ روس نے اوپر کی منزل میں جا کر دروازے کو کنڈی چڑھا دی ۔ اب جرمن نچلی منزل میں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے انگریز آ گیا ۔ جھٹ سے جرمن نے بھی دروازہ اندر سے بند کر لیا "

" سب گلت ہے " ایک ساتھی نے مذاق کرتے ہوئے کہا ۔ ان کی پھوجیں کیا مر گئی تھیں ــــ"

" ارے تو نہیں سمجھتا ۔ مر نہیں گئی تھیں ۔ پر نچلے جہاں مالک آپ آ جائیں وہاں بھلا نوکر کیا بولیں گے " اس کے ساتھی نے مذاق میں اڑانے کی کوشش کی ۔ لیکن یہ اپنی بات کے حق میں دلیلیں دینے لگا ۔ " اب بھلا جمیندار صاحب بیٹھے وے ہوں ۔ پھر تیا بھلا تو ان کے روبرو بول سکے گا ۔ ابھی تو بچہ ہے ۔ ان باتوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ "

پرے کونے میں ایک نوجوان دیہاتن گٹھڑی بنی بیٹھی تھی ــــ کچھ بیمار معلوم ہوتی تھی ۔ حسن کے کھنڈر اس کے شاندار ماضی کا پتہ بتا رہے تھے ۔ مجھے خواہ مخواہ اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ اس کے ساتھ شاید اس کا بھائی یا خاوند بیٹھا تھا ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ۔ ۔ ۔

" اسے کوئی بیماری ہے کیا ــــ؟ "

" جی ۔ چھ ماہ سے بیمار ہے " اس نے جواب دیا ۔

" اس کا علاج کوئی نہیں کرواتے ؟ " میں نے پھر پوچھا ۔

" علاج کروانے ہی تو لاہور گئے تھے ۔ بڑے ہسپتال میں "

" تو کیا کہا ڈاکٹر نے ــــ ؟ "

" جی اس نے دوا لکھ دی "

" ہسپتال کی ڈسپنسری سے کیوں نہ دلا دی ؟ " میں نے کہا ۔

" کہنے لگے کہ جنگ کی وجہ سے ہسپتال کی دوائیں ختم ہو گئی ہیں ۔ بازار سے مول لے لینا "

" تو لائیے بازار سے ؟ "

" ابھی کہاں ۔ ابھی تو اناج سارا اندر دھرا پڑا ہے ۔ کہیں اسے بیچ لوں تو لے آؤں گا دوا بھی ــــ"

" تو پھر بیچتے کیوں نہیں ۔ آج کل تو گندم کا بھاؤ چڑھا ہوا ہے "

" ہمارے گاؤں والے نہیں بیچتے ــــ وہاں وہ آیا تھا چوہدری نگارام ۔ وہ جو وزیر ہے وہ لیکچر دے گیا ہے کہ ابھی اناج نہ بیچو ۔ شہر والے تم پر ظلم کرتے ہیں انھیں بھوکا مرنے دو "

" تو پھر ــــ ؟ " مجھے اس کی افسوسناک داستان کے باوجود اس بات پر ہنسی آ رہی تھی ۔

" اجی سب بکواس ہے ۔ میں خود لاہور میں دیکھ کر آیا ہوں ۔ لوگ اسی طرح عیش کر رہے ہیں ۔ ہوٹلوں میں بے شمار روٹیاں پک رہی تھیں ۔ سب ہمیں دھوکہ دیتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اب ہمیں گھاٹا رہے گا "

میری نگاہیں پھر کونے میں بیٹھی ہوئی بیمار عورت کی طرف اُٹھ گئیں ۔ لیکن میں اس کی افسوسناک حالت کے متعلق بہت دیر تک کچھ سوچ نہ سکا ۔ کیونکہ کوشش کرنے کے باوجود میری نظریں درمیانہ نشست والی نوجوان حسینہ کی طرف رُخ کرنے سے باز نہ آ سکیں ۔ دوسری عورت جونک کی طرح اس کے ساتھ چمٹی بیٹھی تھی ۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے باوجود آگے بڑھتے جانے والے دلاور سپاہی کی طرح میں اُن عقابی نگاہوں کی تاڑ کے باوجود اس حسینہ کو دیکھتا ہی چلا گیا ۔ اور جانے کب تک دیکھتا رہتا کہ اچانک ایک دھچکا سا لگا ۔ اور لاری ٹھہر گئی ۔

اب تک ہم محض تیس میل کا سفر کر پائے تھے ۔ اس دوران میں بھی لاری کوئی تین چار مرتبہ دس دس بارہ بارہ منٹ کے لئے رکی تھی ۔ لیکن انجن کا کوئی ایک آدھ پیچ کس دینے سے وہ پھر چل پڑتی تھی ۔ مگر اب کے تو ایسی رکی کہ اس نے پھر چلنے کا نام ہی نہ لیا ۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی میری بیچینی بڑھتی جا رہی تھی ۔ مجھے لاری کی تمام دلچسپیاں بھول گئیں مجھے رہ رہ کر خیال آنے لگا کہ اب میں بروقت جموں نہیں پہنچ سکتا ۔ اور بھائی کو نہ پا سکونگا ادھر ڈرائیور دوسری سواریوں کو بتا رہا تھا کہ ــــ " لاری کا ڈائنمو بہت خراب ہو چکا ہے " اور اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ یونیورسل بھی شاید اسی سفر میں ٹوٹ جائے گا ۔

بارش ختم چکی تھی ۔ میں اپنی بڑھتی ہوئی بیچینی سے بچنے کے لئے اپنے دماغ کو ڈرائیور کے ساتھ باتوں میں مشغول کرنے کی کوشش کرنے لگا ۔

" اس کا مطلب ہے لاری کے کئی حصے مرمت طلب ہیں ۔ تو ایک دفعہ ساری ٹھیک کیوں نہیں کرا لیتے ؟ " میں نے کہا ۔

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا کہنے لگا ۔

"ذرا وقت تو دیکھئے کیسا نازک ہے۔ جن چیزوں پر پہلے صرف سو روپیہ خرچ آتا۔ آج اتنی ہی مرمت پر کم از کم چار سو روپے لگیں گے۔ جنگ نے تو کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔ لاریوں والے کیا کریں ——؟"

پھر میں نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد پوچھا۔

"دن بھر میں جموں کا ایک واپسی چکر تو لگا لیتے ہوں گے؟"

"جی ہاں —— ہر روز۔"

"ایک چکر میں بچتا کیا ہو گا؟"

"یہی کوئی ——" وہ حساب کرتا ہوا بڑبڑانے لگا: "خرچ وخرچ نکال کر کوئی چالیس ایک روپے بچ جاتے ہوں گے۔"

میں حساب کرنے لگا کہ لاری کے مالکوں کی ماہوار آمدنی کتنے ہزار ہو گی؟ اور کیا وہ بیچارے اتنی قلیل آمدنی میں سے مرمت کے اخراجات برداشت بھی کر سکتے ہیں جو جنگ کے باعث اتنے زیادہ ہو گئے ہیں؟

ان خیالات میں بھی میں بہت دیر الجھا نہ رہ سکا۔ ایک پرزہ نیا ڈالے بغیر اب لاری چل نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ ڈرائیور کسی آتی جاتی لاری میں لاہور جانے کی صلاح کر رہا تھا۔ مجھے اب خیال آ رہا تھا کہ جموں سے شام کو جو ٹرین چلتی ہے میں کم از کم اس سے قبل تو وہاں پہنچ جاؤں۔ تاکہ چھوٹا بھائی اس میں نہ جا سکے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس کے پاس کافی پیسے نہیں۔ چنانچہ وہ ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرے گا۔ اور ایک دفعہ وہ ٹرین میں سوار ہو گیا پھر سارا ہندوستان اس کی بادیہ پیمائی کے لئے کھلا پڑا ہے۔ ڈرائیور نے مجھے یقین دلایا کہ اگر آپ چھ بجے شام بھی یہاں سے چلیں تو آپ کو گاڑی چھوٹنے سے پہلے پہنچا دوں گا۔"

"لیکن گاڑی تو چھ بجے ہی وہاں سے چھوٹتی ہے۔" میں نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر روز باقاعدگی سے وہ گاڑی تین گھنٹے لیٹ چلتی ہے۔"

"تین گھنٹے لیٹ ——؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اجی حیران ہونے کی اس میں کون سی بات ہے؟ آج کل جنگ کے باعث اگر فرنٹیر میل چار چار گھنٹے لیٹ چل سکتی ہے تو اس معمولی پسنجر گاڑی کا کیا ہے۔"

اور جب میں نے اسے کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا: "صاحب سکر چھیک لاریوں کے باعث آپ اپنی منزل مقصود پہ پہنچ تو جاتے ہیں۔"

اس نے حسب وعدہ مجھے رات کے ٹھیک پونے نو بجے جموں سٹیشن پر پہنچا دیا۔ میں بھاگا بھاگا اندر گیا۔ پتہ چلا کہ گاڑی ٹھیک چھ بجے چھوٹ گئی تھی۔

میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ بھائی اب ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ جنگ کے باعث ہوا۔

اس رات میں سٹیشن کے مسافر خانے میں پڑا پڑا سوچتا رہا کہ جب جنگ کے باعث اتنی بے قاعدگیاں ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہر روز باقاعدگی سے تین گھنٹے لیٹ چلنے والی ٹرین وقت مقررہ پر چھوٹنے کی "بے قاعدگی" کر سکتی ہے۔ تو کیا کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں ہو سکتا کہ لاری میں بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر والی عورت کی قسم کی تمام عورتیں جن کی عقابی نگاہوں سے نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی کوئی معمولی سی حرکت بھی پوشیدہ نہ رہ سکتی ہو۔ ان سب کی آنکھیں کم از کم جنگ کے عرصہ تک کے لئے نکلوا دی جائیں یا پھر کسی آرڈیننس کے ماتحت تمام لاریوں کے فرنٹ سیٹوں کے منہ پچھلی جانب پھیر دیئے جائیں۔

میں ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا ——!

عزیز حاصل پوری

قطعہ تاریخ سالنامہ عالمگیر ۱۹۴۴ء

ارباب ادب اس کو رکھنے لگے آنکھوں پر ۔۔۔ مقبول ہوا ایسا ہے آج یہ عالمگیر

سالانہ ادب پارہ دیکھا تو کہا سب نے ۔۔۔ "سرتاج جریدوں کا ہے آج یہ عالمگیر"

۱۹۴۴ء

محوی صدیقی لکھنوی

خود شناسی

مجھے بھی یاد ہے وہ عرصۂ گیتی کا نظارا
نہ کوئی انجمن تھی اور نہ کوئی انجمن آرا

جو چمکا میں تو ایسا جگمگا اٹھا یہ کاشانہ
بجھی ہر شمعِ روشن چھپ گیا دھندلا سا ہر تارا

مقابل میں مرے آتا کوئی یہ کس کی طاقت تھی
کہ میں مہرِ جہانتاب اور زمیں چھوٹا سا سیارا

قدم میں نے یہاں رکھا تو کچھ اس شان سے رکھا
مرے زیرِ نگیں تھا یہ جہانِ زندگی سارا

جو میں نے آنکھ کھولی جھک گئے سر سب کے سجدوں میں
کسی نے دم نہ مارا جب گرج کر میں نے للکارا

نہنگ و ضیغم و اژدر کی ہستی کیا مرے آگے
جسے چاہا اُسے بڑھ کر زمیں پر میں نے دے مارا

ہمالہ ہو کہ وہ البرز ہو یا قاف یہ کیا ہیں
مری رفعت کے آگے کہہ اٹھا ہر ایک "میں ہارا"

یہ مریخ و زحل رفندے ہوئے سارے اسی کے ہیں
مری فکرِ رسا سے ہر کا بی کا کسے یارا

بدل ڈالا ہے رُخ دونوں کا میرے زورِ بازو نے
وہ ہو بڑھتی ہوئی آندھی کہ ہو بہتا ہوا دھارا

مری ہی اک نگاہِ نکتہ پرور کا کرشمہ ہے
کہ یہ ویرانۂ عالم گلستاں بن گیا سارا

جھکا دیں سرکشوں کی گردنیں یوں اپنی حکمت سے
کہ آہن موم تو مرمر تھا میرے ہاتھ میں خارا

فرشتوں کی بھی پر جلنے لگیں جس تک پہنچنے میں
اُس آتش خانۂ قدسی کا میں ہوں ایک انگارا

نفسیاتی افسانہ

پرتھوی ناتھ شرما

تنہا!

تنہا ایک آدمی۔ اُس کا من درپن میلا نہ تھا۔ کیونکہ اُس نے ساری عمر بچوں کی طرح گزارنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اور وہ ایک گنجان گھٹے گھٹے قیدخانے سے مشابہ شہر کا باشندہ تھا۔ اس شہر میں مکانوں کی کھڑکیوں پر پردے ٹانگنے کا رواج نہ تھا۔ اس لئے اُن کھڑکیوں پر نسوانی چہروں کے دن کے ہر وقت منڈلانے کے باوجود سڑک پر چلتے چلتے اس کی نگاہ اوپر کی جانب اُٹھتی نہ تھی اور اُٹھتی بھی کیسے؟ جب وہ نیلے آسمان کی جانب بہت کم نگاہ اُٹھا کر دیکھتا تھا تو اُن کھڑکیوں کی طرف کیوں آنکھیں پھاڑتے کیونکہ اس شہر میں چوری چھپے لڑکیوں سے ملنے اور ان سے دلوں کے استفادہ کرانے کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ لہٰذا پھولوں کی اس فراوانی میں گلچیں بننے کا خبط قطعی ناممکن تھا ممکن ہے یہ اسکا خیالی شبہ ہو جو حقیقت میں گھسنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

وہ تھا ایک سکول کا طالب علم جسے اپنے بھولے بچپن میں سوا اس کے کچھ نہ سوجھتا تھا کہ وہ سدا بچہ ہی رہے گا۔ اُسے صرف کپڑے لتے اور کھانے پینے کی فکر تھی۔ اگر یہ اشیا اُسے مہیا ہو جائیں تو وہ اخلاقی کتابیں پڑھتا اور لمبی تان کر سو رہتا۔ کبھی کبھی اُسے چندا ماموں اور ننگے بناؤ ستر (کپڑے) آسمان کا خیال آتا اور وہ وسیع آسمان کو کپڑے پہنانے کے لئے اپنی ماں کے ٹرنک میں گھس جاتا۔ لیکن وہاں اُسے پانچ گز کی دھوتیوں، پیٹی کوٹوں اور بلاؤز جمپروں کے سوا کچھ نہ ملتا تھا۔ وہ مایوس ہو کر چندا ماموں اور ننگے آسمان کی وسعت (بنا پٹے۔) دیشا پر ننھے ننھے موتیوں ایسے آنسو بہانے لگتا۔ لو بھلا اب تو کپڑے پہنیں اور چندا ماموں ننگے، یہ بہت بری بات ہے۔ لہٰذا ماموں کے ساتھ اتنا ظلم روا رکھنا کہاں کی انسانیت ہے؟

وہ فضول آسمان میں اپنا ہنڈا روشن کرتے ہیں۔ جیتوں پہ چاندنی بکھیرتے ہیں۔ بہت گھومنے والی عورتوں کو تنگ کرتے ہیں۔ بادلوں میں چھپ جاتے ہیں تو کبھی گھنی بیل کی ٹہنیوں کے پیچھے آنکھ مچولی کھیلنے پر آتر آتے ہیں چندا ماموں تو رہتے۔ چندا ماموں آئیں گے دودھ ملائی لائیں گے چندا ماموں کی آنکھ میں پھولا۔ نہیں جی عورت بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ چندا ماموں کی ماں بے چاری ست جگ سے چرخہ کات رہی ہے۔ نامعلوم کتنے لاکھوں کروڑوں، پدم، سنکھ، مہا سنکھ گز کپڑا کا تنا پڑیگا جب جاکر وہ اپنے بیٹے کا تن ڈھانپ سکے گی۔ یہ بڑھیا کبھی تھکتی نہیں۔ بیچاری دن رات سوت کاتتی رہتی ہے۔ اُس کے ہاتھ نہیں تھکتے کیا۔ تھوڑی بہت دیر تو ضرور سوتی ہوگی دو چار منٹ صرف ستانے کے لئے۔ آخر اسے کتنے ہی مہا سنکھ گز سوت کا تنا ہے۔ ارب، کھرب، پدم، مہا پدم، سنکھ، مہا سنکھ۔ اُس نے اپنے پہاڑے کی کتاب میں بیس بندیاں گنی تھیں۔ جب جاکر وہ مہا سنکھ پر پہنچا تھا۔ وہ اپنی دادی سے اکثر پوچھا کرتا تھا "بتاؤ دادی اماں سب سے زیادہ کتنے ہوتے ہیں"۔ دادی جان پوپلے منہ سے جواب دیتیں "ہزار، لاکھ"۔ "بس، اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار، لاکھ یہ تو پانچ ہی بندیاں ہوئیں۔ سنو۔ ارب کھرب۔ سنکھ مہا سنکھ۔ کل بیس بندیاں۔ تم کیا جانو بیس بندیاں۔ چندا ماموں کی ماں اتنا سوت کاتیگی جب جاکر چندا ماموں کا تن ڈھکا سکیگی۔ بیچارے ابھی تو ننگے ننگے بچوں کی طرح ہی آسمان میں پھرتے ہیں۔ "چندا ماموں ننگے"۔ دادی پوپلے منہ کو پھاڑ کر نیم مسکراہٹ میں ڈوب جاتیں۔

"چندا ماموں کیوں ننگے ہیں دادی؟" وہ دریافت کرتا۔ "کیا معلوم (شاید پوپلے منہ سے نامعلوم نکلتا ہے) تو وہ دن

کا چھوٹا یا بڑا ہو کر کیا کرے گا کہانی۔ اچھا سناؤں گی جب تو اپنے باپ کے برابر ہو جائے گا۔"

"اچھا!" خاموشی کے علاوہ اس بے چارے کے پاس علاج ہی کیا تھا۔ دادی کے بعد اس نے ماں سے پوچھنا شروع کیا۔ ماں نے بھی دھتا بتایا۔

اور اس بات کو کس سے پوچھے۔ اسے چندا ماموں کا برہنہ جسم دیکھ کر یاد آ جاتی۔ وہ ایک عجیب ذہنی کوفت میں مبتلا ہو جاتا۔ آخر کب تک چندا ماموں ننگے رہینگے۔ کب تک . . .

پہلے وہ راتوں کو سوتے وقت ہی سوچتا تھا۔ جوں جوں اسکا دماغ اس بے انصافی کی جانب زیادہ راغب ہوتا گیا۔ اس کے سوچنے کی شدت بھی بڑھتی گئی۔ وہ رات ہی کو نہیں۔ تقریباً سارے خالی وقت سوچنے لگا۔ کھیل میں دل نہ لگتا۔ اپنے ہم جماعتوں سے گفتگو کرنے میں دلچسپی نہ رہی۔ اس کا دماغ تقریباً چوبیس گھنٹے پھوکنی کی مانند دائرے کاٹنے لگا۔ وہ اکثر دیواروں کی اوٹ میں کھڑا ہو کر دادی اور ان کے مابین ہونے والی گفتگو کو سنتا۔ ممکن ہے وہ چندا ماموں کے ننگے پن کی کہانی ایک دوسرے کو سنا رہی ہوں۔ ممکن ہے . . . . .

برہسپتی مہاراج کی پتنی جوان تھی۔ چندر ما دیوتا کا من انواڈول ہو گیا۔ وہ گورو پتنی کے ساتھ بھاگ گئے۔ گورو پتنی چھوکری تو تھی ہی۔ برہسپتی مہاراج کو پتہ لگا۔ شاپ دیا کہ تو نے گورو پتنی پر ڈورے ڈالے ہیں۔ تو سدا ننگا رہیگا۔ کبھی گھٹیگا تو کبھی بڑھیگا۔ گورو کی چھوٹی عمر والی بیوی بھگانے کی یہی سزا ہے . . . . کچھ ایسی ہی کہانی دی ماں سنا رہی تھیں۔ "بھو چندا نے بھی عجب (غضب) کیا۔ گورو کی بتیہ بانی (عورت) کو لے بھاگا۔"

آنٹ — وہ دیوار کی اوٹ سے سب کچھ سن رہا تھا۔ آخر سے راز معلوم ہو ہی گیا۔ وہ خوش تھا۔ اس کی جستجو ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ دن کے باقی وقت اچھلتا کودتا رہا۔ اوہ!! چندا ماموں یوں ننگے ہیں۔ انہوں نے گورو کی پتنی پر ڈورے ڈالے اور اپنے گورو کی بیوی کو بھگا کر لے گئے۔ مگر شاپ کے بعد ننگے تو ہو گئے۔ لیکن ان کے بدن سے روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔

روشنی کی کرنیں۔ گورو پتنی کو بھگا لیجانے کے بعد سدا ننگے رہنے کا شاپ اور روشنی کی کرنیں۔ اس طالب علم کا خیال ایکدم محلے کی نکڑ پر اس کے سکول میں پڑھانے والے پہلی جماعت کے معلم کی تیرہ سالہ بیوی سے منطبق ہو گیا۔ وہ دو دن کا چھوٹا تھا یعنی اس کی عمر کا بارھواں ہی سال تو تھا۔ اب اگر اسکا جسم گورو کے شاپ سے سدا ننگا رہ کر مجسم روشنی بنتا تھا تو اسے پہلے گورو کی استری کو بھگانا چاہئے۔ کیوں نہ وہ بھی چندا ماموں کی طرح سفید سفید ساری دنیا کو اجالا پہنچانے والا بن جائے۔ اوہ آ۔۔ آ۔ وہ اپنے خیال کی جگمگاہٹ سے تڑپ اٹھا۔ اس کی روشنی چندا ماموں کی طرح چھتوں مندر کے کلسوں، محلوں اور بازاروں پر سپاٹ چادر کی طرح پھیل جائیگی۔ بچے اسکا سفید ننگا جسم دیکھ کر تالی پیٹینگے "چندا ماموں تو دکے۔ چندا ماموں ننگے" . . . . اور وہ گورو پتنی کو بھگانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

اس انوکھی دریافت کے تیسرے روز ہی وہ گورو پتنی کے پاس پہنچا۔ وہ بیچاری اپنے خاوند کی غیر حاضری میں چوکا برتن کر رہی تھی۔ اس کے بدن پر میلی کچیلی دھوتی تھی۔ ہاتھ میں چوڑیاں اور پیروں میں جھانجن۔ اس کی چوڑیاں جھانجن سمیت ایک عجیب بے ہنگم بھونڈا سا نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ گھونگھٹ ناک کے برابر تھا۔ رنگ ذرا سا نولا اور نقش ذرا کھردرے۔ بہرکیف وہ گورو کی پتنی تھی۔

وہ بیدھڑک اس یک منزلہ مکان میں گھستا ہی گیا۔

"کون ہے رے؟" گورو پتنی نے برتن مانجھتے مانجھتے گھرکی سی دی۔

"ہے' میں ہوں اور کون ہے۔ پاس والے ڈھونڈیں پاس والے ڈھونڈیں ماسٹرنی جی ایک ہرا سا نیلا سا کتا مرا پڑا ہے۔ میں تم سے کہنے آیا ہوں۔ تم نے ایسا کتا کبھی دیکھا ہی نہ ہوگا۔ ایں!۔"

"ہرا سا نیلا سا کتا۔ ابھی تو مدرسے کی چھٹی میں بہت سے ہے۔ چل ایسی چیزیں روز تھوڑی دیکھنے میں آتی ہیں۔ چل!!"

وہ آگے آگے تھا اور ماسٹرنی جی پیچھے۔ چلا چل چلا چل دونوں ڈھونڈیں میں پہنچے۔ ہرا سا نیلا سا کتا مرا سا کتا نظر آ ہی

نہیں رہا تھا۔ ”ارے جی کدھر ہے وہ کھاٹ“

”سیدھا آگے چلو اور آگے۔“

دونوں ڈھونڈو کے تاریک کونے میں پہنچ گئے۔

اُس نے گورو چھنی کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ یہاں“

”کیوں؟“ گورو چھنی کسی غیر ارادی جذبہ کے ماتحت کانپ رہی تھیں۔

”بیٹھو بھی ماسٹرنی جی۔ ماسٹر جی آئیں گے شاپ دیں گے۔ میرا بدن ننگا ہو جائے گا۔ پھر چندا ماموں کی طرح میں گھٹوں گا۔ بڑھوں گا۔ پھر گھٹوں گا پھر بڑھوں گا میری روشنی سارے جہان میں پھیل جائے گی۔ بس تم یہاں بیٹھی رہو“

اُس نے ماسٹرنی جی کا ہاتھ تھام لیا۔

”ارے جی چھوڑ دو میرا ہاتھ۔“

”نہیں چھوڑتے“ اُس نے ہاتھ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کہیں اُس کا خواب منتشر نہ ہو جائے۔ گرو جی اُسے شاپ نہ دیں۔ اُس کا بدن ننگا نہ ہو سکے۔ اور اُس کا اُجالا سارے جگ میں نہ پھیل سکے۔ اور۔ . . . .

ایک سایہ ساڈھونڈو کے تاریک کونے کی جانب بڑھتا آرہا تھا۔ یہ ماسٹر جی تھے۔ جو کسی وجہ سے سکول سے جلد ہی چلے آئے تھے۔ اور اپنی بیوی کو گھر نہ پا کر ڈھونڈو کی طرف غیر ارادی طور سے نکل آئے تھے۔ ”نمو۔ اری او نمو کہاں چلدی سٹری!“

گورو جی شاپ دینے آرہے تھے اُسنے گورو چھنی کے ہاتھ اور مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔

. . یہ آگے بڑھتا ہی گیا بدھو! یہاں ہے تصم کی دُھاڑو۔ اپنے یار کے ساتھ آنچل کی عورت . . . مگر تو

ہے تیرے ساتھ دیکھوں تو“

”گورو جی ہیں“

”ارے یہ تو کل ہی کا چھوکرا ہے“ گورو جی کے لہجہ میں سخت تیزی آرہی تھی۔ بس شاپ دینے کی کسر تھی۔ ”اسے یہ کمینی حرکت۔ تو نے بنتو کا . . . تو نے اس کا کال تو نہیں چوما تو نے میری آبرو کو خاک میں تو نہیں ملایا۔ بول!“

گورو جی نے اُسکو دونوں کانوں سمیت اوپر اُٹھا کر دبلی دکھانی شروع کر دی۔ ”لعل ہوتر کے بچے حرامزادے پہلی تل دو ہزار میں خریدی تھی یہ چھوکری۔ تل دو ہزار . . . “

”گورو جی بس۔ مجھے شاپ دو . . . میں چندا ماموں ایسا بن جاؤنگا“ اُس نے کانوں سے سخت تکلیف کے باوجود اپنا مطلب ادا کیا۔

”تو چل ری اپنے گھر . . سالا بہکا کے لے آیا یہاں“ گورو جی نے ایک جھٹکے سے بھرا طمانچہ اپنے شاگرد کے رسید کیا۔ جس سے ساری دنیا اندھیر ہو گئی۔ اندھیرے میں نیلے پیلے لال مہتابی ستارے جگمگ جگمگ کرنے لگے۔ اُس کا سر چکرایا۔ وہ ڈھونڈو کے تاریک کونے میں دھم سے گر پڑا۔

بیہوشی سے ہوش کی کیفیت تک پہنچنے کے دوران میں اُسے یقین ہوتا گیا کہ گورو جی نے ضرور طمانچہ مارتے وقت اُس کو شاپ دیا تھا۔ کہ تو سدا ننگا رہے گا ہم روز گھٹے گا اور بڑھے گا . . . لیکن جب وہ ہوش میں آنے کے بعد ڈھونڈو کے تاریک کونے سے روشنی میں آیا تو اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اُس کے جسم پر کپڑے موجود ہیں اور روشنی معدوم ہے!

حجابِ سرمدی کیا ہے کہاں ہے

بہ حیرت افزا روئے امکاں ہے

میں سمجھی تھی جسے کم نصیبی

مگر اب ہے جھلک میرا ازل کی

آفتاب [illegible]

محمد عبداللہ قریشی

تاریخی واقعہ

رانی وہیلہ

عورت کے نازک نازک ہاتھ جو عام طور پر بچوں کا پنگوڑا ہلایا کرتے ہیں، وقت آنے پر کبھی کبھی سیاست کی گتھیاں بھی سلجھا لیتے ہیں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ بھی کر دیا کرتے ہیں۔

اب سے تقریباً تین ہزار برس پیشتر کورو اور پانڈو کے زمانہ میں دریائے سندھ کے کنارے جاٹ اور میڈ دو قومیں آباد تھیں۔ وہ کئی پشتوں سے وہاں رہتی تھیں۔ مگر ایک دوسرے سے متنفر تھیں۔ جس طرح ان کی ابتدائی تاریخ کا حال کسی کو معلوم نہیں، اسی طرح یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان دونوں میں باہمی مخالفت اور دشمنی کب شروع ہوئی۔ اور اتنی دیر تک کیوں قائم رہی۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان کا عناد بہت پرانا اور [illegible] تھا اور کئی مرتبہ کسی وجہ نزاع کے بغیر ہی لڑائی چھڑ [illegible] اور مدتوں تک جاری رہتی تھی۔

[illegible] روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر جاٹوں نے دریا [illegible] پار اپنی نئی بستی الگ بسا لی اور وہاں رہنا شروع [illegible] لیکن عداوت و انتقام کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی [illegible] دونوں قوموں کے سینوں میں برابر سلگتی رہی۔ بلکہ [illegible] اس سے شعلے بھی بھڑک اٹھتے۔

[illegible] دونوں قوموں میں کچھ امن پسند سردار بھی تھے۔ جو [illegible] کی وحشیانہ حرکات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی [illegible] میں سر جوڑ کر بیٹھتے۔ صلح صفائی کی تدبیریں سوچتے۔ [illegible] اصولے لوگوں کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ جاتی۔

اس وقت راجہ دریودھن ہندوستان کا راجہ تھا۔ اس کے عدل و انصاف کی [illegible] شہرت تھی۔ وہ سردار ایک وفد بنا کر اس کے [illegible] پہنچے۔ اپنی مصیبتوں کی داستان طویل بیان کی۔ اور کہا کہ وہ ان پر کوئی ایسا حاکم مقرر کرے جو ان کی دیرینہ عداوت کو ختم کر کے ان کے علاقوں میں امن و امان قائم کر دے تاکہ وہ اس مخمصے سے نجات پا کر تمدن و معاشرت میں حصہ لے سکیں۔

راجہ دریودھن نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے اُن کی درخواست سنی۔ اور اُن کی افسوسناک حالت پر ہمدردانہ غور فرمانے کا وعدہ کیا۔ پھر کچھ دیر سوچ کر اپنی بہن دہیلہ کو سندھ بھیجنے کے لئے انتخاب کیا۔ دہیلہ کی دماغی قابلیت اور مدبرانہ طبیعت پر اُسے پورا بھروسہ تھا۔ اس کو امید تھی کہ اُس کی بہن اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوگی۔

رانی وہیلہ کی شادی راجہ جیدارتھ سے ہو چکی تھی۔ جو خود بھی ایک زبردست اور باہمت راجہ تھا۔ رانی نے اپنے بھائی کا پیغام پا کر اپنے بہادر خاوند کا منشا دریافت کیا۔ اور اُس کی اجازت حاصل کر کے سندھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ راجہ دریودھن نے جہاں بانی کے متعلق چند ضروری ہدایات دیکر بہن کے عروج و اقبال کے لئے دعا کی اور اُسے نہایت شان و شوکت سے رخصت کیا۔

رانی نے سندھ پہنچ کر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور ایک باقاعدہ سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ سب سے پہلے اُس نے جاٹوں اور میڈوں کو نرمی سے سمجھایا کہ وہ آپس میں مل جل کر رہیں اور فتنہ و فساد برپا نہ کریں۔ ورنہ ان پر سختی کی جائے گی۔ اس کی پُراثر تقریروں کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ دل صاف ہو گئے۔ میل جول رہی۔ مدت کے بچھڑے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے گلے ملے اور اپنے اپنے حصۂ ملک میں امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ رانی نے [illegible] میں سے جدا جدا حاکم بھی مقرر کئے۔ جو ان کی ضرورتوں کو سمجھتے اور اُن کو ترقی کی طرف اُبھارتے۔ اس طرح سب اپنے اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ اور ان کے باہمی تنازعات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

اس مہم سے فارغ ہو کر رانی نے اپنے ملک کے دیگر انتظامات کی طرف توجہ کی اور غیر معمولی کوشش سے اسکی مالی حالت کو

درست کیا۔ آئین و قوانین مرتب کئے۔ سڑکیں بنائیں اور رسل و رسائل میں آسانیاں بہم پہنچائیں۔ اس نے شہر اسکلنڈریا اسکنڈریہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ اور اس کو ہر طرح آراستہ کر کے ایک شفیق ماں کی طرح محبت سے ان کے دلوں پر حکومت کی۔ لوگ اس سے خوش تھے اور اس کے عدل و انصاف کی جگہ جگہ تعریف کرتے تھے۔

رعایا اس طرح آسودہ حال اور فارغ البال تو ہو گئی مگر ابھی تک وہ علم کی برکتوں سے واقف نہ ہوئی تھی۔ ان کی جہالت اور بے علمی کو دیکھ کر رانی کا دل کڑھتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ سارے علاقے میں کوئی ایسا فاضل نہیں ہے جس کے علم و فضل سے رعایا فائدہ اٹھا سکے تو اس نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرنے اور لوگوں کو علم کے چشمہ سے فیضیاب کرنے کے لئے اپنے بھائی کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اپنی آمد سے لے کر اس وقت تک کے تمام حالات و کوائف بتائے اپنی سیاسی سرگرمیوں اور ملکی اصلاحات و انتظامات کے نتائج سے اطلاع دی۔ اور اپنے ارادوں کا ذکر کر کے نہایت دل سوزی سے التجا کی کہ وہ اپنے ملک سے فاضل آدمیوں کی ایک جماعت بھیجے جو اشاعت تعلیم کے نیک مقصد میں اس کی امداد کرے۔ اور اس کے ملک میں علم کی روشنی پھیلائے۔

راجہ دریودھن اپنی بہن کے حسن انتظام کے حالات اکثر لوگوں کی زبانی سنتا رہتا تھا۔ اور اس کی متوقع کامیابی پر بہت خوش ہوا۔ اس نے ہندوستان سے تین ہزار برہمن عالم منتخب کر کے نہایت شان و شوکت سے اپنی بہن کے پاس سندھ روانہ کئے۔ ان علماء نے وہاں کے گوشے گوشے میں جا کر ہر ایک گھرانے کو علم و اخلاق کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے رانی کے ملک کی حالت بہتر ہو گئی۔ اور وہ بیس سال تک حکمرانی کر کے یہ ثابت کرتی رہی کہ عورت کے نازک نازک ہاتھ جو عام طور پر بچوں کا پنگوڑا ہلایا کرتے ہیں۔ وقت آنے پر کبھی کبھی سیاست کی گتھیاں بھی سلجھا لیا کرتے ہیں۔ اور قوموں

خلیق ابراہیم

خلیق مرحوم کے نام

انہدام نظر

اک میرے شناسا نے کہا راہ میں کل شام — سوچا بھی ہے تم نے کبھی اس سوز کا انجام
بالوں میں نہ کنگھی ہے نہ کپڑوں میں سجاوٹ — چلتے ہو تو آتی نہیں کچھ حسن کی آہٹ
جب دیکھئے اُلجھے ہوئے رہتے ہو خرد سے — بچتے ہی نہیں ہو کسی آزار کی زد سے
چلتے ہو تو گھبرائی ہوئی چال سے وحشت — اس طرح ٹپکتی ہے کہ خطرے میں ہو عزت
آواز سے بیتابیٔ دل بول رہی ہے — تتلی کوئی پھولوں پہ سے پر تول رہی ہے
ہنسنے میں بھی شاداب ترنم نہیں باقی! — جو روح میں گھل جائے تبسم نہیں باقی
نورس سی کلی ہو کے یوں مرجھائے ہوئے ہو — جیسے کوئی مجنون کو بہلائے ہوئے ہو
شمشاد[1] سے اُلفت ہے نہ ہاشم[2] کی رفاقت — مشتاق[3] کا ہے ساتھ تو ہے نور[4] سے رغبت
ہندی[5] کے ترانے ہیں تو مختار[6] کی باتیں — اختر[7] کی، فراق[8] اور نذیری[9] کی ثنائیں
انصاری[10]، کرشن[11] اور شفیق[12] آپ کے دمساز — ہم بھولے سے آ جائیں تو دکھلایئے گا ناز
مرزا[13] سے خلوص اور محبت کا وہ عالم — سورج کے لئے جیسے ہو اک قطرۂ شبنم
کیلاش[14] کی یاد آج بھی تڑپاتی ہے تم کو — بے کیف و گرانبار بنا جاتی ہے تم کو
ہیں ذہن پہ طاری لینن و مارکس کے افکار — ہر وقت مسلط ہیں خرافات کے انبار
لب پر کبھی اقبال کبھی جوش کے اشعار — یہ نظم کہن سال اُلٹ دینے پہ تیار
سنتے ہیں کہ اک شوخ سے کل آنکھ لڑی ہے — واللہ یہ اک آفت جاں سر پہ پڑی ہے
کھیلے گی وہ جذبات سے کچھ روز تمہارے — پھر آنکھ کسی اور پہ بکھرائے گی جلوے
ہونٹوں سے تمہارے شکر و شہد پیئے گی — تتلی کی طرح دوسرے پھولوں پہ اُڑے گی
مجھ کو تو یہی شک ہے کہ وہ شوخ طبیعت — وقتی ہی سہی رکھتی بھی ہے تم سے کچھ اُلفت؟
معصوم سا دلچسپ سا اک لڑکا سمجھ کر — اُلّو تو بناتی نہیں وہ عربدہ پیکر!

---

[1] و [2] بچپن کے دو سرمایہ دار دوست [3] سید محمد مشتاق [4] نور اللہ [5] سید بشیر ہندی [6] مختار صدیقی [7] اختر الایمان [8] فراق گورکھپوری [9] خلیق نذیری [10] خلیق انصاری [11] کرشن چندر [12] شفیق احمد [13] میرزا ادیب [14] کیلاش ناتھ ورما مرحوم جن کی یاد میں لکھنؤ یونیورسٹی یونین کی زیر نگرانی ایک لائبریری قائم کی گئی ہے۔

کالج سے یہ نکلے ہوئے رنگین سے ڈھانچے
اے کاش انہیں ڈھالتے مغرب ہی کے سانچے

مشرق ہی سے واقف ہیں نہ مغرب کے شناسا
ہر پھر کے نظر آتا ہے بس ایک دوراہا

چھوڑے تو ہیں مشرق کے وہ بیہودہ روایات
مغرب سے مگر لائی ہیں بے شرمی کی سوغات

تمکین ہے چہروں پہ نہ آنکھیں ہیں حیا بار
نظروں سے وہ دھندلائے ہوئے حسن کے آثار

مشرق کی لطافت ہے نہ مغرب کی ذکاوت
تہذیب کی پروردہ ہیں اللہ ری جہالت!

رہ رہ کے مجھے یاد وہ آتا ہے زمانہ!
پکنک کے لئے ہوتے تھے ہم لوگ روانہ

شترکھ کے گھنے آم کے باغوں کی ہوائیں
پہلے پہل آئی تھیں جوانی کی صدائیں

برسات کا وہ موسم گلرنگ و بہاریں
آغوش میں بدلی کے وہ نظارۂ رنگیں

تالاب کے ساحل پہ لچکتی سی بڑولیں
اور باغ میں جھولوں کی وہ بڑھتی ہوئی پینگیں

پردیس این پیا جن کے براجے ہوئے ہوتے
وہ گیت بڑے سوز سے گائے ہوئے ہوتے

ہم میں سے جو چھوٹے تھے وہ پکوان پکاتے
چھپ چھپ کے بڑے جاتے تھے پینگوں کو بڑھانے

تم ان دنوں ہوگے یہی دس گیارہ برس کے
میں اور فصاحت تھے کوئی سولہ برس کے

لیکن تمہیں جھولوں سے سروکار نہیں تھا
اور ساتھ تمہارا ہمیں بھی بار نہیں تھا

ہاشم کا یہ اصرار کہ تم گیت سناؤ
اور تم کو یہ ضد پہلے وجاہت کو گواؤ

قدوائی کو نانی سے وہ بیہودہ سی نفرت
کہتا تھا کہ گڑ سے مجھے مطلق نہیں رغبت

اعجاز کا وہ بھونڈی سی آواز میں گانا
شمشاد کو ہم سب کا گلے پڑ کے ستانا

پھر شام کو جب بیٹھتے تھے کھانے پہ آکر
اعجاز یہ کہتا تھا یونہی گا میں کلکٹر

قدوائی کو جج بننے کی ہر وقت تمنا
ہاشم کو ریاست کے سوا کچھ نہ تھی پروا

بیرسٹری سے مجھ کو تھی پیدا کشی الفت
چھڑ جاتی نہ یہ جنگ تو جاتا میں ولایت

آنکھوں میں تمہاری تھا ذہانت کا تبسم
ہم سب کی یہ تھی رائے بنو آئی سی ایس تم

لیکن تمہیں اس حال میں دیکھا ہے خلیق اب
جس طرح سے دن ڈھلتا ہے چھاتی ہے گھنی شب

کہتے تو یہی ہو گے کہ یہ حضرت شاعر
واعظ کی طرح دشمن جاں سے نہیں کمتر

لیکن مرے ہمدم یہ ہے سب خام خیالی
ہوں حضرت واعظ ہی تو ہوں دشمن جانی

وعظ اور نصیحت سے مجھے کام نہیں ہے
دوزخ سے ڈرانا تو ہے بیکار سی اک شے

از راہ شناسائی دیرینہ مگر ہاں!
جی چاہتا ہے دیکھوں تمہیں سب میں نمایاں

اس جوہر ذاتی کو نہ یوں مفت گنواؤ
کچھ عقل سے لو کام ذرا ہوش میں آؤ

ے لکھنؤ کے قریب ضلع بارہ بنکی کا ایک قصبہ جہاں میرے لڑکپن کے ابتدائی دو سال گزرے۔

اے کاش کوئی "ہمدمِ دیرینہ" سے کہدے
واقف نہیں وہ روح کی پاکیزگیوں سے

وہ ذہن کی اونچائیوں تک جا نہیں سکتا
آکاش کے تاروں کی خبر پا نہیں سکتا

یہ سچ ہے کہ کپڑوں میں نہیں کوئی سجاوٹ
چلنے میں بھی آتی نہیں کچھ حسن کی آہٹ

یہ سچ ہے کہ ہیں بال بھی لہرائے ہوئے سے
چہرے کے بھی کچھ نقش ہیں کجلائے ہوئے سے

لیکن مری آواز حقیقت کی ہے آواز
مضمر ہیں نگاہوں میں مری حسن کے انداز

نغمات مرے ایک نئے دَور کا آغاز
جس دور پہ خود فطرتِ انسانی کو ہو ناز

اُس دَور کا آغاز جہاں حسن بسے گا
فرقت کے مصائب نہ جہاں عشق سہے گا

دُنیا میں نظر آئیں گے جنت کے نظارے
اور جل نہ سکیں گے کبھی قدرت کے بھلاوے

سرمائے سے محنت کا جہاں گیر تصادم
بن جائے گا مزدور کے ہونٹوں پہ ترنم

ہاں ٹھیک ہے، دل بھی ہے مرا مائلِ پرواز
دیکھے بھی ہیں تم نے کبھی اُس شوخ کے انداز

وہ کاکلِ شبرنگ، وہ پیشانیٔ گلرنگ
وہ نقرئی آواز جسے پا نہ سکے چنگ

پھر آنکھ اگر دیکھ لے وہ چشمِ فسوں رنگ
رُک جائے وہیں گردشِ دوراں بصد آہنگ

وہ نیم نگاہی کا سماں روشنی و گل ریز
نظروں کی تراوش ہے نشہ ریز و جنوں خیز

چلنے میں جو پامال ہوئے جاتے ہیں نغمے
سیاروں کی آواز بنے جاتے ہیں نغمے

چہرے کی سپیدی پہ گماں نورِ سحر کا
وہ سُرمگیں آنکھوں سے حیاؤں کا اُبلنا

ہونٹوں پہ تبسم کی کرن پھوٹ رہی ہے
آکاش کے ہاتھوں سے سحر چھوٹ پڑی ہے

روحی کا اگر شوقِ فراواں نہیں دیکھا
تم نے کبھی دنیا کو فروزاں نہیں دیکھا

بیباک صداقت سے خمیر اس کا اٹھا ہے
بے لوث محبت نے اُسے خلق کیا ہے

وہ کوئی پٹی بورڈر والڑکی نہیں ہے
سادہ ہے بہت ایسی تو رنگیں بھی نہیں ہے

سچ پوچھو تو ہے سادگی ہی حسن کا جوہر
ہو آن و ادا ساتھ تو زہرہ سے ہے بڑھکر

روحی ہے اسی حسنِ دلآویز کا مظہر
اک سطوتِ خاموش ہے جس حسن کا محور

——— اور "یہ سطوتِ خاموش" "مہرِ سکوت" میں بدل جاتی ہے اس لئے کہ خیال کا دھارا یہاں تک پہنچکر مشاہدات و تجربات کے تحت یکایک اپنا رُخ پھیر دیتا ہے اور شعلو اپنے ذہن و روح (mind and spirit) میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ نظم کو مکمل کر سکے۔ وہ کرشن چندر کے ان الفاظ کو اس نظم کا اختتامیہ بناتا ہے۔

"— لیکن ان عقلمند آدمیوں نے آج تک انسانی خوشی، مسرت اور حسن میں ایک لمحے کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ جوں جوں عقلمندی بڑھتی ہے سماج کا دائرہ تنگ ہونے لگتا ہے دنیا بھر کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے طوائفیت پھیلتی ہے عشق مرتا ہے۔ خونریز جنگیں ہوتی ہیں کارخانوں میں ہڑتالیں ..... ہر پچیس سال نئی نوجوان نسل انسانی نسل خاک و خون کے بستر پر لوٹتی نظر آتی ہے کیونکہ دنیا میں عقلمند سیاستدانوں کا راج ہے، شاعروں کا نہیں، سماج پرستوں کا غلبہ ہے عاشقوں کا نہیں، پاپ گھر پر ناچتی ہوئی لڑکیوں کا اثر ہے چرواہوں کا نہیں، سرمایہ داروں کا حکم ہے مزدوروں کا نہیں، سیکڑوں برس انسانیت نے ان عقلمند سیاستدانوں جاگیرداروں، سرمایہ پرستوں، سماج کے ٹھیکہ داروں اور طوائفیت میں پلی ہوئی حسیناؤں کی دانش کا تجربہ کیا ہے اب اگر چند دنوں کیلئے احمق شاعروں، عاشقوں، مزدوروں، چرواہوں کی بیوقوفی کا تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے سیکڑوں سال سے ہم لوگ عقلمندوں کی رہگذار پر چلے آرہے ہیں اگر دو گھڑی بیوقوفی کی جھاڑی میں دم لے لیں تو کیا حرج ہے؟ احمق کہیں کا بیوقوف!

یہ سچ ہے کہ میری یہ تجویز بالکل احمقانہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی تو سچ مچ جی چاہتا ہے کہ اس عقلمندی کا گلا گھونٹ دیا جائے لیکن پھر سہم کر رہ جاتا ہوں کیونکہ اس دنیا میں بڑے بڑے عقلمندوں کا راج ہے۔ اور —— !

"کاش دنیا کے سب لوگ بیوقوف ہوتے!"

سید احسان علی شاہ بی-اے (آنرز)

بے شرم

دھپ۔ ٹھس۔ ہی ہی ہی ——!

سرجو کی آنکھ تڑاق تڑاق سے کھل گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی پچھلی کوٹھری میں سرنگ لگا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر پھٹے پرانے نمدے سے سر نکالا اور پھٹے پھٹے دیدوں سے پچھلی کوٹھری کی طرف گھوم کر دیکھا۔

دھپ۔ ٹھس۔ ہی ہی ہی ——!

پھر وہی مہین باریک آواز سنائی دی۔ اور سرجو کا سر خود بخود اظہار نفرت کے طور پر اس جانب تیزی سے ہلا اور پھر اسی سرعت کے ساتھ اپنی جگہ پر آن کر ساکن ہو گیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بڈھا آدمی۔ اسّی بچاسی کے لگ بھگ عمر۔ نیند تو خیر آتی ہی نہ تھی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ صبح سے شام تک لکڑی کا بکس اپنے کمزور کندھوں پر اٹھائے اسے ایک گلی سے دوسری گلی اور دوسری سے تیسری گلی میں جانا پڑتا تھا۔ اس پر مستزاد "پالش کرالو —" اور "جوتے سلوالو ——!" کی پیہم آوازیں لگانا پڑتیں۔ جس کی وجہ سے شام ہوتے ہوتے بوڑھی ہڈیاں چٹخ جانے کی منزل کے قریب پہنچ جاتی تھیں۔ اس وجہ سے کچھ تکان، کچھ خون کی کمی مل ملا کر اسے نیم بیہوش سا کر دیتیں اور وہ اپنے پھٹے ہوئے نمدے میں سکڑ سمٹ کر آنکھیں موندے اس طرح بے حس و حرکت لیٹ جایا کرتا کہ دیکھنے والے کو یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ نیند کا لطف اسے اب یاد بھی نہ تھا۔

اور اب پندرہ دن سے نیم بیہوشی میں بھی خلل پڑنے لگا تھا۔ اس کے اکلوتے لڑکے کالو کی شادی کو پندرہ دن ہو گئے تھے اور برابر پندرہ دن سے یہی ہو رہا تھا کہ ادھر سرجو پر تھکان کی وہی نیم بیہوشی کی کیفیت طاری ہوئی اور ادھر اندر کی کوٹھری سے دھپ ٹھس ہی ہی ہی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عام طور سے روزانہ یہی قصہ ہو رہا تھا، اور روزانہ اسی طرح سرجو کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی۔ وہ روزانہ یہی محسوس کرتا تھا کہ کوئی اس کی پچھلی کوٹھری میں سرنگ لگا رہا ہے۔ اور روزانہ اسی شدت کے ساتھ اس کا دل دھڑکا کرتا تھا۔

آج بھی سرجو نے حسب معمول نمدے میں سر چھپا لیا۔ اور اکڑوں ہو کر اسی نیم بیہوشی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن آج انتظار کے باوجود اس کے دماغ میں سرسریاں نہیں چلیں۔ اور نہ جانے کیوں سرجو کو معمول سے زیادہ سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اندر کی کوٹھری میں کچھ اوں توں کے بعد خاموشی طاری ہو گئی تھی اور خراٹوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ اطمینان کے خراٹے!

لیکن سرجو سوچے جا رہا تھا۔ واہی تباہی۔ ادھر ادھر کی۔ بعض ایسی باتیں جن کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا۔ اسے خود حیرت ہو رہی تھی کہ وہ یہ سب کچھ سوچ کیوں رہا ہے۔ آخر یہ بھی کوئی بات تھی کہ پورے پچاس ساٹھ سال کے بعد آج پھر اسے پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ ایسی باتیں جن کا گزر کبھی بھی اس کے دماغ میں نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے اپنے پہلے گاؤں کی چودھرائن یاد آ رہی تھی۔ پتلی دبلی گندم گوں چہرے میں کچھ عجیب قسم کی سرخی گھلی ہوئی اور پھر جب چودھری نے نہ جانے کس جرم کی بنا پر اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا اور چودھرائن نہ معلوم کیوں سیدھی سرجو ہی کے باپ کے پاس چلی آئی۔ اسے خوب یاد تھا، اس کے باپ نے بیٹی کہہ کر اسے اپنے یہاں رکھ لیا اور پھر ——!

سرجو نے ایک زور کا سانس لیا۔ اور پھٹے پرانے نمدے کو اچھی طرح سے اپنے چاروں طرف دبا لیا لیکن اس کے باوجود اس کی ٹھٹری کم نہ ہوئی۔ رانیں کانپنے لگیں۔ اس کا سانس گھٹنے لگا۔ سرجو نے گھبرا کر اپنا سر نمدے سے باہر نکال لیا اور ٹکٹکی باندھ کر مٹی کے دیئے کے ہونٹوں پر ایک ننھے سے کانپتے ہوئے شعلے کو دیکھنے لگا۔ شعلہ کانپ رہا تھا۔ اسے بھی شاید کوئی پرانی بات یاد آ گئی تھی۔ شاید کوئی پتلی دبلی گندمی رنگ کی چودھرائن جس کو اس کے باپ نے اپنے گھر میں سلا لیا تھا۔ سرجو دیر تک اپنی اندر کو دھنسی ہوئی کالی مرچ کے دانے ایسی آنکھوں سے اس شعلے کی طرف دیکھتا رہا اور اس کی

نگاہوں کے سامنے ایک تپلا دبلا جسم ایک چھوٹی سی کھاٹ پر، جس کے میلے پن کو عارضی طور پر ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا، لیٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کھاٹ سے تھوڑی ہی دور ایک چٹائی بھی دکھائی دیتی تھی۔ جس پر ایک مضبوط ڈیل ڈول کا نوجوان کمبل اوڑھے دکھائی دیتا تھا ——— یہ خود سرجو تھا۔

یکایک سرجو کے جسم میں جیسے ایک انگڑائی لہرا گئی۔ اس کا ہاتھ لاشعوری طور پر اپنی رانوں پر آ کر ٹھہر گیا اور پھر جیسے وہ حیران ہو کر چونک پڑا۔ لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ اس کی اپنی ران پر نہیں بلکہ کسی سوکھی لکڑی پر لگا ہے ——— کھردری بے جان لکڑی پر! اور پھر دفعتہً اسے یاد آ گیا۔ چٹائی پر سوئے ہوئے نوجوان سرجو اور اب کھاٹ پر لیٹے ہوئے بڈھے سرجو کے درمیان زمانے کی کئی طویل گردشیں حائل ہو گئی تھیں۔ اسے خود بخود شرم آ گئی اور اس نے رام رام کہہ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اب اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس ناپاک خیال کو اپنے دماغ پر سے کھرچ دیگا۔ چنانچہ اس نے زبردستی اپنا دھیان کالو کی گائے کی طرف منتقل کر دیا۔ سرجو ذات کا چمار۔ پیشے سے بوٹ پالش کرنے والا موچی ——— گائے تو رہی ایک طرف، اسے عمر بھر میں دودھ بھی ملا ہوگا تو سو پچاس بار۔ لیکن قسمت کی بات ہوتی ہے۔ سرجو کے دروازے پر بھی گائے بندھنا تھی۔ چنانچہ کالو کی شادی ہوئی تو اس کی بیوی کو جہیز میں ایک گائے بھی ملی۔ یہ اور بات تھی کہ گائے ذرا دبلی پتلی تھی۔ ذرا کاہے کی، ہڈیوں کا ڈھچر کہئے۔ لیکن اس کے باوجود سرجو کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ربانی برکات کے تمام دروازے اس پر کھل گئے ہیں اور وہ گاؤں بھر میں سب سے بڑا آدمی ہے۔ مٹی کی گائے کم نہیں ہوتی۔ اور یہ تو تھی ہی سولہ آنے اصلی گائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے گائے آئی تھی سرجو کا تمام تر دھیان اسی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ پہلے تو دودھ دوہنے کے لئے تانبے کی گگریا چاہئے تھی۔ بہت سر پٹخا، پیٹ کاٹا لیکن تانبے کی گگریا نہ ملنی تھی نہ ملی۔ آخر سرجو نے تقدیر کو دو ایک صلواتیں بڑے رعب سے سنائیں۔ اور مٹی ہی کی گاگر پر قناعت کر لی۔ اس کے علاوہ گائے کو گھاس پھوس اور دانا دُنکا دینے میں اتنا اہتمام کیا گیا کہ اپنی روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ ان پندرہ دنوں میں کم از کم تین چار مرتبہ تو رات کو پیٹ بھر روٹی نہیں نصیب ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سرجو خوش تھا۔ روٹی ملے نہ ملے گائے دوہنے کا لطف اُسے آ جاتا تھا۔ گائے کے وہ دودھ سے بھرے ہوئے تھن جب اس کے ہاتھوں میں آتے اور دودھ کی دھاریں مٹی کی گاگر میں ایک آسمانی ترنم کے ساتھ گرتیں تو سرجو کی رگ رگ میں نشہ دوڑنے لگتا۔ اسے اپنی بھوک، کالو کی بھوک اور کالو کی بیوی کی بھوک سبھی بھول جاتی۔

یہی وجہ تھی کہ چودھرائن کو دماغ سے پرے ہٹانے کے لئے اس نے گائے کی مدد لی لیکن وہ گائے جو پیٹ کی آگ دبا دیتی تھی چودھرائن کے خیال کے سامنے لپسپا ہو کر رہ گئی۔ گائے کی لمبی لمبی سانسوں کی آواز جو قریب ہی کے چھپر سے سنائی دے رہی تھی سرجو کو اکثر بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی جب گائے کان پھٹپھٹا دیتی تو وہ محسوس کیا کرتا کہ مچھر گائے کو نہیں بلکہ اسے تنگ کر رہے ہیں۔ لیکن آج گائے کی سانس کی آواز بہت دھندلی دھندلی سی تھی۔ جیسے دور کہیں سے آ رہی ہو اور اس کے کان پھٹپھٹانے کی آواز بالکل اس آواز سے ملتی تھی جو چودھرائن کی چارپائی سے اس وقت پیدا ہوئی تھی جب چودھرائن سرجو کی تیز سانس اپنے گندم گوں گالوں پر محسوس کر کے ایک ہلکی سی سسکی لے کر ایک دم بیدار ہو گئی تھی۔ ——— وہی کرٹھپ ——— کرٹھپ ———!

سرجو نے پھر کروٹ لی۔ نہیں، اپنا جسم اٹھا کر دوسری طرف دے مارا۔ اس کی پرانی چارپائی اس زور سے چیخ اٹھی کہ سرجو نے گھبرا کر ہاتھ باہر نکالا اور سرہانے کی چولیں دیکھنے لگا۔ لیکن چولیں مضبوط تھیں۔ چارپائی کوئی نہیں تھی۔ سرجو نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر پھٹے پرانے نمدے میں اکڑوں ہو گیا ——— جیسے بندھا ہو! لیکن اس کے باوجود چودھرائن کی وہ دہشت زدہ آنکھیں اس کے سامنے تھیں۔ اور پھر جیسے جھک کر کسی نے اس کے کان میں اسی کا فقرہ دہرا دیا۔ اس نے کہا تھا ——— "بہن جی! ——— یہاں وہ میری ——— کیا نام ہے ——— وہ جو ہوتی ہے ——— کیا نام ہوتا ہے اس کا ——— نسوار کی ڈبیا تو نہیں ہے ———" اور یہ کہہ کر اس نے خواہ مخواہ چودھرائن کا تکیہ اٹھا کر الٹ دیا تھا۔ اس کی نسوار کی ڈبیا تو اس کی اپنی جیب میں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ کس جذبے کے ساتھ چودھرائن کے اتنے قریب آ گیا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود اس نے چودھرائن کو "بہن" کہا تھا۔ کتنا تاریک باطن لیکن کتنا پاکیزہ بہانہ ——— اس سے بھی بڑا کوئی فریب ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سرجو نے یہ فریب کیا۔

لیکن اس وقت اس کے ضمیر نے اسے کوئی لعنت ملامت نہیں کی وہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد اپنی چٹائی پر واپس جا کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اسے نیند نہ آئی۔ اس کے کان چودھرائن کی سانس کے آمد و شد

پر سرکو زور سے ساس نے اس روز محسوس کیا تھا۔ چودھرائن کافی دیر تک زور زور سے سانس لیتی رہی تھی۔ پھر اس کی آواز دھیمی پڑ گئی اور سانس لمبی ہو گئی ــــ پھر اور لمبی ــــ اور پھر ــــ ہاں پھر سرجو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ پھر اس کے نتھنے پھڑکنے لگے ــــ وہ پھر اٹھا ــــ آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے اور چودھرائن کی چارپائی کی طرف بڑھا۔ لیکن ابھی چارپائی میں دو قدم کا فاصلہ اور تھا کہ چودھرائن نے یکدم گھوم کر پوچھا۔

"نسوار نہیں ملی ابھی سرجو بھیا؟"

اور سرجو کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ اور سوکھتی ہوئی زبان کو زبردستی چلانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"جی بہن جی ــــ کیا کہا آپ نے بہن جی؟"

لیکن اس کی بہن جی نے کروٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہاری مہمان ہوں سرجو بھیا ــــ سو جاؤ اب۔"

اور سرجو جواب دیئے بغیر پانی کے گھڑے کی طرف لپکا۔ اسے پیاس نہیں تھی لیکن اس نے پانی پیا۔ پانی کا ایک ایک گھونٹ اس کے حلق میں اٹک رہا تھا لیکن اس نے پورا پیالہ پی لیا ــــ زبردستی۔ جبراً ــــ!

یہ یاد نہ تھی، پھانسی کا پھندا تھا جو سرجو کے گلے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے گھبرا کر پھر اپنا چہرہ نمدے سے باہر نکالا۔ پھر چاروں طرف دیکھا۔ بھگوان کا نام کئی کئی بار دہرایا۔ اور ہزاروں باتیں یاد کرنے کی کوشش کی لیکن چودھرائن؟ وہ نہیں بھولی اسے۔ وہ اپنے ایک پرانے گاہک کے متعلق سوچتے سوچتے یکدم چونک پڑا۔

وہ پھر سوچ رہا تھا ــــ اس دن سے کئی دن بعد کا واقعہ۔ جب اسے ایک شرابی صاحب نے خوش ہو کر پانچ روپے کا نوٹ انعام میں دے دیا تھا۔ اس روز اس نے اپنے لئے سہارنپور کے آم خریدے تھے یہ بڑے بڑے گدرائے ہوئے آم، اور اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ان آموں کو دبا دبا کر اور نرم کر کر کے چوس رہا تھا۔ دفعتہً چودھرائن اس کے سامنے سے گزر گئی۔ ساس کی اور چودھری کی پھر سے صلح ہو گئی تھی اور وہ پھر اپنے خاوند کے گھر چلی گئی تھی۔ گھر جانے سے مہینہ دو مہینہ بعد آج پھر وہ سرجو کو نظر پڑی تھی۔ اس کے سر پر پانی کی گاگریں تھیں اور اس کا پتلا دبلا نازک سا جسم بھیگی ہوئی دھوتی میں لپٹا ہوا تھا۔ بھیگی ہوئی دھوتی چودھرائن کے جسم سے اس طرح لپٹی پڑتی تھی کہ سرجو کو رشک آنے لگا۔ لیکن دفعتہً دھوتی کے خلاف رشک کا یہ جذبہ کافور ہو گیا اور سرجو کے سر پر قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ چودھرائن زمین پر آنکھیں گاڑے تیزی سے قدم اٹھاتی جا رہی تھی کہ دفعتہً اس کے ننگے پاؤں میں روڑا چبھ گیا۔ چودھرائن کے ہونٹوں سے "سی" نکلی اور اس کا نازک جسم لہرا گیا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ گاگر تھامنے کے لئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سر کی طرف اٹھ گئے۔ سرجو بیٹھا آم کو دبا دبا کر نرم کر رہا تھا۔ چودھرائن کے ہاتھوں کا سر کی طرف اٹھنا تھا کہ نہ جانے کیوں اس کے جسم کے سارے اعصاب تن گئے اور اس کے ہاتھ کی گرفت غیر شعوری طور پر مضبوط ہو گئی۔ اس نے دانت کچکچا کر آم کو دبا دیا ــــ اس زور سے دبایا اس نے آم کہ آم کی گٹھلی پھدک کر آم سے باہر آ گئی۔ اور اس کی دھوتی میں اٹک گئی۔ سرجو نے گھبرا کر گٹھلی کی طرف دیکھا۔ لیکن چودھرائن جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ نہ جانے کیوں دھوتی کے پلو کو کھینچ کھینچ کر سینے پر سمیٹ رہے تھے۔

سرجو نے زور سے اپنے منہ پر تھپڑ مارا ــــ چٹاخ ــــ رات کی خاموشیوں نے بےچینی اور بےچارگی کی آخری منزلوں تک پہنچے ہوئے اس پریشان دماغ بڈھے کی آخری اور انتہائی کوشش کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور پھر دہنی سکون، وہی طنز آمیز سکون سرجو کے چاروں طرف محیط ہو گیا۔ کتنا بھیانک تضاد تھا ــــ کاش سرجو کے دل میں امنڈتے ہوئے طوفانوں کا ہزارواں حصہ بھی بیرونی عناصر کو مل جاتا ــــ دنیا کا کلیجہ شق ہو جاتا ان کی چیخ پکار سے۔

لیکن سرجو کا کلیجہ شق نہ ہوا۔ وہ چارپائی پر لیٹا چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ کروٹیں لیتا رہا۔ سر پٹختا رہا۔ روتا رہا۔ آنسو بہاتا رہا۔ لیکن اس کی ایک بھی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ پہلے چودھرائن اس کے دماغ پر سوار تھی۔ اب وہ آم اس کے شعور کے کونے کونے پر حاوی ہو گیا ــــ آم نرم نرم ــــ پلپلا آم ــــ!

اس کی شادی ہوئی جوانی کی مسرور راتیں گزریں۔ اس وقت اسے اس آم کی یاد کیوں نہیں آئی ــــ اس وقت کس کنوئیں میں ڈوب کر مر گئی تھی اس کمبخت آم کی یاد۔ اور پھر کیوں بھول گیا تھا ــــ وہ چودھرائن کو ــــ اور چودھرائن کے بھیگے کپڑوں میں لپٹے ہوئے جسم کو ــــ بھگوان ــــ کس گناہ کی سزا تھی یہ ــــ کس پاپ کا کشٹ مل رہا تھا اسے ــــ!

لیکن یہ سزا اسے ملتی ہی رہی ــــ یہ کشٹ اسے ملتا ہی رہا۔ وہ آم اس کے شعور پر انگارے اچھالتا رہا۔ اور دفعتہً اندر کی کوٹھری سے چارپائی چیخی ــــ چرر چرخ ــــ اور پھر وہی نیند میں بھیگی ہوئی مہین آواز

سنائی دی۔

"میں نے کہا ——— میں نے کہا سنتے ہو؟"

اور پھر کالو کی خرخراتی آواز آئی۔

"کیا ہے ——؟"

"اُٹھ جاؤ اب صبح ہوگئی"

کالو نے ایک لمبی جماہی لی اور پھر چند لمحوں کے بعد خواہ مخواہ ہنسنے لگا

"اوں ۔ ہُٹو" اس کی بیوی کی آواز سنائی دی "ہم نہیں بولینگے"

"لیکن جگایا کیوں تھا مجھے؟"

"آج دادا اٹھے نہیں ——— دودھ، دودھ کون دوہے گا؟"

"دادا جانیں ——— وہ مجھے تو گائے کے قریب نہیں جانے دیتے —

میں کہتا ہوں یہ کیا بات ہے۔ گائے تو ہے ہماری اور دادا ہمیں قریب نہیں پھٹکنے نہیں دیتے ———"

"چپ رہو ——— دادا نے سن لیا تو ادھم مچائیں گے خواہ مخواہ"

"تو پھر ——— اب کریں کیا؟"

"دادا کو جگاؤ جا کے باہر ——— ان سے کہو دودھ دوہ لیں"

"اچھا"

اور پھر چارپائی کی چرچرخ ———!

لیکن سرجو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گائے کے دودھ سے بھرے ہوئے نرم نرم پلپلے تھن اور وہ سہار نپور کا نرم نرم ———

"اف بھگوان وہ کس طرح دودھ دوہے گا۔ کس جگرے کے ساتھ پانی اُچھالے گا ان نرم نرم ———"

دروازہ دھڑاک سے کھل گیا۔ اور کالو کی مطمئن مگر مسرور آواز کمرے کی خاموش فضا میں گونج اٹھی۔

"میں نے کہا دادا ——— دادا ——— دودھ نہیں دوہو گے کیا آج"

سرجو نے بمشکل آواز پر قابو پاکر کہا۔

"نہیں ———!"

"تو میں دوہ لوں" کالو کی آواز میں خوشیاں ناچ رہی تھیں۔

"دوہ لے" سرجو نے نمدے کے اندر ہی سے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح کالو کو اپنا مُنہ دکھائے۔ لیکن کالو کو اس کا مُنہ دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تیزی سے اندر گیا ——— دودھ والی گاگر میں پانی نے چھنا چھن دو چکر کاٹے اور پھر کالو باہر نکل آیا سرجو نے نمدے کے چھید پر ایک آنکھ رکھ کر کالو کو دیکھا۔ کالو خوشی سے اکڑتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑا قلعہ جیت کر آیا ہے۔

سرجو نے حقارت اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا اور مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"بے شرم" وہ سوچ رہا تھا ——— اب جا کے ——— دبائے گا ———"

"اُف بھگوان ———!" اس نے بلند آواز سے کہا۔ اور تڑپ کر بستر پر سے اٹھ بیٹھا ——— کالو کی بیوی نے گھبرا کر گھونگھٹ کھینچ لیا ——— وہ حیران تھی کہ اس کے سسر کو نجانے کیا ہو گیا تھا ———!

داستاں میری

خیر بھوروی

نوازش ہے کہ آپ آئے ہیں سننے داستاں میری   مگر قبضے میں دل ہے اور نہ قابو میں زباں میری
میں شاعر ہوں یقینی ہوں مگر دورِ غلامی کا   تبا دیگی ابھی طرزِ فغاں، طرزِ بیاں میری
چمن لٹتا ہے لیکن اس کا ماتم کر نہیں سکتا   بڑھادی ہیں کسی نے اس قدر پابندیاں میری
سمجھتا ہوں کہ گل اپنے، کلی اپنی، چمن اپنا   مگر میں کہہ نہیں سکتا، لرزتی ہے زباں میری
چمن ہنستا ہے، گل ہنستے ہیں، کلیاں مسکراتی ہیں   مگر ہنسنے نہیں دیتیں مجھے مجبوریاں میری
قیامت ہے کہ گلچیں کو بھی گلچیں کہہ نہیں سکتا   جنابِ باغباں نے بند کر دی ہے زباں میری

یہ سب کچھ ہے مگر اک دن ہوا کا رُخ بدل دیکھے
اگر تسلیم کر لیں گے امامت نوجواں میری!!

ظہور محسن ڈار

نفسیاتی تحلیل

بھوک

آنکھ کھلتے ہی میں نے بھوک کی جلن محسوس کی۔ تاریکی ابھی تک پوری طرح دور نہ ہوئی تھی۔ بستر پہ لیٹے لیٹے مجھے کھلی کھڑکی میں سے آسمان ایک دھندلی چادر سے ڈھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا جو آہستہ آہستہ سفید ہوتی جا رہی تھی اور اس کے درمیان ایک ستارہ کانپتا ہوا ڈوب رہا تھا۔ نیچے بازار میں آمدورفت شروع ہو چکی تھی اور قریب کے مندر میں پوجا کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ فضا میں سوز اس طرح سمایا ہوا تھا کہ طبیعت خود بخود افسردہ ہو رہی تھی۔ میں نے ایک جماہی لی اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچنے کی ناکام کوشش کی۔ بھوک میرے تمام خیالات پہ حاوی تھی۔ اور بن بلائے مہمان کی طرح میری زندگی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ چند دنوں سے یہ معمول ہو چکا تھا کہ آنکھ کھلتے ہی دو سرخ نقطے میری نگاہوں میں جھپانے لگتے۔ بھوک ——— اور روٹی! اور میں نے تنگ آکر کئی بار آرزو کی کہ کبھی آدھی رات کی کوئی خاموش ساعت گزرتی گزرتی تھم جائے۔ اور تمام دنیا ہمیشہ کے لئے سوتی کی سوتی رہ جائے۔ تاکہ بیداری اور بھوک کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ مگر یا تو یہ آرزو ہی خام تھی یا اس میں خود غرضی کو دخل تھا۔ بہرحال یہ کبھی پوری نہ ہوئی۔

میرے حالات اب مکمل طور پر مخالف رنگ اختیار کر چکے تھے۔ زندگی کا کوئی بلند معیار اس سے پہلے بھی مجھے نصیب نہ تھا۔ مگر اب تو جو کچھ میسر تھا وہ بھی چھن رہا تھا۔ ماں کی موت کے بعد میرے واحد رشتہ دار چچا نے جو کچھ سلوک میرے ساتھ کیا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلا ہوں۔ تنہائی اور بے بسی کے خیال نے چند روز تو بہت تکلیف دی مگر آہستہ آہستہ میں اس زندگی کا خوگر ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اکثر شدید ہنگاموں کے درمیان میں اپنے آپ کو اکیلا اور افسردہ پاتا ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے اور سناٹے میں ایک مہیب چٹان پر کھڑا کسی ساتھی کا انتظار کر رہا ہوں۔ شاید یہ تخیل میرے تنہائی کے شدید احساس کی پیداوار ہے۔ مگر مجھے

اس سے بہت محبت ہے۔ طویل اور ناقابل شکست انتظار ہی زندگی کی عروجی لذت ہے۔ اسی خیال نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز بنا دیا تھا۔ اور میں اپنے اس اصول سے بہت مطمئن تھا کہ کسی شخص کو بھی اپنی زندگی میں داخل ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ مگر تجربے سے یہ اصول کچھ پائدار ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ آج مجھے کسی ساتھی کی مدد کی بیحد ضرورت تھی میں کسی دوست اور شناسا کے لئے تڑپ رہا تھا مگر جس طرح روٹی میری دسترس سے باہر تھی اسی طرح دوست بھی مجھے دور کسی ان پہنچ خلا میں دھندلی پرچھائیوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور میں کسی طرح بھی اس طویل فاصلے کو جو میرے اور ان کے درمیان حائل تھا دور نہیں کر سکتا تھا۔ روٹی انسان کو ایک دوسرے کے کس قدر قریب کر دیتی ہے اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب مجھے روٹی کی تلاش میں انسانوں سے تعلقات رکھنے کی خواہش ہوئی۔

تین دن سے میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ اور آج تو اس کی بھی امید نہیں تھی۔ کیونکہ پچھلے تین دنوں میں میں بھوک سے بچنے کی فکر میں ان تمام جگہوں پر قسمت آزمائی کر چکا تھا۔ جہاں کوئی ذرا سی بھی جان پہچان [illegible] کیسی جگہ تو مجھے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ کیونکہ جونہی میں [illegible] منہ بنا کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ اب میں [illegible]
مصنوعی طور [illegible]
ایک [illegible]
حالت [illegible]
صاف [illegible]
اٹھ کر [illegible]
[illegible] نے سوچا
[illegible] نے رونا شروع
[illegible] موت ——— ! اور مجھے اس
[illegible] کے لئے آنسو بہانے سے مر جانا

مگر چونکہ میرے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا اس لئے میں نے جدوجہد جاری رکھی۔ حتیٰ کہ تین دن تک میں کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا رہا۔ مگر آج کا دن میرے لئے انتہائی طور پر خوفناک تھا، بھوک آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور روٹی حاصل کرنے کی کوئی تجویز میرے ذہن میں نہیں تھی۔ تمام چیزیں جن کو کبھی میں اپنی جائداد کہہ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ ایک ایک کرکے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں۔ اُدھر مالک مکان بھی کرائے کا باربار تقاضا کر رہا تھا۔ پرسوں جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے بہت سی جگہ عرضیاں بھیج رکھی ہیں بس آج کل نوکری ملتے ہی سارا کرایہ چکا دوں گا۔ تو وہ بے اعتباری کی نگاہوں سے گھور کر کہنے لگا۔ "برخوردار! ایک مہینے سے تمہاری نوکری کی رٹ سن رہا ہوں مگر یہ آج ملتی ہے نہ کل۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرے حال پر رحم کرو اور مکان کسی دوسرے کرایہ دار کے لئے خالی کر دو۔ اس کے عوض ایک مہینے کا کرایہ جو تمہارے ذمہ ہے میری طرف سے بطور نذر قبول کرو"۔ میں اس کے جواب میں کیا کہتا۔ چنانچہ وہ خود ہی دو دن کی مہلت دے کر بڑبڑاتا ہوا چلتا بنا۔ آج کا دن اس لحاظ سے اور بھی زیادہ خوفناک نظر آ رہا تھا کہ شام ہوتے ہی میں اس مکان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ جو اور نہ سہی میری عسرت اور بے خانمانی کا پردہ دار ضرور تھا۔

روشنی اب اچھی طرح پھیل چکی تھی اور سرد ہوا کے جھونکوں میں تازگی کی بُو آ رہی تھی۔ میں بستر سے اٹھا اور انگڑائی لے کر کھڑکی کی طرف گیا۔ اور کہنیوں کے بل باہر کو جھک گیا۔ بازار میں ہماہمی شروع ہو چکی تھی۔ اور اس میں کبھی کبھی کسی کوئلہ گاڑی کی گڑگڑاہٹ اور موٹر کی چیخ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ سڑک پر گزرنے والے زیادہ تر مزدور تھے جن کے چہرے خواب آلودہ اور سنجیدہ تھے۔ اور ان کے درمیان کہیں کہیں ایسے چہرے بھی نظر آ رہے تھے جو نئے کپڑے کے اُن ٹکڑوں کی طرح تھے جن پر سے تھان کے چھاپے کے کاغذ اتار لئے گئے ہوں۔ دکانوں کی قطار کے پچھلی طرف سیرگاہ میں ہری ہری دُوب [illegible]ں کے نیلے پیلے تختے دکھائی دے رہے تھے اور ان کے ساتھ [illegible]ز کا ایک نالہ خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ نالے کے پُل سے [illegible] پڑھیں [illegible] غائب ہوتے ہوئے مردوں اور عورتوں [illegible] قیامت تھی وہ کسی گہرائی میں ڈوب رہے ہیں [illegible] انک پیچھے سے روٹی والے کی [illegible] ٹیوں کا ڈبہ کھولنے

مصروف تھا۔ یکایک مکان کا دروازہ کھلا۔ اور میرا ہمسایہ نیم عریاں حالت میں بدن کے گرد لپٹے ہوئے سیاہ دھاگے کو کھینچتا ہوا باہر نکلا اور دو موٹی موٹی روٹیاں اور مکھن لے کر اندر گھس گیا۔ میرے پیٹ میں جیسے کسی نے جلتی ہوئی لکڑی اُتار دی۔ بھوک پوری طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئی اور میں کھڑکی سے ہٹا، کپڑے پہنے اور باہر نکل گیا۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے میں نے اپنے کپڑوں کو دیکھا تو احساس ہوا کہ باوجود کہ میں انہیں اُتار کر خالی چارپائی پر تقریباً برہنہ سونے کی مشق کر رہا تھا۔ بے حد میلے ہو رہے تھے۔ ہمسائے کے گھر سے گزرتے ہوئے میں نے جھانک کر دیکھا تو اس کی بیوی روٹی کاٹ کر پھینک رہی تھی۔ پانی کے نل پر پہنچ کر میں نے عینک اُتاری۔ منہ دھویا اور بالوں کو گیلے ہاتھوں سے جما کر سڑک پر ہو لیا۔ کچھ دیر تک یونہی بنا سوچے سمجھے چلنے کے بعد وہ ہنگامی احساس جس نے مجھے فوراً گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا ختم ہوا اور میں رُک کر سنجیدگی سے سوچنے کی نیت سے ایک باغ میں داخل ہو گیا۔ دھوپ اچھی طرح چمک چکی تھی اور اس کی شعاعیں درختوں اور پتوں سے گزر کر پھولوں اور لمبے سبز پودوں پر گر رہی تھیں۔ باغ کا ایک کونا ایک گھنی بیل کے چوڑے چوڑے پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر درختوں کی لمبی ٹہنیاں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے سایہ زیادہ سرد ہو گیا تھا۔ درختوں کے درمیان ایک چھوٹے سے حوض میں شفاف پانی باہر کو چھلک رہا تھا۔ میں نے جھک کر چند گھونٹ پیئے اور ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ جو ہوا سے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ نیلے آسمان پر گلابی بادل کا ایک ہلکا سا ٹکڑا تیرتا ہوا گزر رہا تھا۔ پھولوں کے درمیان شہد کی مکھیوں کی مسلسل بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی اور سڑک پر لوگ خاموشی سے گزر رہے تھے۔

میں نے کچھ سوچنا چاہا۔ مگر خالی پیٹ پانی پینے سے معدے میں حدت بڑھ گئی تھی۔ اور سوچنے کی قوت کمزور پڑ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور باغ سے باہر نکل آیا۔ گیارہ بج چکے تھے اور سڑک پر کاروں کے رکنے اور چلنے کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں تانگوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے پیدل چلنے والے گالیاں دیتے اور بڑبڑاتے بھاگ کر کونوں میں ہٹ رہے تھے۔ دکانوں کے اندر جھوٹ اور فریب کی نمائش ہو رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ لوگ ہنستے ہنستے ابھی ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالیں گے۔ بھوک کی وجہ سے میرا دماغ سلگنے لگا۔ [illegible]

خیالات ذہن میں اُبھرتے مگر پھیلنے سے پیشتر ہی دم توڑ دیتے۔ میرے سامنے زندگی لاوے کی صورت رواں تھی جس کے تیز دھارے میں انسان تنکوں کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف بہے جا رہے تھے۔ ان کے بوجھل قدموں کو دیکھ کر زندوں کی چلتی پھرتی قبروں کا گمان ہوتا تھا۔ جب وہ سر اٹھا کر ایک دوسرے کو گھورتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے زمستان کے بھیڑیے بھوک سے تنگ آ کر ٹکٹکی باندھے ہوں میں چلتے چلتے ایک مسجد کے پاس سے گزرا جس کی دیوار کے نیچے ایک فقیر جس کی گھنی ڈاڑھی کسی رنگ کے استعمال سے پیلی ہو رہی تھی بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ حضرت افیمی تھے اور راہ چلتے لوگوں سے پیسے اینٹھنا ان کا پرانا دھندا تھا۔ راہگیروں کو پھانسنے کے لئے وہ ہمیشہ ذو فقرے کہا کرتا تھا۔

"کون جا رہا ہے بھئی؟ ــــ"

"چلے آؤ تمھاری ہی بھلائی کی بات ہے"

اور جب اس کی نصیحت کے باوجود کوئی اپنی بھلائی کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوتا تو وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگتا۔ اس وقت ایک بڈھا آدمی ہاتھ میں ڈبل روٹی لئے اس کی خوشامد کر رہا تھا۔ اور فقیر روٹی لینے کی بجائے اسے موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔

"حرامزدے اُٹھ یہاں سے۔ مجھے تنگ کرتا ہے۔ سؤر کا بچہ"

اور وہ حرامزادہ اور سؤر کا بچہ اس کی گالیوں کو شہد کے گھونٹ سمجھ رہا تھا اور برابر اس کی خوشامد کئے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر التجا اور خوف کے آثار دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آقا کے سامنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ اور اس کا افیمی مالک جس کے گندے کپڑوں کی بدبو سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی اپنی بے نور آنکھیں جھپکاتا ہوا بڑبڑا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ میں چپکے سے آگے بڑھ گیا۔ اس ملک میں ایسے خداؤں کی کمی نہیں جو افیم کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں اور مزدوروں سے محنت کی بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور شاید اسی لئے اس دیس کے باشندے بھوکوں مرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے خداؤں کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

جب میں سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ تو دو تین ہوٹل نظر آئے۔ جن میں کھانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ انھیں دیکھ کر میری بھوک اور بھی چمک اٹھی۔ ہوا میں گرم گرم روٹیوں کی سوندھی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اور اس نے مجھے پاگل سا بنا دیا۔ ہوٹلوں کے باہر چار پانچ نحیف انسان میلے اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں لپٹے سر جھکائے کھڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس طرح کیوں کھڑے ہیں؟ وہ اس طرح زمین کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ ابھی کچھ اُگل دے گی۔ یا پھٹ کر انھیں اپنے آپ میں سمو لے گی۔ مجھے نہ جانے یہ کیوں اچھا لگا کہ وہ زمین سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ ایک آدمی کے پاس پہنچ کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"تمھیں کیا چاہئے؟" اور اس کا جواب سن کر مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس نے میرے سینہ میں خنجر بھونک دیا ہو۔

"روٹی ـــ!" اس نے چونک کر جواب دیا اور جب اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو اس کے زرد گالوں پر آنسو بہ رہے تھے ـــ روٹی ـــ کیا اس ملک میں روٹی آنسوؤں کے مول بکتی ہے؟ اور کیا سڑکوں اور گلیوں میں رینگتے ہوئے یہ انسان رو رو کر جیتے ہیں۔ میں نے غور سے اس کی ٹھوڑی پر کانپتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی چیز کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ مگر کیا انسان آنسو بہا کر روٹی حاصل کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ کیا اس طرح ذلیل ہو کر رہنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے غصہ میں آ کر اس سے کہا۔

"تم روٹی کے لئے روتے ہو نا؟ روؤ اتنے آنسو بہاؤ کہ تمھارا سب کچھ ان میں غرق ہو جائے۔ تم زمین کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہو تم آنسو بہا کر جن سنگ دل خداؤں کا دل نرم کرنا چاہتے ہو وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ کئی صدیوں سے وہ یہاں کا سب کچھ نگل رہے ہیں مگر ان کی بھوک نہیں مٹتی۔ اور تمھاری بھی نہیں مٹے گی کیونکہ یہاں کے خدا انسانوں کو بھوکا مار کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اگر تمھیں زندہ رہنا ہے تو آنسو بہانے کے بجائے خدا بن جاؤ اور پھر تم بھی روٹیوں کے انبار میں دفن ہو سکتے ہو"

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور میں اسے حیرت زدہ چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ غصے اور اشتعال کی وجہ سے میری بھوک اور بھی تیز ہو گئی۔ اور میری آنکھوں میں سیاہ ستارے ناچنے لگے۔ میں نے سوچا کہ کیا انسان اس قدر ذلیل ہو چکا ہے کہ وہ روٹی کے لئے رونا شروع کر دے ـ روٹی اور آنسو ـــ بھوک اور موت ـــ! اور مجھے اس احساس نے کچھ ڈھارس دی کہ روٹی کے لئے آنسو بہانے سے مر جانا کہیں بہتر ہے۔

سڑک سے گزر کر میں ایک وسیع باغ کی طرف ہو لیا اور جب اس میں داخل ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی قبرستان میں داخل ہو رہا ہوں۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ درخت خاموش تھے۔ سبزہ سویا پڑا تھا اور سرخ و سفید پھول حیرت سے نیلے آسمان کو گھور رہے تھے۔ میں سنگ مرمر کے ایک بنچ پر گھٹنوں میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بھوک بڑھتی ہی جا رہی تھی اور روٹی —— روٹی کہاں تھی! میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلا آسمان جس پر سورج چپ چاپ چمک رہا تھا بیرحمی سے زمین کی طرف گھور رہا تھا۔ اور زمین خاموش تھی۔ نہ آسمان سے کچھ برسنے کی توقع تھی۔ نہ زمین سے کچھ اگلنے کی۔ اور بھوک —— میری آنکھوں میں پھر ستارے ناچنے لگے۔ سیاہ ستارے جو آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے۔ رقص کرتے اور تڑپتے اور ان کے ساتھ ساتھ ایک تیز جلن میرے سارے جسم میں پیدا ہو رہی تھی۔ یکایک ستاروں کا ناچ تیز ہو گیا۔ سیاہ ستارے شراروں کے پھول بن کر چمکنے لگے۔ اور دفعتہً ان میں سے ایک پھول ٹوٹ کر میری طرف بڑھا اور اس میں مجھے ایک عجیب و غریب چہرہ نظر آیا اور میں چیخ اٹھا ——

"جیسس کرائسٹ۔!"

اور میری اونگھ ٹوٹ گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو ایک عجیب قسم کا آدمی میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ لمبے لمبے سنہرے بال چھوٹی سی زرد داڑھی اور پیلا چہرہ جس پر ناک اونٹ کے کوہان کی طرح ابھری ہوئی تھی اور پتلے پتلے ہونٹوں میں زیادہ پان چبانے کی وجہ سے سیاہ سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جن کے نیچے بھورے بھورے دانت جھلک رہے تھے۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کیا بڑبڑا رہے تھے بھئی؟" اس نے اس خلوص سے کہا کہ میرا جی چاہا اس سے کچھ نہ چھپاؤں۔

"میں سوچ رہا تھا کہ روٹی کہاں سے مل سکے گی۔ کل رات سے میں بھوکا ہوں۔"

"ہیں" اسے یقین نہ آیا۔ "کل رات سے بھوکے ہو؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا اور اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل وہ مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ نحیف بدن لمبی ناک اور بالوں کے ساتھ چھوٹی سی ڈاڑھی۔ واللہ عجب مضحکہ خیز آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اس کے لہجہ میں خلوص کی بو آ رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں لے گیا۔ اس کی چال میں بھی سا لنگڑا پن تھا مگر اس میں اتنا حسن تھا کہ کئی بار میرا جی چاہا کہ میں بھی اسی طرح چلنے لگوں۔ قہوہ خانے میں خاموشی طاری تھی۔ دفعتہً روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ہوا میں پھیل گئی اور ایک لمحے کے لئے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی ——

روٹی —— میں نے آہستہ سے کہا اور میز پر جھک گیا۔ جب تک میں کھاتا رہا وہ خاموشی سے ایک طرف گھورتا رہا۔ شکل و صورت کی طرح اس کی حرکتیں بھی عجیب تھیں۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو کسی چیز کی بھوک معلوم ہوتی تھی۔ جب میں روٹی کھا چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مزدوروں کا ایک لیڈر ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دن بھر مزدوروں میں کام کرتا ہے اور رات کو شعر کہتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے چند شعر بھی سنائے۔ میں بڑے انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اور اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو جوش کی وجہ سے اسفنج کی طرح سکڑ رہا تھا۔

"میں مزدوروں کا رہنما ہوں۔" اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور مزدور مظلوم اور جاہل ہوتے ہیں۔ میں انھیں اپنے حقوق کے لئے سرمایہ داروں سے لڑنا سکھاتا ہوں۔ اس شہر کے تمام تانگہ ڈرائیور اور مزدور میری بات مانتے ہیں اور میں ان کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہوں۔"

میرے دل میں مقا اس کے لئے تقدس پیدا ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے مضحکہ خیز جسم کے اندر ایک حسین انقلابی روح تڑپ رہی ہے —— اور وہ سنہری روح ہی تو تھی جو اس کے اندر سے بول رہی تھی اور اس کے منہ سے کہلوا رہی تھی کہ —— "میں سرمایہ داروں کا دشمن ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہیں خرید سکتے۔ مزدوروں کے لئے میری جان حاضر ہے اور یہ سرمایہ دار، یہ ظالم کتے، میں ان کے منہ پر تھوکتا ہوں۔ یہ جو زمین کی گندگی ہیں، زندگی کا کوڑھ ہیں اور انسانیت کے جسم پر بدنما داغ ہیں۔ یہ لوگ ہمیں بھوکوں مارنا چاہتے ہیں۔ ہماری لاشیں پھاڑنا چاہتے ہیں۔ ہماری ہڈیاں نوچنا چاہتے ہیں۔ یہ گدھ۔ وحشی کتے ——"

یہ کہتے ہوئے اس کی کنپٹیاں پھڑکنے لگیں اور [illegible] چھوٹی نسیں ابھر آئیں۔ میں نے [illegible] یکلخت میرے ذہن میں [illegible] مزدوروں [illegible] سے [illegible]

کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ دراصل اس کا پیشہ کیا ہے۔ کیا وہ قیمتی شیروانی، طلائی گھڑی اور نئے جوتے خریدنے کے لیے مزدوروں کی لیڈری کے علاوہ کوئی اور دھندا بھی کرتا ہے مگر جیسا کہ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا وہ صرف لیڈر تھا۔ تو پھر یہ قیمتی شیروانی، طلائی گھڑی اور نئے جوتے ——؟ اور میری نگاہوں میں سیکڑوں مزدوروں کے نحیف جسم نمودار ہو گئے جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے نیم برہنہ حالت میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

ابھی میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ ایک تیسرا آدمی چپکے سے قہوہ خانے میں داخل ہوا اور اسے دیکھ کر میرے ساتھی کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہو گئی ——

"کیا خبر لائے بھئی؟" اس نے اجنبی کی طرف متوجہ ہو کر کہا اور مجھے اس کی آواز میں شدید بھوک کا احساس ہوا۔

اجنبی نے گھور کر میری طرف دیکھا اور پھر آگے جھک کر اتنی آہستگی سے جسے میں بڑی مشکل سے سن سکا۔ مزدوروں کے لیڈر سے کہا "مل کا مالک رحمت علی کی موت کا معاملہ دبانے کے لئے تین ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہے۔ میں ابھی اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ مزدوروں کی یونین اس معاملے میں کوئی حصہ نہ لے اور اس نے چند مزدور بھی تیار کر لئے ہیں جو یہ گواہی دیں گے کہ رحمت علی سیٹھ کے دھکے سے نہیں بلکہ اتفاقاً مشین کی جھپٹ میں آ گیا تھا۔"

"مگر تین ہزار تو بہت تھوڑے ہیں۔ کیا وہ بدمعاش ہمیں الو بنانا چاہتا ہے۔" میرے ساتھی نے سرگوشی میں کہا۔ "جاؤ اسے کہو کہ یہ مزدور کی موت کا معاملہ ہے۔ وہ اتنا سستا نہیں چھوٹ سکتا۔ ہم پانچ ہزار سے ایک کوڑی کم نہ لیں گے ——"

آخری الفاظ کہتے وقت اسے شاید اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے اس کی بات سن لی ہے۔ چنانچہ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر ہنسنے کی کوشش کی۔

"ہی۔ ہی۔ ہی۔" وہ ہنسا۔

مگر اس کی ہنسی اس دلال کی سی تھی جو اپنے شرمناک پیشے پر خفیف ہو رہا ہو۔ میں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا چھوٹا سا ذہن ایک بھیانک مشین ہے جس میں مزدوروں کی لاشوں سے ہڈیاں اور گوشت الگ کیا جا رہا ہو۔ وہ شاید بیوپاری تھا مزدوروں کے گوشت اور ہڈیوں کا بیوپاری۔ اور اس بھیانک بیوپار کے عوض وہ اپنی روٹی کماتا تھا۔ روٹی —— اس ملک میں روٹی آنسوؤں کے مول بکتی ہے۔ اس ملک میں روٹی گوشت اور ہڈیوں کے مول بکتی ہے۔ یہاں بیوپاری اور خدا بستے ہیں۔ اور انسان —— انسان کہاں ہے؟ —— روٹی کہاں ہے؟

یکایک میری نگاہوں میں کئی سیاہ ستارے ٹوٹ پڑے۔ قہوہ خانے کے بھیانک سناٹے میں مزدور لیڈر اور فقیروں کی پرچھائیاں ایک دوسرے کو گھورنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بھوک آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

عبدالکریم ثمر

حجاب و تجلی

زندگی کیا اور کس کو زندگی کا ہوش تھا
آدمی کا دل بھی اک ہنگامۂ خاموش تھا

کائنات اک راز تھی اربابِ ہستی کے لئے
تار خود لرزاں تھے لیکن سازِ دل خاموش تھا

یاس سے لبریز تھا محفل میں جامِ زندگی
میں اِدھر بیہوش تھا ساقی اُدھر بیہوش تھا

میرے مرہونِ کرم ہیں تیری عظمت کے نقوش
تو حجاب اندر حجاب آغوش در آغوش تھا

روح یکسر آرزو تھی دل مجسم عرضِ شوق
کہہ رہے تھے حالِ دل وہ میں ہمہ تن گوش تھا

آج فردوسِ محبت بن گیا میرا وجود
میں اسی دن کے لئے شاید تہی آغوش تھا

یہ مری محرومیاں، ناکامیاں، مجبوریاں
میں قفس میں اور گلشن میکدہ بردوش تھا

میری ہستی شعر و نغمہ میری فطرت انقلاب
میں وہ قطرہ ہوں ازل ہی سے جو دریا نوش تھا

پختہ کارانِ محبت کی یہی معراج ہے
میں حضوری میں پہنچ کر اے ثمر خاموش تھا

اظہر امرتسری

آنے والے

دیکھ تو مڑ کے ذرا روٹھ کے جانے والے
پھر نہیں مست ترے ہوش میں آنے والے

ہوشیار اے مجھے ہنس ہنس کے بلانے والے
ہیں یہیں بات کا افسانہ بنانے والے

بھاگتے ہیں مجھے اب دیکھ کے اللہ اللہ
دوڑ کر خود بخود آغوش میں آنے والے

دلِ برباد کے آغوش کا عالم بھی دیکھ
درد بن کر مرے پہلو میں سمانے والے

مجھ کو دنیا میں ملے گی نہ کہیں جائے پناہ
کچھ تو سوچ اے مجھے محفل سے اٹھانے والے

تم کنکھیوں ہی سے کچھ مجھ کو بتاؤ تو سہی
خود ہی افسانہ بنا لیں گے زمانے والے

بات کہنے کی نہیں ہیں یہیں شیخ و واعظ
مسجدیں بیچ کے میخانے بنانے والے

پائمالی کا جنوں ہے ابھی میرے سر میں
ابھی آرام سے بیٹھیں نہ مٹانے والے

پھر بلاتے ہیں ہمیں جانبِ جنت کیا خوب
گندم ابلیس کے ہاتھوں سے کھلانے والے

آپ کی چشمِ جنوں خیز کرے کیوں تکلیف
خود ہی دیوانہ بنا لیں گے بنانے والے

شیخ حاسد نہ کہیں ڈوب مرے کوثر میں
گئے جنت میں اگر پینے پلانے والے

دیکھ کے مجھ کو وہ کہتے ہیں یہی ہیں اظہر
شعر کو درد کا آئینہ بنانے والے

ممتاز حسین لسبل

ہیون سانگ

آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے جب ہندوستان شودر کے لئے ظلم خانہ بنا ہوا تھا اور ذات پات کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی انسانیت دم توڑ رہی تھی کپل وستو کے شاہی محلات میں شمع حقیقت روشن ہوئی اور اس کی باطل سوز کرنوں سے ہندوستان کا ظلمت کدہ جگمگا اٹھا۔ راجہ شدھودن کا بیٹا سدارتھ ہندوستان کا وہ مایۂ ناز فرزند ہے جس کے نام پر انسانیت اور تہذیب ہمیشہ تحسین کے پھول برسائے گی۔ اس نے ہزاروں برس کی ناروا پابندیوں کو توڑا اور نیچ اقوام کو حیات نو بخشی۔ ان دنوں برہمن کا اقتدار ہر شعبے پر غالب تھا۔ مہاراجہ سے لے کر ایک ادنیٰ مزدور تک سب اس کے تابع فرمان تھے۔ وہ ہر ایک کو انگلی کا ناچ نچاتا تھا اور پرماتما کے سنگھاسن کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ راج کمار سدارتھ نے گوتم بدھ کے نام سے ہندوستان میں ایک نئے مت کا پرچار کیا۔ جس کی سادگی و پرکاری نے ہر جگہ کامیابی کا پرچم لہرایا۔ ہمالہ کی برف پوش چٹانیں، ہندوکش کے خطرناک راستے۔ گھاسیا اور گارو کے دشوار پہاڑ، بحر ہند کی ہیبت ناک لہریں اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں اور تھوڑے عرصہ میں جاپان سے لے کر یونان تک تمام ممالک اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے۔

پانچ سو برس تک ہندوستان میں بدھ مت کا دور دورہ رہا اور اس کے بعد برہمنوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ مگر ایشیا کے دوسرے ممالک میں بدستور بدھ مذہب کا سکہ چلتا رہا۔ چین، سنکیانگ، سیام، ملایا سے لاکھوں یاتری ہندوستان میں بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی یاترا کے لئے آئے۔ ان میں سے اکثر پردۂ گمنامی میں روپوش ہیں۔ مگر بعض تاریخ کے اوراق میں حیات دوام حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے ہیون سانگ خصوصیت سے قابل ذکر ہے کیونکہ آج سے تیرہ سو برس پہلے اس نے خطرناک اور دشوار گزار علاقوں میں دلیرانہ سفر کر کے مشاہیر عالم میں ممتاز درجہ حاصل کیا تھا۔

ہیون سانگ سنہ ۶۰۳ء میں چین کے صوبہ ہونان میں پیدا ہوا چونکہ وہ ایک چینی معلم کا بیٹا تھا۔ اس نے پانچ چھ برس کی عمر میں اسے سویانگ کی خانقاہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے ایسی ذہانت کا اظہار کیا کہ تیرہ برس کی عمر میں اسے چیلا بنا لیا گیا۔ ان دنوں چین میں انقلاب سلطنت کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ہواؤں میں انسانی خون کی بو باس بسی تھی۔ فاتح افواج دیہات کو جلا رہی تھیں اور لوٹ مار کر رہی تھیں۔ ان حالات میں ہیون سانگ کی چیلے کی سی حیثیت ختم ہوئی اور بیس سال کی عمر میں وہ بھکشو بنا دیا گیا۔ اس وقت تک چین میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک کر بجھ چکی تھی۔ اور آنگ خاندان کا پہلا بادشاہ کیوسو باقاعدہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ ہیون سانگ دربار شاہی میں حاضر ہوا اور ہندوستان جانے کی اجازت طلب کی۔ تاجدار راہبوں کا مخالف تھا۔ خانہ جنگی کی وجہ سے ملک کی آبادی کم ہو گئی تھی۔ اس لئے بادشاہ راہبوں اور بھکشوؤں کو شادی کرنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ ہیون سانگ کی درخواست نامنظور ہوئی مگر اس کے جوش میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی اور وہ تن تنہا زادِ راہ کی پروا کئے بغیر اس خطرناک سفر کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا۔ چینی تجار کو جب اس کے ارادہ کی اطلاع ملی تو وہ اس کے مذہبی جوش سے ایسے متاثر ہوئے کہ بے اختیار اس کے قدموں پر گر پڑے اور اس کے لئے کافی زادِ راہ مہیا کر دیا۔

ہیون سانگ اپنے دو چیلوں کے ہمراہ رات کو شہر سے چوری نکل گیا۔ وہ تینوں رات کو سفر کرتے اور دن کے وقت کسی جگہ چھپ رہتے۔ اس طرح وہ دارالحکومت لانگ چو سے سو میل دور کوا چو پہنچ گیا۔ وہاں اس کا گھوڑا ایک پہاڑی راستے پر پھسل کر مر گیا جس کی وجہ سے اسے مجبوراً رکنا پڑا۔ وہاں اس نے

واقفکار اشخاص سے ہندوستان کے راستہ کے متعلق دریافت کیا اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ پہلے میں ایک ایسا دریا آتا ہے جس کی تیز رفتاری کی وجہ سے اُسے کشتی میں بیٹھ کر عبور نہیں کر سکتے دریا کے پار ایک خندق ہے جسے گزرنا ناممکن ہے۔ اُس سے پرے سرحدی قلعوں کی قطار ہے جہاں محافظوں کی تیز نگاہوں سے بچ نکلنا دشوار ہے۔ قلعوں سے پرے ایک ویرانہ ہے جس میں سینکڑوں میلوں تک پانی کی بوند اور گھاس کا تنکا تک دکھائی نہیں دیتا۔

ہیون سانگ ان مشکلات پر غالب آنے کی تدابیر سوچ رہا تھا کہ شہنشاہ کیوسو کا ایک خاص ایلچی کواچو کے حاکم کے نام ایک فرمان لایا۔ اُس میں لکھا تھا ہیون سانگ کو پکڑ کر دربار میں بھیج دو۔ کواچو کے گورنر نے ہیون سانگ کو بلایا اور اُس کی گفتگو سے ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے خود اُس کے لئے گھوڑا مہیا کیا اور بھاگ جانے میں اُسے مدد دی۔ راستہ کی دشواریوں کی خبر سُنکر ہیون سانگ کے دونوں چیلے کواچو میں رہ گئے اور وہ تن تنہا اپنے جوان دل کو اپنا رہبر بنا کر ہندوستان کی جانب روانہ ہوگیا۔ پہلی منزل میں اُس کی ملاقات ایک جنگلی سے ہوئی جو راہب بننا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ سرحدی قلعوں تک ہمارے یاتری کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوگیا۔ اُسی روز ہیون سانگ ایک بوڑھے چینی سوداگر سے ملا جو تیس بار کواچو اور سمرقند کے درمیان سفر کر چکا تھا۔ اُس نے راستہ کی دشواریوں کے عجیب و غریب واقعات سُنائے اُس نے بیان کیا کہ سرحدی قلعوں سے پرے ایک وسیع ویرانہ ہے جس میں کہیں ریت کے متحرک تودے پیام موت بنتے ہیں۔ اور کہیں گرم آندھیاں موت کی نیند سُلا دیتی ہیں۔ وہاں بڑے بڑے قافلے راستہ بھول جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ کے لئے اُس خوفناک صحرا کی وسعتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آدمی کے لئے وہاں سفر کرنا گویا زندگی سے ہاتھ دھونا ہے۔ مگر ہیون سانگ نے سُنی اَن سُنی کردی اور اپنے ارادے پر اٹل رہا۔ آخرکار سوداگر نے اپنا گھوڑا جو کئی بار اُس پُرخطر راستہ پر سفر کر چکا تھا ہیون سانگ کو دے دیا اور جنگلی کو رخصت کر کے وہ بوڑھے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

دونوں شام کے قریب دریا کے کنارے پر آئے۔ دریا کی تند لہریں شور مچاتی اور جھاگ اڑاتی بہہ رہی تھیں۔ جنگلی نے ایک جگہ جہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا شاخوں کا ایک پل بنایا اور اُس پر مٹی کی تہہ بچھا دی۔ پھر اُس نے گھوڑوں کو ایسا مہمیز کیا کہ وہ ایک ہی جھپٹ میں اُس سے پار ہوگئے۔ دوسرے دن وہ دونوں سرحدی قلعوں کی قطار تک جا پہنچے اور جنگلی حسب وعدہ واپس چلا گیا۔

اب ہیون سانگ تن تنہا گوبی کے وسیع ریگزار میں سفر کر رہا تھا۔ جا بجا ہڈیوں کے ڈھیر راہ گم کردہ قافلوں کے حسرتناک انجام کا پتہ دے رہے تھے۔ آخرکار اُس نے دور اُفق میں قلعہ کے ایک برج کو اُبھرتے ہوئے دیکھا اور ریت کے ایک ڈھیر کی اوٹ میں چھپ گیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ پانی لینے کے لئے رینگ کر قلعہ کی دیوار کے پاس آیا۔ جب وہ اپنے چمڑے کی تھیلی میں پانی بھر رہا تھا تو تیروں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ اُس نے چلا کر کہا کہ میں راہب ہوں اور لانگ چو سے آیا ہوں۔ سپاہی اُسے پکڑ کر قلعہ کے پاس لے گئے اور اُس کی مہربانی سے یاتری کی رات آرام سے گزری۔

دوسرے دن وہ دوسرے قلعہ تک جا پہنچا۔ وہاں بھی اُس کی آؤ بھگت تیروں سے ہوئی۔ مگر آخرکار قلعہ کا محافظ دستہ اُس کا گرویدہ بن گیا۔ اور اُس کی خوب آؤ بھگت کی۔

اس کے بعد وہ ایک ایسے ویرانہ میں داخل ہوا جس میں حد نگاہ تک زرد ریت کے ڈراؤنے ٹیلوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس کا پانی ختم ہوگیا۔ گھوڑا راستہ بھول گیا۔ چار دن اسی حالت میں گزرے۔ اُس کا جسم تھکان سے چور چور تھا۔ انجام کار سوار اور گھوڑا دونوں تھک کر زمین پر گر پڑے۔ موت قریب تھی کہ اچانک صحرا میں ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چلنے لگی۔ جس میں پانی اور سبزہ کی خوشبو شامل تھی تھوڑی دیر میں وہ دونوں ایک سبزہ زار میں پہنچ گئے۔ جو غیر آباد تھا۔ وہاں ایک دن کے آرام نے سوار اور گھوڑے کو تازہ دم کر دیا اور تیسرے دن ہیون سانگ صحرائے گوبی کو عبور کر کے ترکستان کے مرغزاروں میں داخل ہوگیا۔

ترک ان دنوں بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ اس لئے ہر جگہ اُس کا دھوم دھام سے استقبال ہوا۔ سب سے پہلے وہ ترفان

پہنچا وہاں کے بادشاہ نے بڑے ادب سے اس کا خیر مقدم کیا اور ایک قیمتی خیمہ میں ٹھہرایا۔ شاہ اور ملکہ دن رات اُس کی خدمت میں حاضر رہتے اور ترکستان کا اپنے ہاتھ سے اُسے کھانا کھلاتا۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ ہیون سانگ اُس کی اُجڈ رعایا کی تربیت کے لئے مستقل طور پر ترخان میں مقیم ہو جائے۔ مگر یاتری نے انکار کیا اور جب بادشاہ نے مجبور کیا تو اُس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اس پر راج ہٹ کو مجبور ہو کر ہتھیار ڈالنے پڑے اور ایک ماہ کے قیام کے بعد ہیون سانگ اپنے سفر پر دوبارہ روانہ ہوا۔ شاہ ترخان نے اُسے سونے چاندی کے بے شمار ٹکڑے اور قیمتی کپڑے کے پانچسو تھان نذر کئے اور مسلح محافظ اُس کے ہمراہ بھیجے تاکہ راستہ میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

کئی روز سفر کرنے کے بعد وہ کاشار پہنچا۔ وہاں اُن دنوں دس بدھ خانقاہیں تھیں۔ حاکم شہر نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد ہمارا یاتری بلخ پہنچ گیا۔ شہر کے صدر دروازے پر بدھ راہبوں کی ایک جماعت اُس کی منتظر تھی۔ اُنہوں نے اُس پر پھولوں کی برکھا کی اور بادشاہ اُسے اپنا مہمان بنا کر شاہی محل میں لے گیا۔ چونکہ اب پہاڑی علاقہ کا سفر درپیش تھا۔ اس لئے ہیون سانگ برف پگھلنے تک وہیں ٹھہرا رہا اور آخر کار جب موسم بہار شروع ہوا تو بادشاہ نے بڑی شان سے اُسے الوداع کہی۔ اُس کے ہمراہ مسلح محافظ تھے جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے۔ اُن کی معیت میں چینی یاتری تیسرے دن کوہ ہندوکش کے دشوار گزار سلسلہ تک پہنچ گیا۔ وہ اُن پہاڑوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"وہاں روزِ ازل سے برف جمع ہے۔ نظر کے سامنے چمکدار برف کے تختے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ گویا اُن کا کوئی کنارا نہیں ہے۔"

ان پہاڑوں کو عبور کرنے میں سات دن لگے اور اُس کے چودہ ہمراہی اس کوشش میں جان سے مارے گئے اور اُن سے دوگنی تعداد بار برداری کے مویشیوں کی ہلاک ہوئی۔ اور اس کے بعد وسط ایشیا کا میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔

چند روز سفر کرنے کے بعد ہیون سانگ ایک خانہ بدوش حکمران کے علاقہ میں داخل ہوا جس نے اُس کا بڑے تپاک سے استقبال کیا اور اُسے ایک وسیع خیمہ کے نیچے ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ اُس کے پہلو میں خان ایک سادہ تپائی پر بیٹھا تھا۔ سامنے چٹائی پر شاہی عہدہ دار رنگین ریشمی لباس میں ملبوس قطار در قطار بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بادشاہ کا محافظ دستہ سبز ساٹن کی خوبصورت وردی پہنے تھا۔ معزز مہمان کی آمد کی خوشی میں شراب لائی گئی اور دور چلنے لگا۔ شراب کے بعد بھنا ہوا گوشت لائے۔ مگر ہیون سانگ کو چاول روٹی ملائی دودھ اور انگور مہیا کئے گئے۔ مذکور خان نے ہیون سانگ کو ہندوستان جانے سے روکا اور کہا وہ ملک بہت گرم ہے تم کمزور ہو تمہیں وہاں ہرگز نہیں جانا چاہئے یاتری نے جواب دیا "میں بدھ کی جنم بھومی دیکھنا چاہتا ہوں اگر اس کوشش میں مجھے موت آ جائے تو میں خوشی سے اسکا خیر مقدم کرونگا۔"

وہاں سے چل کر ہیون سانگ سمرقند آیا۔ وہاں کا بادشاہ بڑا مغرور تھا۔ اُس نے چینی یاتری کی کوئی پرواہ نہ کی۔ مگر ہیون سانگ دبنے والی اسامی نہیں تھا۔ وہ بادشاہ کے پاس گیا اور تھوڑی سی بات چیت کے بعد اُسے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ سمرقند میں ہمارے سیاح کو ایک ایسا آدمی ملا جو ہندوستان کا راستہ جانتا تھا اور دوسرے دن وہ دونوں ایک خاص قسم کی گاڑی میں سوار بلخ کی جانب جا رہے تھے۔ برسات کا موسم ہیون سانگ نے کابل میں بسر کیا۔ افغانستان میں جلال آباد کے ضلع میں نگرہار کے قریب ایک غار ہے جس کی بابت بدھوں میں مشہور ہے کہ ایک خاص رات کو وہاں بدھ کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔ ہیون سانگ نے کئی راتیں اُس غار میں آنکھوں میں کاٹیں اور آخر کار اُس نے بدھ کو اپنے پرشکوہ دربار میں دیکھ لیا۔ مگر عین اُس وقت خدام غار میں خوشبو جلانے کے لئے آ گئے اور وہ جلوہ غائب ہو گیا۔

برسات کا موسم ختم ہونے پر وہ ہندوستان کی جانب چلا اور بلند پہاڑوں اور خطرناک ندیوں کو عبور کرتا ہوا کشمیر پہنچا وہاں ہندوستان کا دور دورہ تھا۔ راجہ یا اُس کے برہمنوں نے چینی یاتری کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُس کی بڑی عزت افزائی کی۔ ہیون سانگ ایک مندر میں ٹھہرا۔ جب کشمیر کے راجہ کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ اُس سے ملنے آیا۔ اُس پر پھول برسائے اور اُسے ہاتھی پر بٹھا کر اور خود اُس کے پیچھے پیادہ پیدل سفر کرتا ہوا محل تک آیا۔ چینی یاتری دو سال کشمیر میں ایک زندگی

کے قدموں میں بیٹھ رہا اور اس سے اشرا میں سنسکرت زبان سیکھ کر بدھ مت کی مقدس کتب کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد وہ پنجاب میں آیا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اُسے بہت سے جنگلوں سے گزرنا پڑا جو وحشی ہاتھیوں اور خونخوار درندوں سے بھرے تھے۔ ایک جگہ لٹیروں کے ایک گروہ نے اُسے گھیر لیا۔ ہیون سانگ کے ہمراہ ایک برہمن تھا اُس نے زور سے سنکھ بجایا۔ قریب ایک بستی سے کچھ آدمی دوڑتے آئے اور ڈاکو بھاگ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ لاہور پہنچا وہاں اُسکا جلوس نکالا گیا اور برہمنوں نے اُس کی بڑی عزت کی۔ لاہور سے چل کر وہ دہلی اور متھرا ہوتا ہوا ہردوار گیا۔ مغربی روہیلکھنڈ کے علاقہ میں وہ ایک مقام کا ذکر کرتا ہے جہاں صدیوں سے ایک عورت حکمران ہے اور سلسلہ وراثت مادرانہ طریقہ پر ہے۔

جس زمانہ میں ہیون سانگ بدھ مت کے قدیمی نوشتوں کی کھوج میں ہندوستان آیا تھا یہاں مہاراجہ ہرش کی حکومت تھی۔ اور دکھن میں راجہ پلی کیشن حکمران تھا ہرش نے چینی یاتری کو اپنی راجدھانی قنوج میں بُلا بھیجا۔ اور وہ مدتوں اُس ذیشان مہاراجہ کے دربار میں مقیم رہا۔ اس کے اثر سے ہرش نے بدھ مت کو قبول کر لیا۔ مگر اشوک کی طرح اُسے شاہی مذہب قرار دے کر اُسکی اشاعت کی کوشش نہیں کی۔

قنوج میں کافی عرصہ قیام کرنے کے بعد ہیون سانگ ایودھیا (اودھ) کی طرف گیا۔ وہ اَسّی خادموں کے ہمراہ دریائے گنگا میں ایک کشتی میں بیٹھ کر سفر کر رہا تھا کہ لٹیروں کے ایک گروہ نے چھاپا مارا۔ وہ ڈاکو درگا دیوی کے پجاری تھے اُنہوں نے ہیون سانگ کو دیوی کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بدبخت چھریاں تیز کر رہے تھے اور پوجا کا سامان لا رہے تھے۔ مگر ہیون سانگ بالکل خاموش اور مطمئن تھا۔ اچانک ایک غضبناک طوفان ظاہر ہوا جس سے ڈاکو ڈر گئے اور ہیون سانگ کے پاؤں پر آ گرے۔ اُس نے انہیں ایسے طریقے سے سمجھایا کہ وہ بھینٹ کے سامان کو دریا میں پھینک کر چلے گئے اور جاتے وقت بے شمار زر و جواہر اُس کی نذر کر گئے۔

اس خطرناک حادثہ کے چند روز بعد ہیون سانگ پریاگ (الٰہ آباد) پہنچا اور وہاں سے بیابان اور خطرناک جنگلوں میں سفر کرتا ہوا کپل وستو پہنچا۔ بدھ کی جنم بھومی میں برہمن مت عروج پر تھا۔ اور بدھ مت کے مندر اُجاڑ پڑے تھے۔ کاشی (بنارس) میں اُس نے سادھو دیکھے جو سر منڈاتے اور ننگے سر رہتے تھے۔ وہاں ایک نیا عقیدہ اُس کے مشاہدہ میں آیا۔ بعض اشخاص گناہوں کے کفارہ کے لئے سات دن بھوکے رہ کر گنگا میں ڈوب مرتے تھے۔

جب ہیون سانگ کاشی میں مقیم تھا تو نالندہ کے مشہور دارالعلوم کی جانب سے اُسے مدعو کیا گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اُسکا دھوم دھام سے استقبال ہوا۔ دو سو راہبوں نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اُس کی تعریف میں قصائد پڑھے اور اُس پر پھول برسائے۔ دوسرے دن وہ مہاگرو سیلا بھدرا کے سامنے پیش ہوا۔ مہاگرو کے سامنے جاتے وقت معمول کے مطابق اُسے گھٹنوں اور کندھوں کے بل چلنا پڑا۔ مہاگرو نے چینی یاتری کو خیر باد دی اور وہ پورے پانچ سال مذکورہ دارالعلوم میں مقدس کتب کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ نالندہ سے چینی یاتری گیا جی پہنچا اور بھاگلپور میں اُس نے ایک خانقاہ دیکھی جس کے متعلق اُسے ذیل کا افسانہ سنایا گیا۔

"جنوبی ہند سے یہاں ایک راہب آیا جس کے سر پر ایک مشعل روشن تھی اور پیٹ کے گرد تانبے کے چمکدار حلقے تھے۔ جب اُس سے اُن کے متعلق پوچھا گیا تو اُس نے جواب دیا کہ مشعل جاہل عوام کے دلوں کو روشن کرنے کے لئے ہے۔ اور پیٹ کے حلقے حفاظت ذات کے لئے ہیں تاکہ وہ دانائی کی کثرت سے پھٹ نہ جائے۔ بہت سے لائق آدمیوں نے اُس سے بحث کی مگر وہ سب پر غالب آیا۔ آخر ایک بدھ راہب نے اُسے خاموش کیا۔ راجہ پر اس فتح کا ایسا اثر ہوا کہ اُس نے یہاں ایک خانقاہ بنوا دی۔"

بھاگلپور سے ہیون سانگ کالنگا (اڑیسہ) گیا اور وہاں سے کونجی ورم پہنچا جو دراوڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ مدت دراز وہاں قیام کرنے کے بعد وہ مہاراشٹر پہنچا۔ مرہٹوں کے متعلق ہیون سانگ لکھتا ہے:-

"مرہٹے نہایت [illegible] سادہ طبع ہیں۔ [illegible] دشمن کو

چھوڑا کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی میدان جنگ سے بھاگ نکلے تو اُسے براہ راست سزا نہیں دیتے بلکہ اُسے عورت کا لباس پہنایا کرتے ہیں جس سے وہ شرمسار ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ سپاہی شراب پی کر لڑتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھیوں کو بھی شراب پلاتے ہیں۔

مہاسشٹر سے ہیون سانگ مالوہ کی جانب چلا گیا۔ ساحل کورومنڈل پر سفر کرتے ہوئے اُس نے ایک جزیرہ کی بابت سنا جس میں محض عورتیں آباد ہیں۔ وہ اشاروں سے ملاحوں اور سوداگروں کو بھرما لیتی ہیں اور اُنہیں بہکا کر اپنے لوہے کے شہر میں لے جاتی ہیں۔ جہاں وقت فرصت اُنہیں چٹ کر جاتی ہیں۔

مالوہ سے چینی یاتری سندھ گیا اور وہاں سے ملتان آیا۔ ملتان میں اُس نے سورج دیوتا کا مندر دیکھا جس کا بت سونے کا تھا۔ اور اُس میں لاتعداد جواہرات جڑے تھے۔

انجام کار یہ اولوالعزم سیاح کاشغر اور ختن کے راستے اپنے وطن کو واپس آیا۔ وہ ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا اور سنہ ۶۴۴ء تک یہاں رہا اور جاتے وقت حسب ذیل اشیا اپنے ہمراہ لے گیا۔

۱۔ بدھ کی راکھ کا تبرک۔
۲۔ بدھ کی دو سونے کی مورتیاں۔
۳۔ بدھ کی تین صندل کی مورتیاں۔
۴۔ بدھ کی ایک چاندی کی مورتی۔
۵۔ بدھ مت کے متعلق قلمی کتابیں جو ۲۲ ٹٹوؤں پر لدی ہوئی تھیں۔

ہندوستان کے متعلق ہیون سانگ کی رائے حسب ذیل ہے:۔

۱۔ عام حالت:۔ رعایا خوش حال اور فارغ البال ہے۔ عوام تعلیم یافتہ، مہذب، بلند خیال اور مہمان نواز ہیں۔ سنسکرت زبان عام ہے۔ ملک میں جا بجا مسافروں کے آرام کے لئے مسافر خانے ہیں۔ مگر راستے لٹتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں شفاخانے ہیں جہاں دوا اور خوراک مفت ملتی ہے۔ سڑکیں عام ہیں اور ان پر سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔

۲۔ نظام حکومت:۔ پیداوار کا چھٹا حصہ بطور مالیہ وصول کیا جاتا ہے۔ فوجداری قوانین سخت ہیں۔ سنگین جرائم کی پاداش میں ہاتھ پاؤں، ناک، کان کاٹ دیئے جاتے ہیں۔

۳۔ مذہب:۔ ہندو مت عروج پر ہے۔ اور بدھ مت کو زوال آ رہا ہے۔ عوام کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔

خمار بارہ بنکوی

اعجاز تصوّر

ہر اک شے پہ مجھے اُن کا گماں ہے
تصوّر اب خدا رکھے جواں ہے

غمِ دنیا بہت ایذا رساں ہے
کہاں ہے اے غمِ جاناں کہاں ہے

وہ کانٹا ہے جو چبھ کر ٹوٹ جائے
محبت کی بس اتنی داستاں ہے

اسے کچھ اہلِ دل ہی جانتے ہیں
ہنسی ہے میرے لب پہ یا فغاں ہے

یہ مانا زندگی فانی ہے لیکن،
اگر آ جائے جینا جاوداں ہے

اُسے کس دل سے تکلیفِ کرم دیں
یہ کیا کم ہے کہ وہ ایذا رساں ہے

اک آنسو کہہ گیا سب حال دل کا
میں سمجھا تھا یہ ظالم بے زباں ہے

خمار اے کاش ان سے کوئی کہہ دے
کہ آ جائیں، ابھی آنکھوں میں جاں ہے

شفیق الرحمٰن

چنگاریاں

میں نے اپنا سامان ویٹنگ روم میں رکھوا دیا اور خود پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ میری ٹرین علی الصبح آتی تھی اور اب رات کے صرف نو بجے تھے۔ کافی سردی تھی میں اوورکوٹ لینے اندر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کمار اور بشیر اندر بیٹھے ہیں ——" ارے! تم کہاں ؟"

ہم ایک دوسرے سے مل ہی رہے تھے کہ اتنے میں دروازہ کھلا دیکھا تو لطیف صاحب چلے آرہے ہیں۔ "نالائقو! تم تینوں کہاں پھر رہے ہو؟" —— خوب قہقہے لگے۔

کتنا عجیب اتفاق تھا ہم چاروں دوست ایک دوسرے سے دُور دُور رہنے کے باوجود چند مہینے کے بعد کہیں نہ کہیں کچھ دیر کے لئے اکٹھے ضرور ہو جاتے تھے۔ اکثر کسی سٹیشن پر ملاقات ہوتی تھی۔

ہم چاروں کی گاڑیاں مختلف تھیں۔ ہم مختلف سمتوں میں جارہے تھے لیکن وہ رات ہمیں ان کمروں میں بسر کرنی تھی۔

اب جو باتیں شروع ہوئیں تو کھانے کا بھی ہوش نہ رہا۔ کھانا کھا کر ہم انگیٹھی کے سامنے بیٹھ گئے اور کافی کا دَور چلنے لگا۔ ہم چھ ماہ کے بعد ملے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ موضوع وہی تھا جو تقریباً سب نوجوانوں کا مخصوص موضوع ہے —— یعنی محبت —— آخر یہ طے ہوا کہ ہر ایک باری باری اپنی داستان سنائے۔ یعنی ان چھ مہینوں کا سب سے رنگین واقعہ۔

پہلے کمار کی باری تھی۔ ایک سال پہلے کمار کہیں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ نہایت حسین تھی۔ پھر ہم نے سنا کہ اس کی شادی نہیں ہو رہی۔ لڑکی نے انکار کر دیا —— یا خدا جانے کیا ہوا ——؟

بشیر بولا۔ "کمار سے کیا پوچھتے ہو، مجھ سے پوچھو میں اس کی داستان سناتا ہوں۔ جب سے پشپا نے انکار کیا ہے یہ روز بروز نالائق ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تو پہلے اس کی معصومیت اور پارسائی کا دُور دُور چرچا تھا، اور کیا اب یہ ہر جگہ پھسل جاتا ہے۔ ہر ایک کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگتا ہے۔ جن دنوں پشپا اسے اُلو بنا رہی تھی۔ اُن دنوں ایک لڑکی موہنی بھی اسے چاہتی تھی۔ لیکن موہنی اور پشپا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جتنی پشپا حسین تھی اتنی ہی موہنی بدشکل تھی میرے خیال میں موہنی میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ اور یہ پچھلے چند مہینے سے موہنی کا دیوانہ ہے۔ دو دو تین تین دن کی چھٹی لے کر بہانے کر کر کے، کسی نہ کسی طرح اس کے پاس جا ہی پہنچتا ہے۔ اسے طرح طرح کے تحفے بھیجتا ہے۔ ہر روز خط لکھتا ہے۔ حالانکہ اس لڑکی سے تو یہ خود کہیں خوبصورت ہے۔ لیکن نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔"

"کیوں بھئی کمار ——؟" میں نے تکلفاً پوچھا۔

کمار بولا —— "بھئی سچ پوچھو تو میرا اس محبت وحبت سے عقیدہ اُٹھ چکا ہے۔ میرے خیال میں ہم کسی خاص لڑکی سے محبت نہیں کرتے۔ بس لڑکی سے محبت کرتے ہیں۔ خواہ کوئی ہو۔ زندگی میں جو لڑکی سب سے پہلے ملتی ہے ہم اسی پر مرمٹتے ہیں اور اُسے یقین کرا دیتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے فقط اُسی کا انتظار رہا ہے حالانکہ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی۔ تب بھی ہم بالکل وہی باتیں اس سے کہنے بیٹھ جاتے۔ اور لڑکے کا کیا ہے۔ گراموفون میں چابی بھری ہوئی ہے۔ ذرا چلایا اور بجنا شروع ہو گیا۔ بس ایک اشارے کی دیر ہے۔ وہی ریکارڈ بار بار بجتا ہے۔ وہی اظہارِ محبت کے منتخب الفاظ بار بار مُنہ پر آ جاتے ہیں۔ مجھی کو لو۔ میں نے موہنی سے بالکل وہی باتیں کی ہیں جو کبھی پشپا سے کی تھیں، ویسے ہی تحفے اسے دیئے ہیں وہی نازبرداریاں کی ہیں، اور مجھے ذرا سا افسوس بھی نہیں۔ چند روز ہوئے میں نے پشپا کو دیکھا تھا۔ مجھے اب اس کی صورت سے نفرت ہے۔ وہ مجھے اس قدر بُری معلوم ہوئی کہ میں وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اب مجھے محبت سے بھی نفرت ہے یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ اس میں حقیقت نام کو بھی نہیں۔ لیکن یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ تمھارا کیا بنا ؟"

"میں ابھی تک منتظر ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"کس چیز کے منتظر ہو؟ ان کے خط کے، یا ان کی توجہ کے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں، لیکن میں منتظر ضرور ہوں ——— اور منتظر رہوں گا۔"

"شاباش! اگر تم ایسے چند اور عاشق اکٹھے ہو جائیں تو ایک نئی الف لیلیٰ تیار ہو سکتی ہے ——!" کمار بولا۔

پھر وہ سگریٹ کے جھونک کے بعد بشیر اپنا قصہ سنانے لگا۔ "یہ دہلی کا ذکر ہے۔ سٹیشن پر جب شام کو گاڑی رکی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسی وقت ایک مخالف سمت سے ٹرین آکر ٹھہری تھی اور عین میرے مقابل ایک بے حد حسین چہرہ کھڑکی میں دکھائی دیا۔ میں اسے فقط چند لمحوں کے لئے دیکھ سکا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا۔ مجھے آگے جانا تھا۔ مجھے ٹرین میں جگہ نہ مل سکی، رات کو سٹیشن پر ٹھہرنا پڑا۔ میں ویٹنگ روم میں پہنچا۔ جو دیکھتا ہوں تو وہی چہرہ سامنے ہے۔ جسے میں نے ریل میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے ابا، امی اور تین چار بہن بھائی تھے۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ میز پر رکھے ہوئے ایک سوٹ کیس کی آڑ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک اخبار اٹھا لیا اور اس کی اوٹ میں ہو کر بیوقوفوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ ہم دونوں کتنی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اتنی دیر شاید نہ میری آنکھ جھپکی اور نہ اس کی۔ وہ نہایت ہی حسین لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حسن کے علاوہ معصومیت بھی تھی اور تمکنت بھی تھی۔ ایسی حسین لڑکی میں نے مدت سے نہ دیکھی تھی۔ میں دہلی اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا۔ لیکن اب وہاں سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ ایسا نشہ میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ کیا کسی طرح اس سے باتیں بھی ہو سکتی ہیں؟ اتنی پیاری لڑکی کی باتیں کس قدر پیاری ہوں گی۔ لیکن باتیں کیونکر ممکن ہو سکتی ہیں! اس کے ابا اور امی جو ساتھ ہیں۔ اگر میں آج اس سے باتیں نہ کر سکا اور کل ہم جدا ہو گئے تو مجھے عمر بھر اس کا پچھتاوا رہے گا۔ کیا مجھے کوئی موقع نہ مل سکے گا؟ کیا میں پیاسا ہی دریا سے لوٹا دیا جاؤں گا؟

میری پیشانی جلنے لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے آتشیں تتلیاں ناچنے لگیں۔ جیسے کسی نے مجھے شعلوں میں دھکیل دیا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج اس سے ضرور ملوں گا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اور پھر اس ملاقات کو میں ایک حسین یاد بنا کر سینے میں محفوظ رکھوں گا۔

وہ سب ڈنر لینے یا معلوم نہیں کہاں ٹہلنے چلے گئے۔ میں ڈرتے ڈرتے وقفے کے بعد گیا لیکن وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ میں اس کے قریب نہ بیٹھ سکا۔ جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ وہ سب پھر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کسی سینما میں سکندر خود دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہ بھی تیار معلوم ہوتی تھی۔ میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھوں آنکھوں میں التجائیں کرنے لگا۔ میری نگاہیں اس سے کہہ رہی تھیں۔ —کاش! تم یہاں ٹھہر جاتیں۔ کاش تم ان کے ساتھ نہ جاتیں۔ پھر ہم نزدیک بیٹھ کر ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھتے۔ اور اس وقت اگر ہمیں تنہائی میسر ہوتی تو میں اس کی گود میں سر رکھ دیتا اور کہتا کہ اے میری روح مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تجھے بالکل نہیں جانتا۔ میں نے تجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

دفعتہً اس نے اپنی امی سے کچھ کہا۔ وہ معذرت کر رہی تھی۔

"میرے سر میں شدید درد ہے امی! مجھے وہاں ذرا لطف نہ آئے گا بلکہ آپ سب کو ناحق پریشان کروں گی۔"

پہلے تو وہ لوگ نہ مانے۔ اس کے ابا اسے مجبور کرتے رہے لیکن وہ مُصر رہی۔ میں باہر آگیا۔ شاید اس وقت میری موجودگی انہیں ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میں بے قراری اور انتظار کے عالم میں باہر ٹہلنے لگا۔ حتیٰ کہ میں نے انہیں باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے ابا، امی، دو بچیاں اور ایک چھوٹا لڑکا —— بس! تو گویا وہ نہیں جا رہی، وہ اندر ہی ہے۔ میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ میرے ہونٹ سوکھ گئے۔ میرے اللہ! اب میں بارگاہِ حسن میں کیا نذرانہ لے کر جاؤں۔ میں کیونکر وہاں حاضر ہو سکوں گا! اس حسین شعلے کے نزدیک کیسے جاؤں! جھجک تھی، ڈر تھا، رعب طاری تھا۔ جب میں اندر گیا تو وہ میری منتظر تھی۔ ہم دونوں مسکرائے۔ وہ بدستور مجھے دیکھ رہی تھی لیکن اب ان نگاہوں میں ڈر بالکل نہیں تھا۔ ہم دونوں وہاں اکیلے تھے لیکن نوکر، قلی اور بیرے بھاگتے پھر رہے تھے۔ ان کا شور مخل ہوتا تھا۔

میں نے کہا —— "چلئے باہر چلیں!"

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں۔" میں اسے برآمدے میں لے گیا۔ "وہ دیکھئے، سڑک کے اس پار وہ جو باغ ہے وہاں ——!"

"اور جو ابا آ گئے تو ——؟" اس نے پوچھا۔

"ابا بارہ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ اور ہم اس سے پہلے واپس آ جائیں گے۔"

اس نے کچھ اس انداز سے مجھے دیکھا کہ اس کی نگاہیں اداؤں کو چیرتی

ہوئی چلی گئیں۔ ذرا سی دیر میں ہم سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔

سڑک کو عبور کر کے ہم باغ میں پہنچے۔ اگرچہ وہاں روشنی کافی تھی، لیکن شور کم تھا۔ آخر ہمیں ایک تنہا سا گوشہ مل گیا۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ ہم نے وہاں اڑھائی گھنٹے گزار دیئے۔ خوب خوب باتیں ہوئیں بار بار ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا۔ اپنی بے انتہا محبت کا یقین دلایا۔ اس قدر دل آویز لمحے میری زندگی میں پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ قدرت مجھ پر اتنی مہربان کبھی نہ ہوئی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی سے مایوس تھی، یا اس نے کوئی چوٹ کھائی تھی۔ یا اسے میں بیحد پسند آ گیا یا ماحول ہی کچھ ایسا تھا۔ سفر میں ایک مختصر سا قیام، ایسے عجیب حالات میں ملاقات۔ جھلملاتے ہوئے قمقموں کے نیچے نگاہوں کا پیغام، اور پھر رنگین، اور لذّت آگین کی حالتیں، جب ہم دونوں پودوں میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس پر بُری طرح عاشق ہو گیا ہوں۔ میں اس سے دیوانہ وار محبت کرتا ہوں، میں بغیر اس کے اب ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُدھر وہ بھی مجھے ایسی ہی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، ایسی کھوئی کھوئی نگاہوں سے جیسے وہ سب کچھ ہار بیٹھی ہو۔ اچانک ہمیں وقت کا خیال آ گیا اور ہم فوراً لوٹ آئے۔ میں اسے چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے آیا اور آمی وغیرہ آ گئے۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر اندر گیا اور سو رہا۔ علی الصبح اٹھتے ہی سامان کی فکر پڑی۔ گاڑی کا وقت، اپنی نشست کا خیال، کچھ ایسی گڑبڑ مچی کہ میں اسے دیکھ ہی نہ سکا۔ جب میں ٹرین میں بیٹھا روانگی کا منتظر تھا تو میری نگاہیں سامنے کھڑی ہوئی ٹرین کی طرف چلی گئیں اور ایک کھڑکی میں جم کر رہ گئیں۔ وہی چہرہ مجھے دیکھ رہا تھا، ہم دونوں مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ہم جدا ہو گئے۔ دفعتہً مجھے ایک ایسا خیال آیا جس نے مجھے غمگین کر دیا—— میں نے اس کا نام نہ پوچھا تھا نہ پتہ—— اوہ، کتنی بھول ہوئی، اور اپنے متعلق بھی تو اسے کچھ نہیں بتایا۔ لیکن بتانے سے کیا فائدہ ہوتا، شاید اب کبھی ایسا اتفاق نہ پیش آئے۔ اور ہم مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے پھر کبھی نہ گزریں۔ جب شام کو میں لاہور پہنچا تو سب کچھ بھول چکا تھا۔ رات کے واقعات دھندلے پڑتے جا رہے تھے۔ جو کچھ گزرا تھا اس کی حقیقت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اور اگلے روز تو ایمان کی قسم مجھے یہ یقین ہو گیا۔ کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے، اس کے بعد مجھے کبھی وہ لڑکی یاد نہیں آئی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ جب ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھے تھے تو میں نے قسمیں کھائی تھیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا—— وعدے کیے تھے کہ اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اور نہ اس کا نام پوچھا نہ پتہ۔ شاید اس عمر کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ پانی کے بلبلے کی طرح ناپائدار—— بالکل خواب کی طرح——!"

کمار نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور بولا—— "ماں بیٹے اور بھائی بہن کی محبت کو چھوڑ کر مرد صرف مرد سے محبت کر سکتا ہے اور عورت عورت سے۔ لیکن مرد اور عورت کی محبت بالکل ناپائدار ہے، بالکل وقتی چیز ہے۔ جس کی بنیاد ہی چند کمزور جذبوں پر ہو اس میں استقلال کہاں سے آ سکتا ہے—— ایسی ہی محبت لطیف کو بھی تو تھی——"

"ارے ہاں یار" بشیر بولا۔ "پچھلے مہینے میں نے انور کو دیکھا——!"

"اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

—— "ویسی ہی ہے۔ شاید پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ لطیف بیچارے نے تو اسے ایک عرصے سے نہیں دیکھا۔ کیوں لطیف؟"

"ہاں مجھے ڈیڑھ سال ہو چکا ہے—— لیکن اب مجھے دیکھنے کی پروا بھی نہیں۔"

"شاباش! اب بنے ہو تم انسان۔" کمار بولا۔ "ورنہ وہ دن بھی تو تھے جب جناب امتحان میں پرچے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔ اس لئے کہ انور کسی سینما میں فلم دیکھنے آئی ہے۔ کوئی یونہی جھوٹ موٹ کہہ دے کہ ہم نے انور کو فلاں جگہ دیکھا تھا۔ بس لطیف صاحب کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے۔ سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ کب دیکھا تھا؟—— ساتھ کون کون تھا؟—— کیسا لباس پہن رکھا تھا—— کیسی دکھائی دے رہی تھی؟—— گلے میں وہ ہار بھی پہن رکھا تھا یا نہیں؟ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں کوئی انگوٹھی تو نہیں پہن رکھی تھی؟ یہ اور وہ——!"

"تب اور بات تھی——!" لطیف بولا۔ "تب بچپنا تھا، اب زمانے کی ٹھوکروں نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ وہی بیوقوف اور پگلا دل جو کبھی بیحد حساس تھا۔ اب سمجھدار ہوتا جا رہا ہے۔"

"اب تک ہم یہی سنتے آئے ہیں——!" کمار بولا—— "کہ محبت طویل رفاقت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ کر، ایک دوسرے کی خوبیاں اور کمزوریاں دیکھ کر، ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھ چکنے کے بعد محبت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یار لطیف تمہیں کس قسم کی محبت تھی؟ کیا تم نے آج تک کبھی انور سے گفتگو——"

"نہیں تو! اگر اتفاق سے فون پر وہ کبھی بول پڑتی تو ——"

نہیں، ویسے میں نے کبھی اُس سے گفتگو نہیں کی۔"

"کبھی اس نے کوئی اشارہ کیا۔ جس سے تمہیں یقین ہوا ہو کہ آپ تمہارا خیال ہے؟"

"کبھی نہیں! یہ دوسری بات ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ ورنہ اس نے آج تک مجھے کبھی پسند نہیں کیا ـــــ شاید اسے مجھ سے نفرت تھی!"

"پھر تمہیں اس سے محبت کیوں تھی؟ میں نے سُنا تھا کہ ان کے گھر میں تمہارا آنا جانا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ جب تم فون کرتے تھے تو تمہاری آواز سن کر فون بند کر دیا جاتا تھا۔ اس گھر میں بچے سے لیکر بزرگ تک سب تمہیں ناپسند کرتے تھے۔ پھر تمہیں اُس سے کیوں محبت تھی؟"

"معلوم نہیں ـــ میں بتا نہیں سکتا۔ پہلے پہل اپنی حماقتوں کا خیال کر کرکے اکثر میں پریشان ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب مجھے کسی کی پروا نہیں اب میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے، اب میں کسی انور کو نہیں پہچانتا۔"

"اور تم وہاں شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"ہاں! کچھ دنوں یہ خبط بھی مجھ پر سوار رہ چکا ہے۔"

"تمہیں وہ گھرانا پسند تھا؟ صاف صاف بتانا۔!"

"نہیں!"

"تمہیں اس کے آبا اچھے لگتے تھے کیا؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے اس کے آبا سے سخت نفرت تھی' وہ بے حد باتونی ہیں۔ اور پھر وہ موٹے کس قدر ہیں' سارا دن صوفے پر بیٹھے رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک بس باتیں ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ فلاسفی پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ میں نے فلاسفی کا ایم۔ اے کیا ہے۔ اور انھیں اس کے متعلق ایک حرف بھی معلوم نہیں۔ پھر بھی وہ زبردستی مجھے ہرا دیتے تھے۔ مجھے ان کی کوئی بات بھی پسند نہیں تھی۔"

"اور انور کے بھائی؟"

"انور کے دونوں بھائیوں سے مجھے نفرت تھی۔ دونوں پرلے درجے کے بیوقوف ہیں۔ بعض اوقات تو میں انھیں پاگل سمجھتا تھا۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے اس کنبے میں سوائے انور کے سب سے نفرت تھی۔ مجھے اس کوٹھی سے نفرت تھی۔ اس باغ سے نفرت تھی۔ آسمان کے اس حصے سے نفرت تھی جو اس کوٹھی کے عین اوپر تھا۔ وہ سارا کنبہ بیحد مغرور اور فضول سا تھا۔"

"تم سا خوددار لڑکا ان دنوں کالج میں نہیں تھا۔ تم نے یہ مصیبت مول لیکر اپنی خودداری کھوئی' بدنام ہوئے، اتنے پریشان رہے۔ غرضیکہ اپنی اس عجیب و غریب محبت میں تمہیں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ اس کا ذرا سا بھی تو فائدہ نہیں ہوا تمہیں۔ اب چونکہ تم نے اپنی رائے بتا دی ہے، اس لئے میں اپنے خیالات ظاہر کرنے سے نہیں جھجکتا، مجھے وہ گھرانا نہ کبھی پسند تھا اور نہ ہے۔ انور اتنی اچھی نہیں جتنی تم سمجھتے رہے ہو۔ چونکہ تم نے اسے دُور سے دیکھا ہے اس لئے تمہیں اُس کی خامیوں کا علم نہیں ہے۔ میری بہن رتن انور کی سہیلی ہے۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ انور سے شادی کرنا بہت مہنگا سودا تھا۔ اور تمہیں یہ کبھی راس نہ آتا۔ تم نا اُبا اُس کے رنگ پر مرمٹے تھے۔ اور یہ گلابی یا سنہرا رنگ بالکل عارضی چیز ہے۔ شاید تم نے اس کی تنگ پیشانی نہیں دیکھی۔ اس کے غیر شاعرانہ ہونٹ نہیں دیکھے۔ اسے چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہی انور ساڑی پہن کر کتنی معمولی سی لڑکی معلوم ہوتی ہے تم نے اسے رنگین دوپٹوں اور شوخ قمیصوں میں دیکھا ہے۔ ایک دن میں نے اسے دیکھا ہے جب وہ بخار سے اُٹھی تھی۔ اس روز تو وہ اچھی خاصی بدشکل دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی شکل کے علاوہ تمہیں اور کوئی لالچ نہیں تھا۔ تمہیں اس کا کنبہ ناپسند تھا۔ وہ گھرانا بالکل معمولی ہے پھر تم نے اس سے کبھی بات تک نہیں کی۔ اور وہ تمہیں پسند بھی نہیں کرتی تھی ـــ یہ سب کچھ جانتے ہوئے تمہیں اس سے محبت کیوں تھی؟"

"بھئی حماقتیں ہر کوئی کرتا ہے" لطیف بولا۔ "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو میں کبھی کا سنبھل چکا ہوں۔ اب ایسی کوئی کمزوری میرے دل میں نہیں رہی۔ جب وہاں سے میں روانہ ہوا تو دل ہی دل میں اس منحوس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں نے انور کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کاش میں اسے بالکل نہ دیکھتا۔ لیکن اب یہ سب بے معنی ہے۔ اب مجھے نہ کسی انور کی پروا ہے، نہ میرے سینے میں وہ کمزور سا دل ہے، نہ میں اپنی حماقتوں پر پشیمان ہوں۔ اس تجربے نے مجھے سخت بنا دیا ہے۔ پچھلی مرتبہ جب میں لاہور سے گزرا تو بغیر وہاں ٹھہرے سیدھا چلا گیا۔ یہ تو آج تم نے یاد دلا دیا ورنہ میں تو اس قضیے کو کبھی کا بھول چکا ہوں۔ اب مجھ میں وہ خودداری واپس آگئی ہے۔ اب میں وہی مغرور لطیف ہوں۔ مجھے اب کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔"

"اُفوہ' بارہ بج گئے ہیں، صبح چار بجے اٹھنا ہے" بشیر بولا "میں اور کمار تو سوتے ہیں۔ کمار کی گاڑی ساڑھے چار بجے آتی ہے"

"بہت اچھا! لیکن صبح ہمیں جگا لینا۔ کہیں چپ چاپ ہی دفع نہ ہو جاؤ" میں نے کہا۔

"تم بے فکر رہو۔ ہم تمہیں کان پکڑ کر اٹھا لیں گے" کمار بولا۔

ایک مرتبہ کمرہ پھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔

کمار اور بشیر دوسرے کمرے میں سونے چلے گئے۔ میں اور لطیف دونوں انگیٹھی کے سامنے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر لطیف نے اپنی کرسی کھینچ کر میرے قریب کر لی۔ اور آہستہ سے میرے کان میں بولا "یہ سب کچھ درست ہے۔ جتنی باتیں ہوئی ہیں یہ سب صحیح ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود مجھ میں ایک کمزوری بدستور ہے۔ اس سینے میں اب کوئی کمزور یا ڈرپوک دل نہیں دھڑکتا۔ اب ان میں ایک نڈر اور بے پروا دل ہے۔ فکر و عمل اور تجربوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اب مجھے اپنے خیالات پر قابو ہے' اپنے دماغ پر قابو ہے لیکن اگر آج انور مجھ پر مہربان ہو جائے تو میں فوراً اس کے قدموں میں جھک جاؤں۔ اگر آج وہ مجھے کوئی حکم دیدے تو اس کی تعمیل کے لئے اپنی جان تک دے دوں۔ اگر اس کے ہونٹوں سے میرے لئے ایک پیار بھرا بول نکل جائے تو میں پل بھر میں ویسا ہی خبطی اور بیوقوف بن جاؤں۔ اگر وہ ذرا سا بھی پیغام مجھے بھیج دے۔ یا ایک خط ہی لکھ دے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں جا پہنچوں۔ اور انور کے وہی باتونی اباّ۔ اس کا وہی مغرور کنبہ' وہ بھیانک سی کوٹھی۔ وہ سب مجھے اچھے معلوم ہونے لگیں۔ اور یہ کمزوری ساری عمر رہے گی۔ میں اپنا سینہ چیر کر اس دل کو نوچ کر باہر پھینک سکتا ہوں ——— لیکن دل سے اس کمزوری کو نہیں نکال سکتا۔ کچھ ایسی ہی عجیب چیز ہے یہ کمبخت محبت ———"

اور ہماری نگاہیں انگیٹھی پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں لپکتے ہوئے شعلوں کی جگہ اب راکھ اور چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں لیکن تپش بدستور تھی۔

عزیز احمد بی اے

مُطربہ

فضاؤں میں اک کیف سا چھا رہا ہے
زمانا پیامِ طرب لا رہا ہے
مجھے کوئی رہ رہ کے یاد آ رہا ہے
شرابِ جوانی پلائے چلی جا
ربابِ محبت بجائے چلی جا

نگاہوں میں کیف و سرور آ رہا ہے
کوئی جیسے نزدیک و دور آ رہا ہے
مرے دل میں پیغامِ طور آ رہا ہے
تمناؤں کو گدگدائے چلی جا
ربابِ محبت بجائے چلی جا

تخیل میں کوئی کھڑا ہنس رہا ہے
مرے ہر نفس میں کوئی بس رہا ہے
پھر آزارِ الفت میں دل پھنس رہا ہے
حسیں مُطربہ گنگنائے چلی جا
ربابِ محبت بجائے چلی جا

فریب آفریں ہے طرحدار دُنیا
غم و درد کی ہے گنہگار دُنیا
حقیقت میں ہے ایک آزار دُنیا
زمانے کو دل سے بھلائے چلی جا
ربابِ محبت بجائے چلی جا

مسرت کی دل پر گھٹا چھا رہی ہے
کلی حسرتوں کی کھلی جا رہی ہے
مری آرزوؤں کو نیند آ رہی ہے
بہاروں کی دُنیا لٹائے چلی جا
ربابِ محبت بجائے چلی جا

میں نغموں کے سیلاب میں ڈوب جاؤں
نگاہوں سے دل کی کہانی سناؤں
تری ہلکی آواز پر مسکراؤں
کوئی مدھ بھرا گیت گائے چلی جا
ربابِ محبت بجائے چلی جا

ماہر القادری

جوانی میں

نوجوانی پر نوحہ خوانی!

زمیں سے آسماں تک شادمانی — ارے توبہ وہ دورِ نوجوانی!
تخیل میں بلندی ہی بلندی — طبیعت میں روانی ہی روانی
خوشی کا دورِ عشرت کا زمانہ — وہ دلچسپی کے دن راتیں سہانی
فضا میں مستیاں گھل مل رہی تھیں — شرابِ تند سے تھا تیز پانی
کسی کا خط بہت رنگین و سادہ — کہیں سے کوئی پیغامِ زبانی
زمانہ چاہے کروٹ ہی بدل جائے — طبیعت پر نہ ہو اتنی گرانی
نہ دُنیا کے حوادث کا کوئی غم — نہ کچھ خوفِ بلائے آسمانی
دلِ ناآزمودہ مطمئن تھا — نہ اندیشہ نہ کوئی بدگمانی
کسی کے چھیڑنے کی دیر تھی بس — وہ راتوں کو مسلسل شعر خوانی
تمناؤں کے غنچے نیم وا تھے — ارے وہ عالمِ صبحِ جوانی
جدھر ڈالیں نگاہیں کامیابی — کہ پاؤں چومتی تھی کامرانی
وہ میرے چٹکلے، دلچسپ فقرے — کہا جاتا تھا جس کو گل فشانی
نفس پیغمبرِ عیش و مسرت — اُمنگوں کی نظر سے ترجمانی

مگر وہ صرف اک خوابِ حسیں تھا
بہت کھایا فریبِ شادمانی

تمناؤں کا وہ رنگین دھوکا — میں سمجھا تھا خوشی کو جاودانی
وہ لمحے یاد بن کر رہ گئے ہیں — وہ باتیں ہیں کہانی ہی کہانی
خوشی تو ہے مگر سہمی ہوئی سی — فسردہ ہو گئی ہے شادمانی
طرب کے کچھ تو ہیں آثار باقی — غنیمت ہے یہ دورِ زندگانی
جوانی بھی مگر جاتی رہے گی — کہ یہ بھی تو ہے طوفاں کی روانی

مگر وہ دن نہ دکھلانا الٰہی!
جوانی پر کروں میں نوحہ خوانی،

محمد امین شرقپوری

شرابی

تاڑی اس کی زندگی کا جزو بن چکی تھی یا زندگی تاڑی کا جزو۔ بھلیا اس کے منہ سے لگی رہتی۔ اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ بڈھا کاکا تاڑی پی کر عقلمندی کی باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ چوپال میں بیٹھ کر وہ ایسی پتے کی کہتا تھا کہ اس کی عمر کے بڑے بوڑھے دنگ رہ جاتے اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے جس میں بوڑھے کے لئے تضحیک بھی ہوتی اور آفرین کے کلمات بھی۔

"کیا بات کہی ہے کاکا نے!" ایک ساتھ کئی آوازیں سنائی دیتیں۔

"ہاں ہاں" گوپال ناہیر ناریل کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا "اس گھڑی بڈھے کے ہوش ٹھکانے ہیں، جو چاہے پوچھ لو۔"

بڈھا مجمع پر اونگھتی ہوئی نظر ڈال کر بولا "میرے ہوش ٹھکانے کب نہیں ہوتے؟"

"ایک روز نہ پیو تو بتا دیں" گوپال ہنس کر بولا۔

"تم تو ٹھٹھا کرتے ہو" بڈھا جیسے برا مان گیا تھا۔ اس کی بات کا' دھوتی جھاڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"کاکا بیٹھو" درشن سنگھ ہاتھ کھینچ کر بولا۔

"ارے جانے دو" گوپال بول اٹھا "پیاس لگ رہی ہوگی۔"

"کیوں کاکا" درشن سنگھ مسکرا کر بولا "پانی لاؤں پیو گے؟"

بڈھا مجمع کو بھلا نگتا ہوا نکل گیا۔ یوں بھی جب وہ بگڑتا تھا مشکل سے قابو میں آتا تھا۔

اور گوپال سے جیسے وہ جلتا تھا۔ گاؤں کے چند مریبے چھوکروں کے ساتھ مل کر اس نے مخبری کی تھی' لال پگڑی والوں کو کاکا کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی "خانہ ساز" بھٹی پکڑوا دی۔ تاڑی کے مٹکے پھوڑ دئے گئے تھے۔ ندی پار کی زمین بیچ کر مشکل سے چھٹکارا ملا۔ جس روز وہ رہا ہو کر آیا، گاؤں میں سب سے پہلے جس نے اس کا سواگت کیا وہ گوپال تھا۔

"آ گئے کاکا؟"

کاکا جل ہی تو گیا' سفید آنکھیں نکال کر بولا "اور تم سمجھتے تھے کہ بڈھے کو قید ہو گئی۔"

"نہیں تو" وہ انجان بن کر بولا "درشن سنگھ کہہ رہا تھا کہ دو سال کی جیل ہو گئی ہے کاکا کو۔"

"ہوئی ہوگی اس کے باپ کو" بڈھا نتھنے پھلا کر بولا۔

گوپال ہنس پڑا بولا "کاکا تمہارے بغیر چوپال سونی تھی۔ جی نہیں لگتا تھا۔"

"ارے" وہ ہنس کر بولا "سمردوں کے ساتھ رونق ہے تم سب لگائی ہو' لگاتی۔"

گوپال چونک کر بولا "یہ بات تو نہیں کاکا ہم مر تھوڑا ہی گئے ہیں۔"

"جیتے کب تھے جو مرتے" بڈھا پھیکی ہنسی سے بولا۔

گوپال جھینپ کر بولا "کاکا یہ تو بتاؤ' وہاں دن کیسے نکلے"

"مزے کے نکلے" مسکرا کر بولا۔

"تمہارے پینے کی پوچھ رہا ہوں۔"

"وہاں کیا نہیں ملتی؟"

"کیا کہا" وہ کسیقدر تعجب سے بولا "تاڑی جیل میں کہاں سے آئی"

"جیل کاٹی کس نے ہے" بڈھا خم ٹھونک کر بولا۔

"تو کیا اتنے دنوں شہر کی سیل سپاٹا کرتے رہے؟"

"نہیں تو تمہارے سسرال میں تھا" بڈھا بگڑ کر بولا اور چلا گیا۔

گوپال اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ "چہرہ سوکھی جھاڑی کا سا نکل آیا ہے' کہتا ہے خوب مزے میں رہا' تاڑی کے

مارے بُرا حال ہو رہا ہے بڈھے کا۔ بات ٹھیک سے نکل نہیں رہی منہ سے۔ ڈینگیں مار رہا ہے۔ رسی جل گئی پر بل نہیں گئے ــــــ!" دانت پیس رہا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے کاکا" نارائنی بولی "کھانا تو کب کا ہو گیا۔"

کاکا جواب دئے بغیر کوٹھری میں گھس گیا۔ ادھر اُدھر نظر ڈال کر بولا "میری تھیلیا کہاں ہے؟"

"کیا خبر تمہاری تھیلیا چھلیا کی" نارائنی بولی "رکھی کہاں تھی؟"

"تیرے سر پر" وہ چیخ کر بولا "کون آیا تھا کوٹھری میں میرے پیچھے؟"

"کوئی بھی نہیں" وہ بولی۔

"تو کیا یمدوت آیا تھا" میں کہتا ہوں تھیلیا کہاں ہے میری"

"میں کہتی ہوں مجھے کیا سونپ کر گئے تھے جو پوچھ رہے ہو" نارائنی تیز ہو کر بولی۔

بڈھے نے سُرخ آنکھیں نکال کر دیکھا۔ بہو گردن ڈال کر بولی "درشن سنگھ آیا ہوگا۔"

بڈھا چونک کر بولا "وہ کیا تھیلیا اُٹھا کر لے گیا؟"

"ٹھیک سے دیکھو! کہاں بھول گئے؟" نارائنی نرمی سے بولی۔

بڈھا کھاٹ پٹک کر بولا "یہ پھر یہاں کیوں رکھ دی تو نے" بہو نے سہم کر دیکھا۔ بڈھا کہہ رہا تھا "اتنے بڑے گھر میں یہی جگہ ہے کھاٹ کے لئے کیا؟"

بڈھے کی نظر دو چھتی پر پڑی "اوپر تو نہیں ڈال دی کسی نے؟" کھاٹ پر چڑھ کر بولا۔ بنوں کی بٹی ہوئی بوری کو گھسیٹ رہا تھا۔

نارائنی بولی "کاکا یہاں کیا تھیلیا رکھی ہے۔ بیچ کا ناس ہو جائیگا۔"

بڈھا یوں ماننے والی اسامی نہ تھا۔ دونوں ہاتھوں سے زور لگا رہا تھا۔ بوری کے پھٹنے کی آواز آئی "کاکا" نارائنی بول اُٹھی "ٹاٹ کا پھٹا ہوا ٹکڑا کاکا کی مٹھی میں تھا اور کاکا دھچکا پا کر زمین پر آ رہا۔ ٹانگیں کھاٹ پر تھیں اور سر زمین پر ــــ!

"جلدی سے آگے بڑھ کر سہارا دیتے ہوئے بولی "کیا ہوا آج تمہیں؟"

بڈھا ہانپتے ہوئے بولا "اس صندوق میں کیا ہے؟"

"تمہارے کپڑے ہیں۔ کیوں؟"

بڈھے کو جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اُچھل کر صندوق کی طرف بڑھا۔ ڈھکنا کھول کر بولا "تھیلیا تو یہ رکھی ہے۔"

بہو مسکرا کر بولی "میں نہ کہتی تھی کہیں اور رکھ دی ہوگی تم نے۔"

بڈھے کی تاریک آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ تھیلیا منہ سے لگا کر بولا "کون آیا ہے باہر؟"

"کاکا" درشن سنگھ کی آواز تھی۔

بہو گھونگھٹ نکال کر بولی "اندر آ جاؤ"

درشن سنگھ چوکھٹ پر رُکتے ہوئے بولا "ہو لے گھبیر تھے ہیں کوٹھری میں۔ کاکا کیا کس پورہے تھے؟"

نارائنی ہنسی کو ضبط کر کے بولی "تھیلیا کھو گئی تھی آج کاکی"

درشن سنگھ ہنس پڑا اور کاکا بھی۔

کاکا آج صبح سے بوکھلایا ہوا تھا۔ گھر بھر کے برتن باسن اُس کی زد میں تھے۔ ایک ایک کر کے آنگن میں پھینک رہا تھا۔ اور اُن کی گونج جیسے کہہ رہی ہو "تاڑی لاؤ تاڑی ـــ!"

نارائنی چلا کر بولی "برتن پھوٹ جائیں گے کیا کر رہے ہو کاکا!"

"تم چپ بیٹھی رہو!" وہ غصہ سے بولا۔

درشن سنگھ نے جھانک کر دیکھا اور اُلٹے پاؤں چلا گیا۔

"کاکا کیا پاگل ہو گیا ہے" بولا۔

"تاڑی جو نہیں ملی آج" ایک نے کہا۔

"چودھری تم نے بُرا کیا" دوسرا بولا۔ گوپال مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا "برسوں سے کھینچ کر پی رہا تھا۔ ایک دن بھانڈا پھوٹنا ہی تھا۔"

"راموں سے کہو کہ شہر سے لا دے بوتل" پہلے نے کہا۔

"دس روپے میں ادھا آتا ہے" گوپال بولا۔ "بڈھے کے کتنے دن چلیگا ــ"

"دن کی کہتے ہو۔ ایک ہی گھونٹ میں پی جائیگا اُسے!"

درشن پیا

اور پھر کالی کی کڑکتی ہوئی آواز کانوں میں گونج گئی۔

"بھوکو! رہا ہے کیا؟" درشن سنگھ چونک کر بولا۔

دوڑ کر آیا۔

کالی لٹھیا لئے کھڑا تھا۔ نراینی زمین پر لوٹ رہی تھی۔ اور راموں باپ سے کہہ رہا تھا "اسے کیوں مارتے ہو شہر سے لے آؤ نا نواں لاکے دیتا ہوں۔ تیری گھر میں تو پیدا ہونے سے رہی۔"

بڈھے کے غصے کو فرو کرنے کی یہی ایک تدبیر تھی۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ گھر میں ایک ناس بھی سلامت نہیں رہیگا۔ اور اس کی نراینی بیچاری مفت میں پٹ گئی تھی۔

راموں کی بات پر بڈھے کی تاریک آنکھوں کے آگے خوبصورت بوتلیں گھوم گئیں۔ مقدمہ کے دنوں میں ایک دفعہ بلکہ عمر میں پہلی بار بازار کی تاڑی اس نے کبھی تو اتری تھی۔ کتنا آنند اور سرور تھا اس پانی میں۔ کئی روز تک گھر کی تاڑی نظروں سے اتری رہی تھی وہ رنگ۔ نہ وہ بو باس۔ اس کا بس چلتا تو پوری دکان خرید کر گاؤں لے آتا۔ اور وہ دکاندار پہلے تو اس نے بڈھے پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی "کیا لوگے؟"

"یہی" وہ بچوں کی طرح رنگ برنگی بوتلوں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ جو الماری میں نئی نویلی دلہن کی طرح سجی رکھی تھیں۔

"پیسے بھی ہیں تمہارے پاس؟"

"کچھ دام بتاؤ گے بھی؟" وہ بولا۔

"دس کا آئیگا ادھا"

ایک میلا کچیلا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے کر ایک ننھی سی شیشی ہاتھ میں لے کر بولا "بس اتنی سی شیشی"

دوکاندار مسکرا کر بولا "اور کیا دو ہاتھ کی لوگے"

بڈھا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی سے اترتے ہی اس کی اداس آنکھیں اس طرح چمک اٹھیں جیسے وہ تاریکی سے نکل کر یکدم روشنی میں آگیا ہو۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں میں آنسو کے دو قطرے ڈھلک گئے۔ دکان کے آگے کھڑا تھا، بڈھے کی منزل مقصود۔ نوٹ سرکاتے ہوئے بولا "پانی کے رنگ والی شیشی۔"

وہ خوشی سے اچھل پڑا، بوتل سے منہ لگائے کھڑا تھا۔ جیسے وہ کئی روز سے پیاسا ہو۔

ایک مرتبہ وہ پھر اسی سرور اور آنند سے ہمکنار ہو رہا تھا جس کے بغیر اس کی روح بے چین تھی بیتاب تھی۔ آنکھیں تاریک ہوگئی تھیں۔

چسکی لے کر بولا "کتنی مزیدار ہے یہ" جلتا ہوا کلیجہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو۔ بوتل کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا، جو اس نے چند ہی گھونٹ میں خالی کردی تھی۔ چند گھونٹ پینے کے بعد اس کی سوئی ہوئی عقل بیدار ہوگئی تھی۔ سوجھ بوجھ کے تمام دروازے اس پر کھل گئے تھے۔ آج وہ چوپال میں بیٹھکر وہ سرکے کی کہیگا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے ششدر رہ جائینگے اور گوپال امیر— بازار پر حقارت آمیز نگاہ ڈالکر بولا "تھوکتا ہوں میں تجھ سے" دماغ سنک گیا ہے سسرکا" اس کے بقول آنچ سیج بازار کی سیل (سیر) کر رہا تھا۔

"بڈھے دیکھ کر چلو" ایک سفید پوش نوجوان کہنی مار کر بولا۔

"بابو - بابو" وہ مسکرا کر بولا "یہ کوٹ کتنا اچھا ہے تمہارا"

"پہنو گے ... ہے" ایک رکتے ہوئے بولا۔

نوجوان ہنس کر بولا "ہاں اور بہت زیادہ، آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہونے لگا ہونٹوں پر جیسے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ سامنے پیاؤ کا پنڈت لوٹا ہاتھ میں لئے اونگھ رہا تھا۔ بڈھے نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو "جل پیو" "ٹھنڈا جل"

"جل" وہ خالی بوتل جیب سے نکال کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"میرا جل میرے پاس ہے"

خالی بوتل منہ سے لگائی اس کے ہونٹ چوس رہا تھا چسکیاں لے لے کر!



پیر غلام دستگیر نامی

ایک درویش کامل کا تاتاریوں سے جہاد

ایران کی ادبی تاریخ" مصنفہ براؤن میں یہ پڑھکر کہ مولانا جامی کی کتاب نفحات الانس مصنفہ ۱۴۸۱ء مطبوعہ ( ) میں حضرت نجم الدین کبرٰی کے تاتاریوں سے جہاد اور شہید ہونے کا ذکر ہے۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ حاصل مطالعہ درج ذیل ہے :-

حضرت شیخ نجم الدین قدس اللہ تعالیٰ کی کنیت ابوالجناب نام احمد بن عمر الخیوقی اور لقب کبرٰی ہے۔ چونکہ اوائل جوانی میں جب آپ تحصیل علوم میں مشغول تھے مناظرہ اور مباحثہ میں غالب رہتے۔ اس لئے لوگوں نے انہیں طامتہ الکبرٰے (بڑی بلا) کے لقب سے ملقب کیا۔ آخر طامتہ حذف کر کے کبرٰی رہنے دیا۔ بعض کہتے ہیں کبرٰی کبیر کی تکبیر ہے مگر امام یافعیؒ اپنی تاریخ میں قول اوّل کو اصح قرار دیتے ہیں۔

شیخ موصوف بزرگان دین سے فیضان حاصل کرنے کے لئے تبریز۔ ہمدان۔ اسکندریہ۔ ڈرستان اور مصر گئے وہاں سے حسب فرمان عمار یاسر خوارزم (خیوا) پہنچے۔ اسوقت یہاں شاہان خوارزم میں سے علاؤ الدین محمد (۵۹۶ھ ۱۱۹۹ء) سریر حکومت تھا۔ شیخ موصوف کے ایک مرید شیخ مجد الدینؒ بغدادی اس کے طبیب خاص تھے۔ انہیں حضرت نجم الدینؒ کی ارادت کا شرف حاصل تھا۔ ایک دن درویشوں کی مجلس میں بیٹھے بیٹھے جب آپ پر سکر کا غلبہ ہؤا تو فرمایا ہم کنار دریا بطخ کے انڈے تھے اور ہمارے مرشد شیخ نجم الدین مرغ۔ انہوں نے ہمیں اپنے پروں کے نیچے لیکر ہماری تربیت کی۔ ہم چونکہ بطخ کے بچے تھے اس لئے نکل کر دریا میں پہنچے۔ اور شیخ صاحب کنارے پر کھڑے رہتے۔ جب آپ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ کے منہ سے نکلا کہ وہ (مجد الدین) دریا میں مرے گا۔ مرشد کی یہ بات سنکر وہ مارے خوف کے کانپ اٹھے اور شیخ سعد الدین حموی کے پاس آکر تضرع و زاری سے کہنے لگے کہ جب حضرت نجم الدین کا وقت ہو مجھے اطلاع دیں تاکہ میں اپنی خطا معاف کراؤں۔ چنانچہ جب سماع سے حضرت خوش وقت تھے تو شیخ اس حالت میں حاضر ہوئے کہ پاؤں ننگے تھے اور دہکتی آگ سے پُرطشت سر پر رکھا تھا۔ آکر جوتیوں کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ آپ نے اُدھر نظر کی اور فرمایا کہ چونکہ تم نے درویشوں کے طریق پر بیہودہ گوئی سے معذرت کی ہے۔ اس لئے تمہارا دین اور ایمان سلامت رہیگا۔ مگر مروگے دریا ہی میں۔ اور تمہارے بعد میرا اور سرداروں کا سر بھی کٹیگا۔ خوارزم کی بادشاہی تباہ اور عالم خراب ہوگا۔ یہ سُن کر شیخ مجد الدین حضرت کے پاؤں پر گر پڑے اور جلد ہی اُن کی بات پوری ہوگئی۔

شیخ مجد الدین خوارزم میں وعظ کہتے تھے۔ اس میں سلطان محمد کی والدہ جو بڑی جمیلہ تھی شریک ہؤا کرتی۔ اور کبھی کبھی زیارت کے لئے بھی حاضر ہوتی۔ دشمن تاک میں تھے۔ ایک دن موقع پاکر جب سلطان مذکور مست پڑا تھا عرض کیا کہ حضور کی والدہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالےٰ کے مذہب کے مطابق شیخ مجد الدین سے نکاح کر لیا ہے۔ سلطان کو بڑا رنج لاحق ہؤا۔ حکم دیا کہ شیخ کو دریائے دجلہ میں غرق کردو۔ چنانچہ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ یہ ۶۰۶ھ کا اور بعض ۶۱۶ھ کا واقعہ بتاتے ہیں۔

جب اس واقعہ کی اطلاع شیخ نجم الدینؒ کو ہوئی۔ آپ متغیر ہوئے اور فرمایا انا للہ و انا الیہ راجعون میرے فرزند مجد الدین کو دریا میں ڈال کر مار دیا ہے ! آپ نے سر سجدے میں رکھدیا اور کافی عرصہ کے بعد اُٹھا کر فرمایا۔ کہ میں نے حضرت عزت سے درخواست کی ہے کہ میرے فرزند کے خون بہا میں سلطان محمد کی بادشاہی چھین لے۔ اور اُس نے میری عرض قبول کرلی ہے۔

بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ عالم پریشانی و سراسیمگی میں ننگے پاؤں حاضر خدمت شیخ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں زر سے بھرا ایک طشت تھا جس میں شمشیر اور کفن دھرا تھا۔ سر ننگا کئے جوتیوں میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ اگر دیت درکار ہے تو بھی حاضر ہے اور اگر قصاص مطلوب ہے تو تلوار موجود ہے۔ شیخ نے فرمایا کَانَ ذَالِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا (تقدیر میں یونہی لکھا تھا) اس کی دیت تیرا سارا ملک ہے۔ تیرا سر بہت سی مخلوقات کا سر اور میرا سر بھی کٹیگا۔ سلطان ناامید ہو کر واپس چلا گیا۔

تاتاریوں کے خوارزم پر چڑھائی کرنے کا باعث یہ بنا کہ چنگیز خاں نے چند سوداگر قصبہ اترار میں بھیجے۔ گورنر نے انہیں جاسوس سمجھ کر قتل کرا دیا۔ چنگیز نے یہ خبر سن کر ایک سفارت بھیجی جس میں دو منگول تھے اور ایک ترک بغرا نامی۔ اور کہلا بھیجا کہ صوبہ دار اترار ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ورنہ لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ خوارزم شاہ نے بغرا کو قتل کرا دیا۔ اور منگولوں کو داڑھیاں منڈوا کر واپس کر دیا۔ یہ بدسلوکی دیکھ کر تاتاریوں کا ٹڈی دل امڈ پڑا۔ اترار چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد سر ہوا۔ صوبہ دار کی آنکھوں اور کانوں میں چاندی پگھلا کر ڈالی اور عذابوں سے مارا۔ جو لوگ قتل عام سے بچے انہیں لے جا کر مسلمانوں کے مقابل کھڑا کر دیا اور ان کے جسموں سے خندقیں پاٹیں۔

خوارزم پر حملے سے پہلے شیخ نجم الدین نے اپنے اصحاب کو جو پانچ چھ ہزار تھے جمع کیا اور بعض کو جن میں سعد الدین حموی اور شیخ رضی الدین علی لالا وغیرہ بھی شامل تھے فرمایا کہ جلدی اٹھو اور اپنے وطن کو چلے جاؤ۔ کیونکہ مشرق کی طرف سے آگ بھڑکی ہے جو مغرب کو جلا دیگی۔ یہ ایسا بڑا فتنہ ہے جس کی ابتک مثال نہیں۔ بعض اصحاب نے فرمایا کہ آپ دعا فرمائیں کہ اس بلا کو اسلامی بلاد سے دفع کرے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ قضائے مبرم ہے اسے دعا نہیں روک سکتی عرض کیا گیا کہ سواری کے لئے جانور حاضر ہیں۔ اگر آپ موافقت کریں تو ہم آپ کی ملازمت میں خراسان کا رخ کریں شیخ نے فرمایا میں یہیں شہید ہوں گا اور مجھے حکم نہیں کہ باہر جاؤں۔ بعض اصحاب خراسان کو چلے گئے۔ (آخر خراسان بھی نہ بچا)۔

جب کفار شہر میں گھس آئے۔ آپ نے اپنے باقی ماندہ اصحاب کو بلایا اور کہا قُوْمُوْا عَلٰی اِسْمِ اللّٰہِ نُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہو ہم اللہ کی راہ میں لڑیںگے) پھر آپ گھر آئے۔ خرقہ در بر کیا۔ کمر چست باندھی خرقہ آگے کی طرف کھلا تھا۔ جوتے بھی پتھروں سے بھر کر ہاتھ میں پکڑ لئے۔ جب کفار کے مقابل ہوئے ان کے منہ پر پتھر مارنے لگے۔ حتی کہ سب پتھر ختم ہو گئے۔ انہوں نے آپ پر تیر برسائے۔ ایک تیر آپ کے سینۂ مبارک پر جا لگا۔ آپ نے نکال کر پھینک دیا۔ اور آگے بڑھے اور ایک کافر کے ہاتھ سے جھنڈا چھین لیا۔ جو ایسا مضبوط پکڑا تھا کہ آپ کی شہادت کے بعد بھی آپ کی گرفت سے نہ نکل سکا۔ آخر اسے کاٹ کر نکالا۔

کہتے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنی غزل کے ان ابیات میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

ما ازاں محتشمانیم کہ ساغر گیرند ٭ نہ ازاں مفلسکاں کہ بز لاغر گیرند
بیکے دست مئے خالص ایماں نوشند ٭ بیکے دست دگر پرچم کافر گیرند

آپ کی شہادت ۶۱۸ھ میں واقع ہوئی۔ خوارزم شاہ پہلے ہی جان بچا کر بھاگ گیا تھا۔

چونکہ خوارزم میں ڈٹ کر مقابلہ ہوا اس لئے منگولوں نے غصے سے اس کے تمام باشندے قتل کر دئے اور صناعوں کو منگولیا کی طرف جلاوطن کر دیا۔ حسب بیان جامع التواریخ محاصرین کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ اور ہر ایک کو چوبیس چوبیس قیدی قتل کرنے پڑے۔ یعنی بارہ لاکھ۔ عورتوں کا پیٹ چاک کر کے انتڑیاں نکالی گئیں تاکہ انہوں نے جواہرات نہ نگل لئے ہوں۔

خوارزم شاہ ایک جگہ شکست کھا کر پھر کہیں بھی نہیں ٹھہرا حتی کہ بھاگتا بھاگتا کیسپین سی کے ایک جزیرے میں بھگوڑے کی موت مرا اور اسکے بہادر بیٹے جلال الدین کی وفات پر ۶۲۸ھ میں خوارزم شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر حضرت نجم الدین کبریٰ جیسے مخلص مجاہدین کا خون رنگ لایا اور تاتاری مسلمان ہونے شروع ہوئے جیسا کہ سر اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے ٭ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اعجاز صدیقی

زندگی کا ایک رُخ

زیست ہر رنگ میں ہے جلوہ فروزِ عالم
کوئی خوشیوں کا پرستار، کوئی بندۂ غم

کہیں آنسو، کہیں نالے، کہیں چیخیں، کہیں آہ
عشرتوں میں کہیں ڈوبا ہوا دامانِ نگاہ

سینہ تانے ہوئے نخوت کہیں ایوانوں میں
اور اُلجھا ہوا جبروت کہیں شانوں میں

قہر کی دھوپ کہیں ہے تو کہیں رحم کی چھاؤں
اور نکلے ہوئے چادر سے کہیں ظلم کے پاؤں

کہیں چھائے ہوئے حرص اور ہوس کے بادل
کہیں پندار کے نشے سے نگاہیں بوجھل

آسماں بوس کہیں قیصر و کسریٰ کا دماغ
خون آلود کہیں نکبت و عسرت کا ایاغ

قلبِ تیرہ میں کہیں قیدِ ظلوم اور جہول
کہیں اخلاق کی بارش کہیں بدیوں کا نزول

ملک اور قوم سے اپنے کہیں غداری ہے
آدمیت کہیں آمادۂ خونخواری ہے

کہیں ہیجانِ سیاست ہے رگوں میں طاری
کہیں لعنت ہے غلامی کی کہیں مختاری

ہے خیالوں میں کہیں معرکۂ جنگ و جدال
فکرِ ماضی ہے کہیں، ہے کہیں اندیشۂ حال

رہنمائی ہے کہیں اور کہیں راہزنی
کوئی باغی ہے یہاں، کوئی قیادت کا دھنی

مدتوں سے نہیں پرواز میں جس کا پرچم
وہ محبت ہی ہے، احساس محبت کی قسم!

وہ محبت کہ سحر رنگ ہیں راتیں جس کی
حسن اور عشق کیا کرتے ہیں باتیں جس کی

وہ محبت کہ جلو میں ہیں ستارے جس کے
روح میں جس کی تپش، دل میں شرارے جس کے

جو ہوئی روزِ ازل باعثِ تخلیقِ جہاں
جس کے انوار سے رخشندہ ہوئے کون و مکاں

پھول بننے کی ادا جس نے کلی کو دے دی
اک تڑپ سوز کی شمعِ سحری کو دے دی

نجد میں لاگ کی اک آگ لگا دی جس نے
اور محمود کو دی روحِ ایازی جس نے

جس کو اک مردِ عرب لیکے لبوں میں اُٹھا
قدسیوں نے بھی کیا جس کو فلک پر سجدا

جس نے یوسفؑ کو کیا خوابِ زلیخا کا اسیر
جس نے موسیٰ کو کیا طور کی جانب رہگیر

کرشن کی بنسی سے جو نغمات کی صورت میں بہی
جس نے جمنا کی ہر اک موج میں انگڑائی لی

وہ محبت کہ جو انسانیت کبریٰ ہے
بعد خلاقِ جہاں جس کو روا سجدا ہے

جو تمنا کے بڑھاپے کو جوانی دے دے
سُست انفاس کو موجوں کی روانی دے دے

جس سے بجھ جائے کدورت کی دہکتی ہوئی آگ
خشکیوں میں جو فضاؤں کی بھرے رس و راگ

یہ جو برہم سا ہے کچھ رنگ مزاجِ عالم
ہے محبت کی کمی، ذوقِ محبت کی قسم

یہ دہکتے ہوئے صحرا، یہ سلگتے ہوئے شہر — خونِ انساں کی سرِ خاک تڑپتی ہوئی لہر!
یہ سسکتی ہوئی لاشیں، یہ بلکتے اجسام — ہر طرف نالہ و فریاد و بکا و کہرام
یہ لپکتے ہوئے شعلے، یہ دہکتی ہوئی آگ — جسم کے ساز سے پھوٹا ہوا اک موت کا راگ
ارضِ عالم پہ بموں کے یہ دھماکے پیہم — جن سے محفوظ کلیسا ہے، نہ دیوارِ حرم
زہر آلود یہ گیسیں، یہ فضائیں مسموم — الم انگیز گھٹائیں، یہ ہوائیں مسموم
اُف یہ بیواؤں کے نالے، یہ یتیموں کی پکار — جن سے چرخ اور زمیں دونوں کا سینہ ہے فگار
بھوک اور پیاس کی شدت سے کروڑوں بدحال — کوئی گھر میں تو کوئی راہگذر میں ہے نڈھال
ہر طرف ایک گرانی ہے، گراں جانی بھی — صرف روٹی ہی نہیں، اب ہے گراں پانی بھی
ایک کا دوسرا ہوتا نہیں پرسانِ ملال — عبرت آموز ہے اس دور کے انساں کا زوال
اک طرف دہر میں افلاس ہے ناداری ہے — دوسری سمت تمدن کی تبہ کاری ہے

کام لیں سوزِ محبت سے اگر آج بھی ہم
نغمہ امن سنیں سازِ محبت کی قسم!

اے محبت، تری معصوم اداؤں کو سلام — امن کا لائے گی دنیا کے لئے تو ہی پیام
تو ہی اک رُخ ہے اہم زندگیٔ انساں کا — سایہ درکار ہے دنیا کو ترے داماں کا
دلِ انساں میں ضیا تیری سمٹ آئے اگر — روز پیدا ہوں نگاہوں سے نئے شمس و قمر
دل کے ٹوٹے ہوئے رشتے تری نظروں سے جڑیں — کام بگڑے ہوئے سارے ترے ایما سے بنیں
قلبِ تیرہ میں تو ہو جائے اگر جلوہ فگن — ذہن اپنے ہی اندھیروں میں ہوں آلام محن
بجھ کے رہ جائے ابھی آتشِ نفرت تجھ سے — دب کے رہ جائے یہ جبروت کی قوت تجھ سے
زندگی کے اسی رُخ پہ نہیں انساں کی نظر — گر اس رخ سے نہیں اور کوئی رُخ بہتر
رُخِ عالم پہ اسی سے ہے تجلائے حیات — ہے محبت ہی سے نمکین تماشائے حیات
جب کسی رُخ سے نمایاں یہ محبت ہوگی — روح انساں کی سراپردۂ عشرت ہوگی
اس نفاذ ارکی قائم ہے محبت پہ اساس — زندگی کی ہے یہی سب سے بڑی نبض شناس
نشترِ حرص جو چھیڑے نہ رگِ جاں کو کبھی — اتنی آسانی سے موت آئے نہ انساں کو کبھی
اب محبت کسی عنوان میں باقی ہی نہیں — آج انسانیت انسان میں باقی ہی نہیں

زندگی کے اگر اس راز کا عرفاں ہو جائے
آدمی آدمی پھر کیوں نہ ہے انساں ہو جائے

خدیجہ مستور لکھنوی

اللہ قسم

"ادئی بیوی یہ دو پیسے کی ہلدی ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پیسے کی لایا ہے۔ بھلا دیکھوں تو تیری جیب!"
منّے کی امّاں نے پڑیا کھول کر دیکھی اور پھر تولنے کے لئے ہتھیلی پر رکھ کر دو تین بار ہاتھ نیچے اوپر مٹکایا۔ چھ سات سال کی معصوم جان۔ منّے کھڑا بسور رہا تھا۔ یہ سب دوکنداروں کا پاجی پن کہ سارا نفع بڈھوں اور بچّوں سے کما لیتے ہیں۔ اور تو سب خیر منّے کی امّاں کو کچھ تھا بھی مرض کہ جہاں وہ سودا لایا اور انہوں نے چوری کا الزام لگایا۔ چاہے چیز ایک آدھ بار ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جیب ٹٹولنے کے بعد بھی انہیں شبہ ہی رہتا کہ ضرور دہی بڑے کھانے کے لئے پیسے چراتا ہے، جبتک قسم نہ لے یقین یقین نہ آتا۔
"دیکھو میری جیب!" منّے جیب دکھانے کے لئے امّاں کے پاس بھڑ کر کھڑا ہو گیا۔
"ارے ہاں نہیں لیا میرے لال نے ایک پیسہ بھی، میں قربان جاؤں۔ اور اگر دہی بڑے کھا بھی لئے ایک پیسے کے تو کیا ہوا!" وہ پیار سے منے کو چومنے لگیں۔
"میں نے نہیں کھائے دہی بڑے!" منّے نے منہ بنایا۔
"اچھا کھا تو قسم!"
"اللہ قسم!" اب انہیں پورا یقین ہو گیا۔
یہ بھی اچھی بات تھی کہ قسم لینے کے بعد منّے کی امّاں کو فوراً یقین بھی آ جاتا۔
"میں کہتی ہوں دُلہن یہ تم روز روز ننھی سی جان پر چوری کیوں لگایا کرتی ہو" منّے کی دادی عصر کی چار رکعتیں جلدی جلدی ٹرخا کر کھر کھرائیں — "یہ بچّوں پر چوری کا الزام لگانا کچھ بھلا ہی تھوڑا ہے، کسی دن یہ بات دماغ میں جم گئی تو تمہاری ساری لیا بنجیا کا صفایا کر دیگا!"
"خاک تمہارے منہ میں" "خدا نہ کرے میرا بچّہ ایسا نکلے، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو اور اب بھی سب کا بُرا چاہنے سے باز نہیں آتیں!"
دلہن نے ساس کو کڑے تیوروں سے دیکھا اور وہ اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ میں دبی ہوئی تسبیح گھمانے لگیں۔ اور ان کے سفید سفید لٹکے ہوئے ہونٹ جلدی جلدی ہلنے لگے۔ نہ معلوم وہ اللہ اللہ کر رہی تھیں یا تسبیح کے دانوں پر دلہن کو کوس رہی تھیں۔ منّے غریب سہما ہوا چپ کھڑا تھا۔ روز ہی تو اس پر آفت ہوتی۔ پیسے چُرا لئے ہیں تو نے، اور اس نے کبھی ایک دھیلا بھی چپکے سے گھما دینے کی ہمّت نہ کی تھی اس کا ننھا سا دماغ بری طرح سوچ رہا تھا کہ دادی نے یہ کیا کہدیا کہ وہ امّاں کی لیا بنجیا کا صفایا کر دیگا۔ اس نے تو آجتک ایک پیسہ بھی نہیں چرایا۔ اس کے مولوی صاحب کا لڑکا چنّو روز ہی چپکے چپکے دہی بڑے کھاتا ہے۔ اور جب اُس نے پوچھا کہ پیسے کہاں سے ملتے ہیں تو بتایا کہ سودے سے چرا لیتا ہے۔ کیسے مزے کے ہوتے ہیں۔ وہ دہی بڑے — چوری کا اہم مسئلہ حل کرتے کرتے منے کا دماغ دہی بڑوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ آہا چنّو نے اسے بھی تو ایک دن دہی بڑے کھلائے تھے۔ کیسے مزے کے تھے۔ منہ کا پھیکا پن چلا گیا تھا۔ لیکن پیسہ چرانا کتنی بری بات ہے۔ اُس کی دادی نے نہ جانے کتنی بار اسے جائے نماز پر اپنے پاس بٹھا کر بتایا تھا کہ چوری کرنے سے اللہ میاں دنیا ہی میں فرشتوں کے ذریعے ہاتھ کٹوا دیتے ہیں اور مرنے کے بعد اللہ میاں کے گھر دہکتی ہوئی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔ منّے کا چھوٹا سا دل دہل کر رہ گیا۔ چنّو کی بھی تو دو اُنگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ ضرور فرشتوں نے اللہ کے حکم سے اسے سزا دی ہے۔ اور اب وہ مرنے کے بعد آگ میں جلیگا۔ کانپتا ہوا دادی کے پاس جا بیٹھا۔
"دادی! چوری کرنے والے کے ساتھ اللہ میاں کیا

کرتے ہیں؟" منّے نے چوری اور اُس کی سزا کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیں۔

"فرشتے ہاتھ کتر لیتے ہیں اور آدمی کا منہ کالا ہو جاتا ہے!" دادی نے اُسے اور بھی ڈرایا۔

"میرے لال ہیں نمک اور مرچ تو منگانا بھول ہی گئی۔ لا تو دے دوڑ کر!" منّے کی ماں نے موٹے سے کمر بند سے تین پیسے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور منّے جب دوکان پر پہنچا تو بہت سے آدمی سودا لینے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان سب سے ہٹ کر الگ کھڑا ہو گیا۔ دوکان سے ذرا ہی دور دہی بڑے والا پتوں کے دونے بنا کر چیخ رہا تھا۔ چٹپٹے مزیدار رکھے ہیں تیار۔ اس کے پاس دوسرا آدمی چھوٹے میں گنڈیریاں رکھے چیخ رہا تھا۔ گلاب کی لبھی گنڈیریاں کتنا سچ بول رہا تھا وہ۔ گلاب نہ سہی تو کیا ہوا کورے گھڑے کا پانی تو وہ برابر گنڈیریوں پر ڈال رہا تھا۔ اور بچے اُس طرف دوڑے جا رہے تھے۔ منّے کو خیر مٹھاس تو پسند نہ تھی۔ ہاں دہی بڑے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لیکن جیب خالی۔ صرف سودے کے تین پیسے اُس کی مٹھی میں دبے ہوئے تھے

آج تو وہ بھی ایک پیسے کے دہی بڑے ضرور کھائے گا۔ لیکن اَمّاں نے جان لیا تو کیا ہو گا —— ؟ اور پھر اسے فوراً ہی دادی کے بتائے ہوئے ظالم فرشتوں کا خیال آ گیا تو اُس نے اپنے ہاتھ بغلوں میں چھپا لئے۔

"چٹپٹے مزے دار رکھے ہیں تیار۔" دہی بڑے والے نے غل مچایا اور منّے سب کچھ بھول بھال کر چٹخارے بھرنے لگا۔

"دھیلے کی کابلی دھیلے کے دہی بڑے! پیسہ دے کر منّے للچائی ہوئی نظروں سے خوانچے کو دیکھنے لگا۔ اور جب کالی کالی چٹنی سے لپٹے ہوئے کچالو کا دونا دور سے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر چپ سے پھینکا گیا تو وہ ایک ہی دو نوالوں میں انہیں صاف کر گیا اور پھر دہی بڑے کھا کر قریب کے نل سے اُس نے ہاتھ منہ صاف کر لیا۔ دہی بڑے کھانے کو تو اُس نے کھا لئے۔ لیکن اس کے بعد اسے بار بار یہ خیال آنے لگا کہ اس کے ہاتھ فرشتوں نے کتر لئے ہیں اور جب وہ گھبرا کر دیکھتا تو ہاتھ قطعی سلامت ہوتے۔

"ارے کلموہے اتنی دیر کہاں لگائی؟ اور یہ مرچیں دو پیسے کی لایا ہے۔ دیکھوں تو تیری جیب!"

"میں نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا!" منّا سہم کر رہ گیا۔

"کھا قسم!"

"اللہ قسم!" ننھے نے جٹ سے قسم کھا لی اور جھک کر اپنی جیب جھاڑ دی۔ لیکن جھوٹی قسم کھا کر اُس کا ننھا سا دل خوف سے کانپنے لگا۔ اُس کی دادی نے بتایا تھا کہ جھوٹی قسم کھانے والے کی زبان سڑ جاتی ہے۔ منّے کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی زبان میں کیڑیاں سی اُٹھ رہی ہیں۔ لیکن جب ماں نے گرم گرم چائے پینے کے لئے دی تو اُس کی زبان ٹھیک ہو گئی۔ اونہہ ان باتوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب دادی کی باتیں ہیں۔ نہ تو زبان ہی سڑتی ہے اور نہ ہاتھ کترے جاتے ہیں۔ دادی اتنی بڑھی ہو کر جھوٹ بولتی ہیں۔ منّے نے نفرت سے دادی کو دیکھا۔ وہ سجدے میں پڑی دعائیں کر رہی تھیں۔ شاید اپنی زندگی طویل ہونے کی۔ یہ بڑھاپا! زندگی کا کس قدر بھوکا ہوتا ہے۔ چاہے کوئی کوڑے سے بھی بدتر خیال کرے۔ لیکن زندگی کی ہوس نہیں جاتی۔ جوانی میں ایک سجدہ نہ کرنا اور بڑھاپے میں زندگی کی دعائیں کرنے کے لئے ہر وقت سجدے میں پڑا رہنا۔ پوتے کی شادی اور دیکھ لوں اللہ اتنی زندگی دینا۔ پوتے کی اولاد کو اور کھلا لوں تو پھر کوئی تمنا نہ رہے گی کہ زندہ رہوں لیکن ان دعاؤں کا سلسلہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوتا کہ موت زبردستی گلا نہ دبا دے۔

"منّے ذرا پانی پلا دے!" دادی نے سجدے سے سر اُٹھایا۔

"نہیں پلاتا!"

"پلا دے میرے لال۔ ورنہ خدا بڑوں کا کام نہ کرنے کی سزا میں مرنے کے بعد دوزخ میں ڈال دیتا ہے!"

"اونہہ"! منّے نے دادی کو پانی پلا دیا۔ بھلا کام نہ کرنے کی سزا میں اللہ میاں دوزخ میں کیوں ڈالنے لگے؟ یہ اَمّاں بھی دادی کی طرح باتیں کرنے لگیں۔ دادی بھی تو ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ جب وہ نماز پڑھتی ہیں تو اللہ میاں اُن کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے ہیں۔ لیکن اُس نے آج تک ایک بھی نہیں دیکھا سب جھوٹ! دہی بڑے آہا! اُس کے منہ سے تصور ہی میں پانی ٹپکتا تھا۔ کاش اُس کی ماں پھر سودا منگائے۔ ابھی وہ دہی بڑے والا وہیں بیٹھا ہو گا۔ لیکن وہ چنّو بڑا چٹورا ہے اگر پہنچ گیا تو سب ہی کھا جائے گا۔ منّے اسی تصور میں کھانا کھائے بغیر سو گیا۔ وہ خرید رہا ہے دہی بڑے۔ چنّو نے اُسے دھکا دیا اور ٹھا اڑادھم

وہ گرا ہوا سچ بچے پودہی بڑے والے نے بہت ہی فضیل کالیا دیں۔ اور منے اپنے منہ پر لگی ہوئی کالی کالی چٹنی چاٹنے لگا سوتے میں منے کے ہونٹ چپڑ چپڑ کر رہے تھے ———

پھر زمانہ گزرتا گیا اور منے کی عادت ہوتی گئی کہ دو چار پیسے سودے میں سے ٹرخا دیا کرے۔ آماں نے جیب ٹٹولی' منے نے جٹ سے قسم کھائی لیجئے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اماں کا دل بیٹے کی محبت سے جھٹا اور وہ لگا سینے سے اور پھر تو خیر بچپن تھا اب تو وہ جوان ہو گیا تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں۔ کیا منے جوان نہیں ہوتے۔ کیا سب ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں پھر وہ کیوں بچہ رہتا۔ اماں اپنی آنکھوں میں مٹھی بھر دھول ڈال کے اسے دیکھتیں اور دادی بیچاری پوتے کے پوتوں کھلانے کا ارمان لئے خاک کے ڈھیر میں مل چکی تھیں اور منے سے اب یہ کوئی کہنے والا نہ رہا تھا کہ یہ نہ کرنا ورنہ فرشتے ہاتھ کتر لیں گے۔ وہ نہ کرنا ورنہ اللہ میاں منہ کالا کر دیں گے۔ اب تو وہ ہمت کر کے سب کچھ کرتا۔ لیکن فرشتوں نے ایک دن بھی اس کے ہاتھ نہ کترے۔ اور پھر جوانی کا عالم جوانی تو ہوتی ہے بُری بلا۔ نہ جانے کیا کیا ہر وقت سوچا کرتی ہے۔ سوچنا ہی بلکہ عملی جامہ بھی پہنا دیتی ہے اور منے کو ڈر ہی کس بات کا تھا۔ دادی کے بتائے ہوئے فرشتے اُس کے ہاتھ کتر نہ سکتے تھے۔ وہ خود اس قابل ہو گیا تھا کہ اگر ایک بار ان فرشتوں سے مقابلہ ہو جاتا تو وہ اُن کے ہاتھ بڑی صفائی سے غائب کر دیتا اور اس نے تو یہ صفا غائب کر دینے والی حرکت تو بچپن ہی سے سیکھ لی تھی۔

خیر کچھ ہو لیکن منے اپنی آماں اور ابا کے لئے بڑا سعادتمند ثابت ہوا۔ کیا مجال جو کبھی آنکھ اُٹھا کر بات کی ہو ہمیشہ نظریں نیچی رکھتا اور انہیں نیچی نظروں سے بھنگن' دھوبن اور محلے کی ہر عورت کو دیکھتا۔ اس پر بھی منے کی اماں ذرا کھٹک رہی تھیں۔

"فلاں نے فلاں کی بیٹی کو بے عزت کر دیا۔ بس اللہ سے توبہ ہے کیسا بُرا انجام ہوا۔ دنیا ہی میں منہ کالا ہو گیا۔ اور ہاں سنا ہے کہ آدھے دھڑ پر فالج گر گیا۔ میں تو کہتی ہوں کہ خدا عذاب سے بچائے؟" منے کی اماں دوسروں پہ رکھ رکھ کر اُسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتیں اور وہ دل ہی دل میں ہنسا کرتا۔ جب بچپن میں وہ چوری کرتا تھا تو دادی اُسے کتنا دھمکایا کرتیں اور اب چلی ہیں اماں۔ خیر وہ چوری تو ایک حد تک بُری بات تھی۔ لیکن ایک جائز حرکت کرنا۔ کیا بُری بات ہے۔ اسی جذبے کے تحت اُس نے ایک دن سب کی آنکھ بچا کر اپنے گھر کی بھنگن کو آنکھ مار دی تھی وہ بھی بڑی اکڑوالی روزی پر لات تو نہ ماری ہاں منے کو کڑے تیوروں سے سب کچھ سمجھا دیا کہ میاں پرائے مال پر یا حسین کیوں کرتے ہو۔ اپنے گھر میں دیکھو اور منے نے کیا بھی ایسا ہی۔ آپ کی پھوپی اپنے مائکے جاتے ہوئے ادھر بھی بھاوج سے ملنے کے لئے آ اتریں۔ دس سال سے تو بھاوج سے ملی نہ تھی اور اب جو منے کو جوان جودھا دیکھا تو پھسل گئیں۔ ان کی بیٹی ان نظروں میں پیدائش کے وقت سے جوان تھی لیکن بے چودہ سال کے بعد بھی نہ جُڑا۔ غریب کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں ان کی پریشانی تھی بھی حق بجانب۔ چودہ سال کی لڑکی اور یونہی بیٹھی رہے۔

"میری آنکھوں میں خاک بھابی اللہ رکھے منے کو کیسا مٹر مٹر کام کرتا ہے!" کھانا کھاتے وقت انہوں نے چٹخارے لے کر کہا۔ اور منے کی اماں اپنی تربیت پر فخریہ مسکرائیں جیسے کبھی ایسا گیا گزرا نہ تھا۔ جلدی سے پنکھا ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا بیچاری ہاشمہ تو اپنی ماں سے پھڑک کر بیٹھ گئی اور اُس کی ماں ہزاروں دعاؤں کی بوچھاڑ کرنے لگی۔ پنکھا جھلنے کے بعد منے نے سب کے بستر لگائے۔ لیکن اپنا پلنگ ذرا ہاشمہ کے پلنگ کے قریب ہی رکھا اور پھر وہ کرتا بھی کیا۔ گرمی اور چھوٹا سا آنگن۔ کوئی کوٹھریوں میں تو چھپ کر سونے سے رہا۔ منے کا ابا غریب تو بہن کی وجہ سے اپنا پلنگ باہر گلی میں اُٹھا لے گیا۔ منے کا کیا وہ تو اپنی ماں اور پھوپی دونوں ہی کی نظروں میں بچہ تھا۔ اس کے سامنے تو وہ گھونٹ سے دوپٹہ اتار کر پھر بھی گرمی میں سب ہی پاگل ہوئے جا رہے تھے اور بانس کے چھوٹے چھوٹے پنکھے ایک ساتھ ہاتھوں میں جھول رہے تھے۔ پنکھے جھولتے جھولتے ہاتھوں میں اٹک کر رہ گئے۔ خرخر خوں خر۔ سوتے ہوئے ہاشمہ جاگ اُٹھی۔ اُس کے پہلو میں منے کسمسا رہا تھا۔ تیز تیز سانسیں۔ اُس کے پسینے چھٹنے لگے۔ منے کی اُلٹی پلٹی آنکھیں چاندنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہائے*

---

* آناں! ہاشمہ کے منہ سے دبی سی آواز نکل گئی۔ ماں نے کروٹ

خراٹے۔ امسی حبس کی گرمی میں لوٹ رہے تھے۔ اور منے نے

طنز

اختر ملیح آبادی

موتی!

یکایک ثریا کو اپنی زندگی میں تنہائی کا احساس ہوا۔ یہ احساس برابر بڑھتا ہی گیا۔ اس احساس کے ساتھ وہ کسی نامعلوم ساتھی کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی زندگی میں کوئی آنا چاہتا تھا اور ثریا اس کی راہ دیکھتی۔ وہ آئے اور زندگی میں انقلاب پیدا کر دے۔ وہ اُس سے محبت کرے، پیار کرے اور خود محبت کا جواب محبت سے دے۔ کیونکہ محبت کا بدل محبت ہی ہے۔

لیکن جب وہ سوچتی کہ انسان کی محبت میں پائیداری نہیں ہوتی، استقلال نہیں ہوتا۔ لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، محبت کی قسمیں کھاتے ہیں لیکن جلد ہی اُن کی محبت فنا بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں تو ثریا کو بڑی مایوسی ہوتی۔ وہ ایک ایسے دوست، ایک ایسے ساتھی کی منتظر تھی جس کی محبت فانی نہیں غیر فانی ہو۔ جو محبت کرے تو ہمیشہ ساتھ بھی دے۔ لیکن ابھی تک اُسے ایسا ساتھی مل نہ سکا تھا۔

لیکن ثریا کی یہ مایوسی اور تنہائی جلد ہی دور ہو گئی۔ اُس کی زندگی میں انسان نہیں بلکہ ایک حیوان داخل ہوا ۔۔۔۔ وہ پلہ تھا ۔۔۔ کتے کا بچہ!

جب ثریا کھلے ہوئے پھولوں کو چومنے کے لئے جھکی تو کیاری میں اُسے پلہ نظر پڑا۔ وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اور گندگی میں لت پت بنا بیٹھا تھا۔ ثریا کو اس بے یار و مددگار پلے پر بہت ترس آیا۔ ثریا نے اُسے اٹھایا اور پوچھنے لگی: ۔ "تم یہاں کیسے آئے؟" پلہ برابر چیخ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو: ۔ "میری ماں منہ میں دبا کر مجھے یہاں لائی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔" اور ثریا نے ہنستے ہوئے اُسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کمرے میں لوٹ آئی۔ ثریا صوفہ پر بیٹھ گئی اُسے گود میں بٹھا لیا۔ اُس کے جسم کو کوٹ کے دامن سے چھپا دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی: "تم کتنے اچھے ہو، تمہارا گول گول منہ کتنا اچھا لگتا ہے، تمہارے دو چھوٹے لٹکے ہوئے جبڑے، تمہاری تیز آنکھیں، مضبوط گٹھیلا جسم، دودھ کی طرح سفید رنگ اور چھوٹی سی دم کتنی بھلی لگتی ہے۔" وہ برابر چلا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو: ۔ "سچ، آج مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میں اتنا خوبصورت ہوں۔"

ثریا اُسے سہلاتی رہی پھر جھک کر اُسے چوم لیا۔ اُس کا گیلا تھوتھن ثریا کے گال سے چھو گیا۔ ثریا ہنس کر کہنے لگی "یہ تم نے کیا کیا ۔۔۔ بولو؟" "تم نے مجھے پیار کیا ۔۔۔ میں نے تمہیں چوم لیا۔" تھوڑی دیر سہلانے کے بعد ثریا بولی: ۔ "اچھا بھئی تمہارا نام کیا رکھیں ۔۔۔ موتی پسند ہے ۔ کیوں؟"

"جو تمہیں پسند وہ مجھے پسند۔"

"میرے ننھے موتی مجھے ایک بات بتاؤ گے۔ ایں ۔؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"کیا تم مجھ سے سدا محبت کرنے کا وعدہ کرتے ہو، تم مجھے کبھی بھول تو نہ جاؤ گے ۔۔۔ بولو؟"

اور موتی اپنی زبان میں کہتا: ۔ "میری نسل ہمیشہ انسان کی وفادار رہی ہے۔ میرے باپ نے بھی انسان کی دوستی میں اپنی جان دی۔ میں بھی تم سے محبت کروں گا۔ تم سے کبھی الگ نہ ہوں گا۔ لیکن کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی رہو گی۔ کبھی بھولو گی تو نہیں؟"

ثریا نے موتی کو چمٹاتے ہوئے کہا: "میں تم سے ہمیشہ محبت کرتی رہوں گی۔"

"اور میں بھی مرتے دم تک تمہاری خدمت کروں گا۔ دیکھا ہو گا کہ دنیا کی ہر چیز مٹ سکتی ہے۔ لیکن ہماری محبت نہیں مٹ سکتی۔"

اور آج پہلی مرتبہ ثریا موتی کو اپنے ساتھ لیکر لیٹی۔ دونوں ساتھ سوتے۔ جب تک موتی بڑا نہ ہو گیا۔ ثریا اُس کو اپنے پلنگ پر سلاتی رہی۔

ثریا موتی کو پا کر سب کچھ بھلا بیٹھی۔ ثریا کو جس کا انتظار تھا وہ مل گیا تھا۔ اُس کی زندگی میں جو خلا تھا وہ پُر ہو چکا تھا۔ ثریا

کو ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو اس سے بے لوث محبت کرے اور وہ موتی تھا۔ ثریا اب موتی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ موتی کو خود کھلاتی، خود نہلاتی اور اپنے پاس سُلاتی تھی۔

ثریا کو روز بروز محسوس ہوتا گیا کہ اُسے موتی سے بہت زیادہ محبت ہوتی جاتی ہے۔ اور خود موتی روز بروز اُس کو بہت چاہنے لگا۔ ثریا جب باہر سے آتی تو دیکھتی دروازے پر موتی اُس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اُسے دیکھتے ہی بیقرار ہو جاتا۔ لپک کر اپنا سر اُس کے قدموں پر رکھ دیتا۔ دیوانہ وار ناچتا، کودتا، اس کے جوتوں کو چاٹتا اور دو ٹانگوں پر کھڑے ہو کر ثریا کے ہاتھ چاٹنے لگتا اور طرح طرح کی آوازیں نکالتا اور ثریا اُسے اُٹھا لیتی، پیار سے سہلاتی۔ تھپکتی اور بھینچ بھینچ کر چمٹاتی۔ اور اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ اور سوچتی کہ موتی کی محبت پر لوگوں کو کیوں اعتراض ہے۔ اس میں کیا عیب ہے اور کتے سے اس حد تک محبت کرنے کو لوگ کیوں بُرا سمجھتے ہیں۔

ثریا کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کہ گھر میں بھائی بہنوں کی موجودگی پر بھی موتی ہی اُس کو سب سے زائد چاہتا ہے۔ آج تک کسی بہن یا بھائی نے ثریا سے اس طرح محبت نہ کی تھی جیسی موتی کرتا تھا۔ ابھی جب ثریا بیمار ہوئی تھی۔ سگے بہن بھائی نے وہ برتاؤ کیا تھا جس کی ثریا کو اُمید بھی نہ تھی۔ لیکن موتی نے جانور ہوتے بھی اُس سے ایسی ہمدردی ظاہر کی جو انسان بھی نہ کرسکتا تھا۔ پھر موتی رات گئے تک ثریا کا انتظار دیکھتا اور اُس وقت تک نہ ہٹتا جب تک وہ نہ آجاتی تھی۔ اسی لئے ثریا دنیا کی ہر چیز سے زیادہ موتی کو چاہتی تھی۔ کبھی کبھی ثریا موتی سے باتیں بھی کرتی۔ ایک دن ثریا کہنے لگی: "میرے ساتھی! لوگوں کو ہماری محبت ایک آنکھ نہیں بھاتی، وہ کہتے ہیں۔ انسان کو انسان سے محبت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ بے لوث محبت آدمی ہی سے ہو سکتی ہے۔ حیوانوں سے نہیں۔" اور موتی کہتا: "جھوٹ۔ آجکل انسانوں میں محبت نام کو نہیں ہے۔ وہ محبت کے بدلے محبت نہیں کرتے ہیں۔ اُن کی محبت میں دکھاوا ہوتا ہے۔ کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے لیکن ہم تو بے لوث محبت کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی محبت انسانوں کی محبت پر بھاری ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" ثریا پوچھتی۔

"میری ماں نے مجھے اذعان دی، جوئی محبت کے بہت سے

قصے سناتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھی انسان افضل ہوتے ہوئے بھی حیوانوں سے بدتر ہے۔"

"ایسی کڑوی باتیں انسان کے بارے میں کہہ رہے ہو اگر کوئی سُن لے تو مار ہی ڈالے۔"

"اپنی کمزوری سُن کر آپے سے باہر ہو جانا بھلا یہ انسان کا کام ہے؟"

ثریا موتی کو گلے سے لگا کر کہتی: "ٹھیک کہتے ہو موتی انسان ابھی بہت پست ہے۔"

ثریا اپنے بے زبان ساتھی سے کہانیاں کہتی تو موتی بڑے غور سے سُنتا جیسے وہ بہت زیادہ منہمک ہے۔ کبھی کبھی ثریا موتی سے اپنے دل کی باتیں بھی کہہ ڈالتی تھی۔ اور موتی چپ چاپ سب کچھ سنا کرتا تھا۔

موتی بڑا ہوا تو اُس نے ثریا کو خود پر بہت مہربان پایا۔ وہ اُس کی مالکن بھی تھی اور ایک دوست بھی۔ بڑا ہو کر موتی بہت خوبصورت نکلا اور ثریا اُس کی خوبصورتی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔

ایک دن موتی سے ثریا کہنے لگی۔ "تم کتنے خوبصورت ہو موتی" اور موتی کوں کوں کر کے کہنے لگا: "کیا تمہیں میری خوبصورتی سے محبت ہے، مجھ سے نہیں؟"

"نہیں میں تو تمہیں اس لئے چاہتی ہوں کہ تمہاری محبت بے لوث اور بے پناہ ہے۔"

"اگر میں بدصورت ہوتا تو تم مجھ سے محبت کرتیں؟"

"اتنی ہی موتی——"

"سب آدمی تمہاری طرح نہیں ہیں۔ وہ خوبصورتی سے محبت کرتے ہیں اور خوبصورتی تو مٹ جانے والی چیز ہے۔ اسی لئے اُن کی محبت بھی مٹ جاتی ہے۔" اور یہ کہہ کر موتی ثریا کی گود میں بیٹھ گیا اور دُم ہلانے لگا۔ اور ثریا اُسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔

ایک دن ثریا نے موتی سے شرارت کی۔ وہ چھپ گئی۔ موتی نے جب اُسے کمرے میں نہ پایا تو ڈھونڈنے لگا۔ کونہ کونہ دیکھ ڈالا۔ لیکن ثریا کہیں نہ ملی، موتی کی آنکھوں میں اُداسی آگئی۔ باغ سے مالی نے موتی کو پکارا۔ وہ موتی کو کھانے کو دینا چاہتا تھا۔ موتی نے دیکھا لیکن باغ میں جانے کے بجائے پھر ثریا کو ڈھونڈنے لگا اور چلّانے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو! مالکن تم کہاں چھپی ہو۔ آجاؤ

مجھے کیوں ستاتی ہو" اور جوں ہی ثریا سامنے آئی موتی اُچک کر ثریا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ کبھی اُچک کر ثریا کے ہاتھ چومتا کبھی ٹانگوں سے جسم رگڑتا پھر شکایت کرتا :- "تم کہاں چلی گئی تھیں۔ مجھے اتنا ستاتی کیوں ہو؟" ثریا ہنس کر کہنے لگی :-

"میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تمکو مجھ سے کتنی محبت ہے"

موتی نے یہ سُنا تو جیسے اُسے بُرا لگا تھا اور دور جا کر بیٹھ گیا لیکن کنکھیوں سے دیکھتا رہا اور کہنے لگا۔

"تمہیں ابھی تک میری محبت پر شک ہے۔ یقین مانو دنیا میں سب سے زیادہ میں تم کو چاہتا ہوں"

جب ثریا نے موتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو ہنس دی اور جا کر گود میں موتی کو اُٹھا لیا اور کہنے لگی :- "معاف کردو میں تو ہنس رہی تھی"

موتی کہنے لگا "یہ انسانی کمزوری ہے۔ شک انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ اسی پر شک کرتا ہے جو اُس پر جان چھڑکتا ہے"

ثریا نے موتی کا مُنہ سامنے کر لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی "اب معاف کردو، آئندہ کبھی ایسی خطا نہ ہو گی" ثریا ہنس دی اور موتی کی دم ہلنے لگی۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ موتی بھی مان گیا —!

جب ثریا اسکول جانے لگتی تو موتی اُس کی ٹانگوں کے بیچ میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ وہ کہتی :-

"اسکول نہیں جانے دو گے؟" اور موتی مُنہ اُٹھا کر کہتا "دن بھر میں اکیلا کھیلتا ہوں" اور جب ثریا اُسے الگ کر کے چلی جاتی تو موتی اس طرح کروٹ سے بیٹھ جاتا کہ پچھلی ٹانگیں سکڑ جائیں اگلی ٹانگیں آگے پھیل جائیں۔ موتی کا مُنہ کھل جاتا اور زبان نکال کر ہانپنے لگتا، سفید دانت دکھائی دینے لگتے۔ موتی ثریا کو جاتا دیکھتا اور جب وہ سیڑھیاں طے کر لیتی تو وہ بھی پھاٹک پر جا کر بیٹھ جاتا اور ثریا کی واپسی کا انتظار کرتا اور جوں ہی ثریا آتی موتی اُچھلنے کودنے، دم ہلانے لگتا اور ثریا اُسے اُٹھا لیتی پھر شکایتیں شروع ہوتیں۔ موتی قیوں، قیوں، کوں کر کے کہتا :-

"مجھے کیوں نہیں لے گئیں؟" ثریا ہنس کر کہتی :-

"بات یہ ہے موتی اسکول میں تم نہیں جا سکتے۔ کیونکہ تم کو لوگ نجس خیال کرتے ہیں"

"نجس از میں" موتی پوچھتا۔

"ہاں موتی لوگ کہتے ہیں جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے۔ یہ باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں۔ کیونکہ لوگ تو توہم پرست ہیں"

"پھر آدمیوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں کتّوں کا ذکر کیوں آتا ہے۔ کتّوں کی کیوں تعریف کی جاتی ہے۔ کتّوں کی وفاداری کے قصّے کیوں لکھے جاتے ہیں؟"

"یہ بھی انسان کی جہالت ہے اور کیا ہے؟"

"تم اسکول میں یہی سیکھتی ہو کہ دوسروں سے نفرت کرو دوسروں کو ذلیل خیال کرو۔ تمہارے اسکول میں کیا نفرت کرنا تو حقارت کرنا ہی سکھایا جاتا ہے؟"

"ہمارے اسکولوں میں اور رکھا ہی کیا ہے۔ یہی نفرت، حقارت، بغض و عناد — یہ سب ہم اسکولوں سے سیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں"

"وفاداری اور محبت کتّوں کو ملی ہے۔ کیا یہ خوبی ایسی نہیں کہ انسان ہم سے محبت کا سلوک کرے؟"

پھر موتی ثریا کے ساتھ باغ میں کھیلتا۔

ثریا پیڑوں کی آڑ میں ہو جاتی اور موتی اُسے ڈھونڈتا پھرتا تھا —!

موتی کو پا کر ثریا یہ سمجھی موتی ہی اُس کی زندگی کا ماحصل ہے، لیکن اس کا نظریہ غلط نکلا۔ اور قسمت نے اُسے رشید سے ملا دیا — معصوم ثریا جب رشید سے ملی تو سب کچھ ہار بیٹھی۔ اپنا دل، اپنی محبت، اپنی زندگی اور قسمت بھی۔ اُسے رشید سے بھی یہی توقع تھی۔ رشید اُس کی دنیا پر جنت بنکر چھا گیا۔

ایک دن ثریا نے اپنے محبوب کو اپنے بے زبان دوست سے ملایا۔ موتی نے جب رشید کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ تیوریاں چڑھ گئیں، مُنہ سکیڑ کر غرانے لگا لیکن جب ثریا نے موتی کو بتایا کہ وہ اس کا محبوب ہے تو وہ بھی دم ہلانے لگا۔ جب رشید چلا گیا تو ثریا کہنے لگی :-

"تمہیں رشید پسند آیا میں اُس سے محبت کرتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں تم بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرو جیسی مجھ سے کرتے ہو" موتی دم ہلانے لگا گویا کہہ رہا ہو ایسا ہی ہوگا ثریا

پھر بولی :

"میں اس سے شادی کرنی چاہتی ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟"

"تمہیں اختیار ہے لیکن دھوکا نہ کھانا"

اور ثریا نے موتی کو گود میں لے کر کہا :-

"رشید بہت معصوم ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ محبت کرتا رہیگا"

"پھر تم خوش قسمت ہو"

اس رات ثریا نے موتی سے بہت کم باتیں کیں۔ وہ کسی حسین تخیل میں محو تھی۔ ثریا جدھر دیکھتی اُسے رشید دکھائی دیتا تھا۔ موتی چپ چاپ ثریا کو محبت بھری نظروں سے گھورتا رہا اور ثریا اپنے محبوب سے باتیں کرتی رہی ----

ثریا روز بروز رشید سے نزدیک تر ہوتی گئی اور موتی سے دور۔ اب اس کی محبت تقسیم ہو چکی تھی۔ اس کی تمام محبت پہلے صرف موتی کے لئے تھی لیکن اب رشید بھی اس کی محبت کا حصہ دار بن گیا تھا۔ ثریا نے رشید کو بھی اپنی محبت کا شریک کر لیا۔ اور ایسا کرنا تقاضا ئے فطرت تھا۔ رشید کو موتی سے نہ معلوم کیوں نفرت تھی۔ وہ متعصب تھا اور چاہتا تھا کہ ثریا کی محبت میں کوئی اور بھی شریک ہو۔ اسی لئے رشید ثریا سے کہتا :-

"تمہیں موتی کیا پسند ہے ؟ جانوروں سے تو اس طرح بچے ہی محبت کرتے ہیں!"

ثریا نے گھبرا کر کہا "بچپن سے میں نے اسے پالا ہے پھر موتی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے!"

رشید نے ہنسکر کہا :- "موتی حیوان ہے ناقص العقل۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور بے پناہ محبت انسان کو عطا کی ہے۔ جانور کو نہیں۔ موقع بموقع رشید موتی کو ثریا کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اور دھیرے دھیرے ثریا موتی کو بھولتی گئی۔ کئی کئی دن ہو جاتے ثریا نہ موتی سے بولتی۔ نہ پچکارتی نہ اُسے سہلاتی نہ گود میں لیتی اور نہ اُسے چومتی۔ موتی کو ثریا کے بدل جانے کا بہت دکھ تھا اور اسی لئے وہ اُداس رہتا تھا !

موتی کو ثریا نے کبھی پھول تک نہ چھلایا تھا۔ لیکن اب وہ موتی کو بید سے مارتی تھی۔ جھڑکتی، ڈانٹتی تھی۔ لیکن اس پر بھی موتی ثریا سے نزدیک ہی رہنے کی کوشش کرتا۔ وہ ابھی تک ثریا کو نہ بھولا تھا اور نہ بھول سکتا تھا۔

ثریا جب کمرے میں تنہا لیٹتی اور رشید کے تصور میں غرق ہوتی تو اسے موتی کی موجودگی بہت کھٹکتی تھی۔ موتی کو وہ کئی بار کمرے میں آنے سے منع کر چکی تھی اور اس کے لئے سزا بھی دے چکی تھی۔ لیکن پھر بھی موتی کمرے میں آ ہی گیا۔ ثریا کو بہت ناگوار ہوا اس نے موتی کو نکل جانے کا حکم دیا اور جب وہ خوشامد کرنے لگا تو اس نے زبردستی موتی کو کمرے سے نکال دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ موتی کو ثریا کی یہ بات لگ گئی۔ وہ بند دروازے کو پنجوں سے کھرچنے لگا۔ اور چیخنے چلانے لگا۔ گویا شکایت کر رہا ہو :- "تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ مجھے کبھی اپنے سے الگ نہ کروگی۔ ہمیشہ محبت کروگی۔ لیکن اب تم بدل کیوں گئیں ؟ تمہیں آخر مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہو گئی ہے"

موتی کی چیخیں ثریا کی نیند میں مخل ہو رہی تھیں۔ ثریا غصہ سے اٹھی، دروازہ کھولا اور باہر نکلی۔ موتی لپکا وہ سمجھا اس کی مالکن اسے گود میں اٹھانے آئی ہے۔ ثریا نے موتی کو گود میں اٹھا تو لیا لیکن بجائے پیار کرنے کے اسے کوٹھے سے نیچے پکی زمین پر پھینک دیا۔ دھم سے آواز آئی اور ساتھ ہی موتی کی چیخ سنائی دی۔ ثریا نے وہ چیخ سنی لیکن مڑی اور کمرے میں چلی گئی۔ موتی کا پیر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ دیر تک بیہوش رہا۔ اس کے منہ سے آہ و کراہیں نکل رہی تھیں۔ اگلے پیر میں غضب کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور چلنے سے معذور تھا۔ لیکن موتی اٹھا لنگڑاتا ہوا کمرے کے پاس آیا۔ اور دروازے سے لگ کر لیٹ گیا اور رات بھر آہ بھرتا رہا لیکن ثریا کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ بدستور ثریا سے محبت کرتا رہا۔ صبح اسے امید تھی ثریا اس کے پاس آئے گی اور چوٹ کو دیکھیگی۔ لیکن ثریا نے موتی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور موتی پڑا روتا رہا !

موتی کو جب محبت کی غذا ملنی بند ہو گئی تو وہ روز بروز دُبلا ہونے لگا۔ کہاں موتی ہر وقت دوڑتا کھیلتا کودتا نظر آتا تھا کہاں اب وہ دن بھر سست اور اداس رہنے لگا۔ اس کی صحت گر رہی تھی اور نئے نئے روگ اُسے ستانے لگے تھے۔ اس کی کھجلی ہو گئی تھی اور اس کی خوبصورتی کو گھن لگنا شروع ہو گیا۔ اور جب

رشید نے موتی کو دیکھ کر اعتراض کیا کہ یہ بہت منحوس روگ ہے تو ثریا نے موتی کو گھر سے نکال دیا۔

ثریا سے الگ ہو کر موتی بڑی دیر تک چلا چلا کر روتا رہا۔ اُسے پچھلی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک دن وہ تھا جب ثریا نے اُسے سردی سے بچایا تھا اُسے پالا تھا۔ اُس سے محبت کی تھی اور آج ثریا ہی نے اُسے نکال دیا۔ کچھ دیر بعد موتی اُٹھا اور شکستہ ہوا گھر کی راہ لی۔ ثریا کی محبت اُسے کشاں کشاں گھر کی طرف لے چلی۔ جہاں ثریا رہتی تھی وہی ثریا جو اُس سے محبت کرتی تھی۔

موتی نیچے ثریا کے کمرے کے نیچے بیٹھ گیا اور اوپر منہ اُٹھا کر بند کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس میں وہ کبھی ثریا کے ساتھ رہتا تھا جہاں ثریا اُس سے محبت کرتی تھی۔ کمرے میں ثریا رشید کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔ نیچے اُسے چاہنے والا موتی اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ موتی کئی دفعہ چلایا گویا کہہ رہا ہو "میں پھر آ گیا ہوں، مجھے آ جانے دو، تم نے تو مجھ سے ہمیشہ محبت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر تم مجھے بھول کیوں گئیں، کیا تمہاری محبت ختم ہو گئی ہے؟"

سردی اور پالے کے باوجود روزانہ موتی رات ثریا کے کمرے کے نیچے ٹھٹھر کر کاٹتا۔ ثریا نے کئی بار اُسے دیکھا لیکن موتی کی طرف منہ تک نہ پھیرا۔ اُسے اب موتی سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ روز بروز غلیظ اور بدصورت ہوتا جاتا تھا۔

محبت کے پردے میں ایک رنگین پھول کھلا، مسکرایا اور پھر مرجھا گیا۔ ثریا نے تصور میں جو محل بنایا تھا وہ گر پڑا۔ ثریا کی محبت مجروح ہو گئی۔ رشید نے ثریا کو دھوکا دیا۔ وہ اُس کی محبت، اُس کے جذبات سے کھیلتا رہا اور پھر منہ موڑ لیا۔ رشید کی جذباتی محبت بھی جذبات کے ساتھ ختم ہو گئی۔

ثریا اپنی سب سے قیمتی چیز ہار چکی تھی۔ اب اُس کے پاس کیا تھا۔ وہ بالکل تہی دست تھی۔ ثریا زندگی میں پہلی مرتبہ اندھیرے میں پڑی رو رہی تھی اپنی قسمت کو، اپنی محبت کو۔ ثریا طرح پہلی مرتبہ دکھ سے دوچار ہوئی۔ آج پہلی مرتبہ اُس کے نازک دل پر کاری زخم لگا اور وہ اُسے برداشت نہ کر سکی جب ثریا پر دکھ پڑا تو اُسے ایک غمگسار کی ضرورت محسوس ہوئی اور پہلی مرتبہ آج ثریا کو اپنا بھولا ہوا موتی یاد آیا۔ اُس کی بے پناہ محبت پھر یاد آئی۔ اُس کی خدمتیں اور پیار یاد آیا جسے خود ثریا نے کھو دیا تھا۔ اور آج اُسے اس کا احساس ہوا کہ موتی کو کھو کر اُس نے زندگی کی سب سے قیمتی چیز کھو دی ہے۔

ثریا کو محسوس ہوا جیسے موتی اُس کے بستر پر آ گیا ہے اور دم ہلا رہا ہے۔ ثریا نے گلوگیر آواز سے کہا:- "مجھے معاف کر دو موتی! میں تم کو بھول گئی۔ میں نے تم کو دُکھ دیا ہے۔ موتی مجھے معاف کر دو۔"

"میں اس لئے آیا ہوں کہ تم نے مجھے یاد کیا تھا۔ تم دکھی ہو میں تمہارے دکھ میں شریک ہونے آیا ہوں۔ تم کو پچھلی باتیں یاد دلانے نہیں آیا۔"

"لیکن کیا تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہے موتی۔ کیا میں نے تمہاری ٹانگ نہیں توڑی تھی؟"

اور موتی کہنے لگا:- "میں یہ باتیں بھول گیا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب تم نے مجھ پر ترس کھا کر کوٹ میں چھپا لیا تھا۔ مجھے تمہاری محبت ابھی تک یاد ہے۔"

اور جب ثریا نے موتی سے رشید کی شکایت کی تو وہ کہنے لگا "آدمی کی باتیں آدمی ہی جانے وہ اشرف المخلوقات ہے۔ ہم جانور ناقص العقل آدمی کی باتیں بھلا سمجھ سکتے ہیں؟ مجھے محبت کرنا آتا ہے بھلانا نہیں اور آدمی محبت کر کے بھلا بھی دیتا ہے۔ اسی لئے وہ شاید جانوروں سے افضل ہے۔"

اور جب ثریا نے موتی کے گلے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا خواب ٹوٹ گیا۔ ثریا کو موتی کی یاد آ گئی اور موتی کے لئے رونے لگی۔ ثریا کو یاد آیا لنگڑا موتی روزانہ اُس سے ملنے آتا تھا۔ لیکن وہ کسی دن بھی موتی سے نہ ملی لیکن کچھ دنوں سے موتی دکھائی نہ دیا تھا۔ موتی کے بارے میں بُرے خیالات ثریا کے دماغ میں آنے لگے اور وہ خیالات اُسے رات بھر ستاتے رہے۔

دن بھر ثریا موٹر میں بیٹھی گلی گلی، سڑک سڑک موتی کو ڈھونڈتی پھری۔ اُس کی صرف ایک تمنا تھی کہ وہ موتی کو ایک بار دیکھے اُسے سینے سے لگا کر چومے اور اس طرح اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔

ثریا نے ایک دن موتی کو ایک گھورے پر پڑا دیکھا۔ اُسے دیکھتے ہی ثریا کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ موٹر گھورے کی طرف

مُردہ سی۔ موتی بہت بُری حالت میں تھا۔ موتی کا جسم سڑ چکا تھا جسم پر ہزاروں زخم تھے جن پر مکھیاں بیٹھی اُنہیں خار بنانے دیتی تھیں۔ ایک کان کٹ کر گر چکا تھا۔ دوسرا گرنے کے قریب تھا۔ موتی کی صورت مسخ ہو چکی تھی۔ اُس کے پاس سے بدبو اور سڑاہند آ رہی تھی۔ موتی بار بار سر جھٹکتا لیکن مکھیاں اُڑنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں اور موتی تکلیف کی وجہ سے گھورے کو کُریدنے لگتا۔ گویا وہ اُس میں پناہ لینا چاہتا تھا۔ ثریا موتی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی —!

لوگوں نے ایک عجیب بات دیکھی اِس عجیب! بالکل عجیب! ایک شاندار موٹر گھورے کے قریب رُکی جہاں جگہ جگہ غلاظت بھی پڑی تھی۔ اس میں سے ایک خوبصورت، نوعمر، پوش فیشن ایبل لڑکی اُتری اور سڑے جسم والے کتے کے پاس جاکر پکارنے لگی۔ "موتی — موتی —"

معلوم نہیں ان دو لفظوں میں کیا اثر تھا کہ موتی اپنا گھناؤنا اور سڑا جسم لے کر دوڑ پڑا اور ثریا کے پاؤں پر لوٹنے لگا۔ اور ثریا نے سڑاہند، بدبو اور زخموں کا خیال نہ کرتے ہوئے اُسے گود میں اُٹھا لیا — مدت کے بچھڑے ہوئے آج پھر مل گئے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو ہکا بکا رہ گئے۔ اُنہوں نے حیوان اور انسان کو کبھی اس قدر نزدیک نہ دیکھا تھا۔ اُنہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ موٹر میں پھرنے والی لڑکی گھورے پر پڑے ہوئے سڑے گلے جسم والے کتے کو اُٹھا کر سینے سے بھی لگا سکتی ہے۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟ لیکن وہ کیا جانیں اس کو تو موتی اور ثریا ہی جانتی تھی۔ اُنہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جانور انسان سے زائد محبت کرتا ہے اور حیوانوں کی محبت انسان کی محبت سے کہیں زائد بے لوث اور بے پناہ ہوتی ہے۔

ثریا اپنے پُرانے دوست موتی کو پاکر اپنے تمام دُکھ بھول گئی۔ رشید کی بے وفائی سے اُس کے دل میں جو زخم پڑ گئے تھے وہ موتی کے مل جانے سے پھر مندمل ہو گئے۔!

لیکن ثریا نے موتی کی بہت دیر بعد خبر لی۔ موتی کا عضو عضو سڑ چکا تھا۔ موتی کے اب آخری ایام تھے۔ لیکن ثریا اس کوشش میں تھی کہ موتی اچھا ہو جائے۔ اگر موتی نہ رہا تو وہ دنیا میں بالکل تنہا ہو جائیگی۔ موتی ہی تو اب اُسکا ساتھی تھا اور جب وہ نہ رہیگا تو وہ کیسے زندگی گذار سکیگی۔ زندگی میں رشید ایسے جھوٹے دوست اور رفیق تو بہت مل جائیں گے۔ لیکن موتی کی طرح محبت کرنے والا سچا رفیق کہاں ملیگا؟

ثریا موتی کے سڑے جسم پر خود دوا لگاتی اور خود ہی موتی کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ خوبی اُس کی خدمت کرتی — شاید ثریا اپنے قصوروں کی تلافی کر رہی تھی۔

لیکن منحوس بیماری نے موتی کو بُری طرح جکڑ لیا تھا اور آخر کار اُسی نے موتی کی جان لے لی — موتی کی موت نے ثریا کے زخموں کو ٹھیس لگا دی، اُس کے زخم پھر رسنے لگے۔ وہ اتنا پھوٹ پھوٹ کر روئی معلوم ہوتا تھا جیسے ثریا کا کوئی عزیز مر گیا ہے۔ ثریا کے رونے پر اُس کے بھائی بہن ہنستے تھے کہتے "کتے کے مرنے کا اتنا کیا غم؟" وہ تو آدمی کے مرنے پر چند آنسو گرانا جانتے تھے۔ اور وہ بھی وقتی طور پر۔ وہ اس لئے روتے کیونکہ سب روتے تھے لیکن شاید ہی کسی کو مرنے والے سے ہمدردی ہوتی ہو۔ اسی لئے وہ ثریا پر ہنسا کرتے۔ ثریا کے آنسو دکھاوا نہیں تھے —!

ثریا کو یہ اچھا نہیں لگا کہ موتی کی لاش گھورے پر پھینکی جائے۔ اُس کی لاش گھورے کے لائق نہ تھی۔ کیونکہ اس سڑے ہوئے جسم کے اندر ایک محبت کرنے والا دل تھا۔ ایک محبت کرنے والی روح پوشیدہ تھی۔ اور جس میں ایسا دل اور ایسی روح ہو وہ گھورے پر نہیں پھینکا جاسکتا — ثریا نے موتی کو وہیں گلاب کے پودوں کے جھنڈ میں گاڑ دیا۔ جہاں اس نے پہلی مرتبہ موتی کو ٹھٹھرتے ہوئے پایا تھا۔!

ثریا اکثر موتی کی قبر کے پاس بیٹھ کر وہ دن یاد کرتی تھی جب اُس نے پہلی مرتبہ موتی کو پایا تھا اور وہ اُسے کوٹ میں چھپا کر اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ وہاں اُس نے موتی کا نام رکھا تھا۔ اس وقت وہ بالکل بچہ تھا۔ وہ اس سے کھیلا کرتی تھی۔ اس کو گدگداتی اور ستاتی تھی اور وہ بھی اُس سے کھیلتا تھا۔ پھر موتی بڑا ہونے لگا اُس کی محبت بھی پختہ ہوتی گئی۔ آج بھی موتی کا مچلنا ثریا کو یاد تھا۔ جب وہ اسکول جاتی تو موتی ساتھ جانے کے لئے مچلتا تھا، جب وہ واپس آتی تو موتی کو اپنا منتظر پاتی تھی۔ اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب دونوں نے ایک دوسرے کو کبھی نہ بھولنے کا عہد کیا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیسے رشید ثریا کی زندگی میں داخل ہوا اور ثریا موتی کو بھولنے لگی۔ ثریا کو وہ دن یاد آیا جب اُس نے نہایت بے دردی کے ساتھ موتی کو کوٹھے پر سے پھینکا تھا اور

اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن موتی اس پر بھی اس سے محبت کرتا رہا۔ اُس نے موتی کو نکال دیا۔ لیکن وہ پھر بھی ثریا کو نہ بھولا —— اور پھر وہ دن بھی یاد آیا جب رشید نے اس کی محبت ٹھکرا دی اور اُس کے جذبات کو کچل دیا۔ اب ثریا اکیلی تھی۔ اس دکھ میں اُسے موتی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ موتی کو ڈھونڈنے نکلی اور موتی اُسے مل گیا لیکن بہت بری حالت میں۔ لیکن اس پر بھی اُس نے موتی کو چھپا لیا تھا اور مدت کے بعد موتی کو چھپانے میں اُسے کتنا لطف آیا تھا۔ ثریا کے دل پر موتی کی محبت کے بہت سے نقوش بن گئے تھے۔ ثریا رشید کی محبت اور موتی کی محبت کا موازنہ کرتی تھی تو اُسے موتی کی محبت گہری اور وزنی دکھائی دیتی تھی۔

ثریا گھنٹوں موتی کے تصور میں غرق رہتی وہ جدھر نگاہ اُٹھاتی اُسے موتی دم ہلاتا نظر آتا تھا۔

ثریا کو انسان اور حیوان کی محبت کا فرق معلوم ہو گیا تھا انسان کی محبت جھوٹی جذباتی اور مصنوعی ہوتی ہے۔ اس کی محبت میں کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ لیکن حیوان کی محبت، غیر جذباتی سچی پائیدار اور بے لوث ہوتی ہے —— انسان کی محبت فانی اور حیوان کی غیر فانی ہوتی ہے ——

اگر ایسا نہ ہوتا تو موتی ثریا کے گھر کے چکر کیوں لگاتا جبکہ ثریا نے اسے گھر سے دھتکار کر نکال دیا تھا۔ وہ کونسی چیز تھی جو موتی کی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد بھی اُسے ثریا سے الگ نہ کرنے دیتی تھی ——؟ کیا وہ موتی کی بے لوث محبت نہ تھی؟

جس میز پر پہلے رشید کا فوٹو رکھا تھا۔ وہاں اب ثریا نے موتی کی تصویر رکھ دی۔ اُس نے باغ میں موتی کی ایک تصویر لی تھی جب وہ ثریا سے کھیل رہا تھا۔

ثریا کو جب موتی یاد آتا اور اُس کی محبت کی یاد آتی تو وہ موتی کی تصویر سامنے رکھ کر اُس سے پریم کی باتیں کرتی اپنے بچپنے سا تھی سے اپنے جگری دوست سے جو اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور مرنے کے بعد بھی وہ اُس کے دل کے قریب تھا۔ اس وقت ثریا کو ایسا محسوس ہوتا جیسے کہ وہ خود سامنے کھڑا دم ہلا رہا ہے اور اس کے ہاتھ چاٹ رہا ہے اور کہہ رہا ہے "میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہونگا —— میں تم کو کبھی نہ بھولونگا —— اور تم؟" ٭

ثریا کو ہر طرف موتی ہی موتی نظر آتا —— ثریا کی زندگی اب موتی کی یاد پر منحصر تھی ——!!!

٭ اور ثریا پھر تڑپ کر کہتی: "میرے موتی اب میں سوائے تمہارے اور کسی سے محبت نہ کرتی ہوں اور نہ کروں گی ——" اور ثریا تصور میں موتی کو چھپا لیتی اور موتی کی دم زور زور سے ہلنے لگتی۔

آسی رام نگری

پیٹ کی آگ

نیرا بنگالے کا جادو ہے ——— چاند پور کے تالاب میں کھلے ہوئے کنول کی طرح حسین! نیرا چاند پور کے ایک گھر میں کھلی ہے ——— اب تک وہ کھلے ہوئے کنول کی طرح حسین تھی۔ اُس کی آنکھوں میں رما جادو ہماری دنیا کے انسانوں کو جانور بنا کر رکھنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنی ساری قوت کسی ایک کو باندھ لینے کے لئے مجتمع کر رہا تھا۔

نیرا کا باپ کما کر لاتا۔ ماں گھر کا خرچ چلاتی۔ جگیش اسکا چھوٹا بھائی اس سے جھگڑتا۔ پھر منا تا اور پھر روٹھ جاتا۔ تھوڑے سے روپے۔ زیادہ خوشی ——— یہی انہوں نے زندگی میں پایا تھا۔ اور یہ کافی تھا۔ ان کی زندگی کے دن سکھ چین سے گزر رہے تھے۔

لیکن اب نیرا پر اندوہ و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ صاف و شفاف پانی میں وفورِ مسرت سے جھومتا ہوا کنول تیز و تند بادِ سموم کے تھپیڑوں سے کمھلا جاتا ہے۔

بات پہیلی بنتی جا رہی ہے۔ اس لئے شروع سے بتانی پڑیگی ——— نیرا چودھویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ جادو اب کسی کو باندھ لینے کو اور خود بندھ جانے کے لئے بیتاب و بیقرار ہو رہا تھا۔

نیرا کی ایک سہیلی تھی۔ پورنیما۔ اس سے کچھ بڑی حال ہی میں اُس کی شادی ہوئی تھی اور یہ غالباً آپ بھی جانتے ہوں گے کہ نئے شرابی کو زیادہ نشہ چڑھتا ہے۔ پورنیما کی آنکھیں جوانی کے خمار سے مدماتی رہتی تھیں۔ رفتار میں مستی آ گئی تھی۔

ہر وقت ساتھ رہنے والی نیرا بھی جوانی کی شراب سے مست و مخمور سہیلی کی بہکی بہکی باتوں سے اکتسابِ سرور کرنے لگی۔ لیکن مستی زمیدائے شورِ تاتھل: کے؟ اس کا جوان دل دھڑک کر کہتا ——— "لذتِ بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی!"

پورنیما کا بھائی بسنودھ کلکتہ کالج میں پڑھتا تھا۔ پوجا کی تعطیلات میں گھر آیا۔ نیرا نے اُسے دیکھا ——— دل نے کہا پھر دیکھو۔ شرمگیں آنکھوں نے کہا نہیں۔ اور جھک گئیں ——— بسنودھ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ کالج میں ڈھیری ڈھیر کتابیں پڑھنے کے بعد بھی نیرا کو پڑھنے سے قاصر رہا۔ ہاں اتنا ضرور سمجھ سکا کہ نیرا اُسے اچھی لگی۔

دیکھتے دیکھتے دونوں کے دلوں میں محبت کی آتش بے دود سلگنے لگی۔ رفتہ رفتہ پورنیما کا گھر نیرا کا مندر بننے لگا ——— اور گرد و پیش کے حسین پارک چھوڑ کر نیرا کے گھر کے سامنے ٹہلنا بسنودھ کا معمول ہو گیا۔

پورنیما نے دیکھا تو دل ہی دل میں مسکرا پڑی۔ شرابی نے آگے بڑھ کر نیا ساتھی بنانے کی ٹھانی۔ لیکن اُس نے سوچا غیر قانونی شراب تیز تو ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا پینا جرم بھی ہے۔ رہے پینے والے۔ تو یہ وفورِ شوق میں گرد و پیش اور نشیب و فراز پر کب نظر رکھتے ہیں۔

ایک روز پورنیما نے نیرا کو پکڑ لیا۔ اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال، گال سے گال ملا کر شام کے دھندلکے میں اسکا دل ٹٹولنے لگی۔ نیرا کے دل میں نیا چور تھا۔ چھپا نہ سکی۔ اور سہیلی کے ہاتھ لگ گیا۔ نیرا شرم سے کٹ کٹ گئی ——— پورنیما نے سنہری شام میں نیرا کا سنہرا منہ ٹھوڑی پکڑ کر اپنی طرف کر کے مسکراتے ہوئے کہا "میری اچھی نیرا! اگر بہن سے بھابی بن جاؤ تو کیا حرج ہے؟ اس طرح دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہ کر سکیگی اور بھیا کے دل کی کلی بھی کھل جائے گی!"

نیرا نے اپنے جسم میں ایک سرور بخش ارتعاش محسوس کیا۔ اُس نے دھیرے سے پلک کھول کر پورنیما کو دیکھا اور بھابی ہونے کے رشتہ سے اُس کا پاؤں چھونے لگی۔ پورنیما نے مسکرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "پاؤں بھیا کے چھونا" اور وہاں سے چلی گئی۔

نیرا کے دل میں جذبات کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ لیکن منہ سے ایک لفظ نہ بول سکی۔ اُس کا جی چاہا پورنیما کے پیچھے پیچھے وہ بھی چلی جائے۔ لیکن نسوانی شرم و حیا پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

جھلملاتے ہوئے تاروں اور مسکراتے چاند کو شاہد بنا کر ایک پُرسکوت و کیف بار رات میں سبودھ اور نیرا نے پیمانِ محبت باندھا ---- سبودھ۔ نیرا اور پورنیما کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اُن کا خواب آرزو شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا۔ انہیں جاپان کی لڑائی سے کوئی غرض تھی نہ جرمن کی جنگ سے سروکار۔ بستی دنیا اُجڑتی دنیا کو بھول جانا ہی چاہتی ہے۔

ایک روز نیرا خوب روئی ---- سبودھ کلکتہ جا رہا تھا ---- تینوں نے مشورہ کر لیا تھا کہ کسی روز پورنیما یا اُس کی ماں نیرا کی ماں سے سب کچھ کہہ دیں گی۔ پھر بھی نیرا کے آنسو نہ تھمتے تھے۔

نیرا کی ماں سے ساری باتیں طے کر کے پورنیما بھی اپنی سسرال چلی گئی ---- نیرا بار احسانمندی سے دبی جا رہی تھی۔ اس نے چپکے سے سُنا کہ پورنیما کی بات سے اُس کے ماتا پتا کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ تو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر کچھ گنگنانے لگی۔

کہتے ہیں قسمت کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی ---- نیرا نے ایک روز سُنا کہ چاول کا بھاؤ چڑھ گیا۔ پھر تو روز ہی یہی سنتی رہی گھر میں کھانا کم پکنے لگا۔ کیونکہ اُس کے باپ کی تنخواہ تو گرانی کے ساتھ ساتھ بڑھی نہ تھی۔ اُس کے ماتا پتا اُداس رہنے لگے معصوم جوگیش کا منہ سوکھنے لگا۔

بجلی کی تیزی کے ساتھ چاول گراں ہونے لگا۔ کمانے والوں کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ حواس بجا نہ رہے۔ نیرا نے اپنے حصے کا کھانا جوگیش کو کھلانا چاہا۔ لیکن دُکھ تو بچے کو بھی بوڑھا بنا دینے کی طاقت ہوتی ہے۔ غریب جوگیش بھی سب کچھ سمجھنے لگا تھا۔

چاندپور میں چاول کہاں؟ دکانیں خالی ہو گئیں۔ کلکتہ سے سارے بنگال سے۔ اور بھی خوفناک خبریں آ رہی تھیں۔ سڑک اور فٹ پاتھ پر آدمیوں کے بھوکوں مرنے کی خبریں ----
نیرا نے سوچا سبودھ بھی کلکتہ میں ہیں۔ کون جانے انکا کیا حال ہوگا سنتی ہوں وہاں بھی چاول نہیں ملتا۔ بے رحم وہ بھوکے رہتے ہونگے۔ بھوکے رہتے تو امتحان کیسے دیں گے؟ اسے کالی ماں اُنہیں تکلیف نہ ہو ۔۔۔۔

ایک روز اُس نے سُنا پورنیما کی سسرال والے گھر لیکر بچھر چلے گئے۔ روپے والے کو کس چیز کی کمی؟ اگر چاول اُن کے پاس نہ آئے تو وہ چاول کے پاس جا سکتے ہیں۔

اُف۔ چاندپور میں بھی تو لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ چاول ہے تو لیکن بنیوں کے پیٹ میں چھپا ہے۔ موتیوں کے بھاؤ ملتا ہے۔ اور غریب کہیں موتی خرید سکتے ہیں؟ نیرا دبلی ہو گئی۔ بھوک سے بڑھ کر اور کون بیماری ہوگی؟

چاندپور میں اب کوئی ہنسنے والا نہ رہا۔ سب چپ چاپ اُداس خشک منہ لئے۔ چاول کے مسئلے پر غور کرتے۔ اناج کی کمی ہی سب کی گفتگو کا موضوع بن گئی تھی۔

نہ جانے کہاں سے آنے والے آ کر سڑک پر بھی مرنے لگے۔ بھوک سے نڈھال۔ فاقوں کے مارے ہوئے۔ نیرا کی کھڑکی کے سامنے بھی کل تک ایک کنبہ پڑا تھا۔ ایک دم بھوتوں کی طرح چیتھڑوں میں لپٹا ہوا۔ آخر آج ابھی ابھی اُس کنبے کا آخری فرد چل بسا ---- نوجوان عورت اور ماں! اُس نے پہلے جوانی کھوئی پھر بچہ۔ اخیر میں شوہر کھو کر اب خود بھی چل بسی۔

جب لوگ اُسے اُٹھا کر چلے تو نیرا کانپ اُٹھی۔ اُس نے سوچا کبھی اُن کا بھی یہی حال ہوگا۔ سبودھ اور پورنیما آنکھوں سے اوجھل تھے۔ بھوک کی تکلیف میں آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن نیرا اُنہیں بھولی نہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ حالات سازگار ہو جائیں گے تو بچھڑے ہوئے پھر ملینگے۔

فاقہ مستی کی بھڑکی ہوئی آگ کے شعلوں کی لپٹ سے نیرا کا گھر کیسے محفوظ رہتا؟ تین دن سے اس کے گھر میں ایک دانہ نہ پکا۔ معصوم جوگیش مردہ سا پڑا تھا۔ ماں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ باپ سارے دن نہ جانے کہاں کہاں خاک چھان کر خالی ہاتھ گھر واپس آیا۔ چاول کا ایک دانہ نہ مل سکا۔

لیکن جوگیش ---- معصوم۔ کمسلایا ہوا پھول۔ اُسے تو بچانا ہی ہوگا۔ یہی تو گھر کا چراغ ہے۔

لیکن نیرا کے بس میں صرف اپنی بھوک چھپا کر بھائی کے سر پر ہاتھ پھیر دینے کے سوا اور کیا ہے؟

بھوک انسان سے سب کچھ کرواتی ہے۔ جب زندگی کی ساری راہیں مسدود ہوگئیں اور موت کے خوفناک جبڑوں سے نجات کی کوئی سبیل نہ رہی تو نیرا کے مشفق والدین کو ظالم دستِ بخشش کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا ۔۔۔۔ انہوں نے ایک روز نیرا سے کہا کہ اگر وہ سبھودھ کو بھول کر ایک بوڑھے سیٹھ سے شادی کر لے تو ان کا گھر مال سے بھر جائے خواہ کتنی ہی گرانی کیوں نہ ہو۔

نیرا نے خوفزدہ آنکھوں سے باپ کا سوکھا منہ دیکھا۔ جلتی آنکھیں۔ جیسے پیٹ کی آگ ان میں روشن ہو۔ ماں کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔ وہ اس سے پیٹ کی بھیک مانگ رہے تھے۔ آج اس کے ماتا پتا نے اس کے آگے ہاتھ پھیلائے تھے۔ پیٹ کی بھیک مانگی تھی۔ ایک طرف فاقوں سے نڈھال بھائی بیہوش پڑا تھا۔ چراغ کو تیل چاہیے ۔۔۔۔ نیرا اپنے دل کو تیل دیگی۔ جو گلشن گھر کا چراغ ہے۔

نیرا نے دل پر پتھر رکھ کر ماں باپ کی بات پر ہاں کہدیا زہر کو امرت کی طرح پی گئی ۔۔۔ بھوکا باپ ٹھنڈی سانس لیتا ہوا سیٹھ کے ہاں چاول لینے چلا گیا۔

نیرا کھڑکی پر سر ٹیک کر سسکنے لگی۔ سبھودھ ..... جو گلشن ..... ماں باپ ..... بھوک ..... گھر کا چراغ ..... اس کی حسین آنکھوں میں یوں آنسو کانپنے لگے جیسے کنول کی پنکھڑیوں میں شبنم کے قطرے لرز رہے ہوں۔ پیٹ کی آگ کے سامنے محبت کی آگ سرد پڑ گئی۔

شفیق والدین نے فاقوں سے مجبور ہو کر چہیتی بیٹی کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا ۔۔۔ لیکن کیا نیرا کے دل میں بھی سبھودھ کی محبت کی آگ بجھ گئی ۔۔۔ ؟ کون جانے۔

(ہندی سے)

اختر نگینوی (تلمیذ خاص داغ دہلوی)

داستانیں

سُنادیں اُنھیں اپنی سب داستانیں — وہ سمجھیں نہ سمجھیں، وہ جانیں نہ جانیں

رموزِ محبت وہی لوگ جانیں — جو اس دشتِ پُرہول کی خاک چھانیں

ستمگر کو کہتی ہے دُنیا ستمگر، — بُرا کیوں وہ سمجھیں بُرا کیوں وہ مانیں

یہ بازار میں حُسن کے دلکشی ہے — کہ چلتی ہیں کھُلنے سے پہلے دُکانیں

خدائی کے دعوی کی سُوجھی بتوں کو — خدا کی ہے قدرت، خدا خود کو جانیں

مرے آبلے کچھ پلاتے جو پانی — نہ رہتیں یہ کانٹوں کی سوکھی زبانیں

رہے دیکھنے ہی کے مژگان و ابرو — چلے تیر کس دن کھنچیں کب کمانیں

تری مست آنکھوں کو کیا جانے کوئی — یہ صہبائے اُلفت کی دو ہیں دُکانیں

ہر اک زخمِ دل نے کہی اپنی اپنی — کہ کھلتے ہیں مُنہ اتنی دیکھیں زبانیں

محبت میں کس کس کو سمجھاؤں یارب — نہ دل مانتا ہے، نہ وہ میری مانیں

اگر دم نہیں ہے تو کچھ غم نہیں ہے — ہوئیں ختم ساتھ اس کے سب داستانیں

غضب ڈھا رہی ہیں نگاہیں کسی کی — کبھی برچھیاں ہیں۔ کبھی ہیں سنانیں

زباں ہے جو اختر تو اُردو زباں ہے

بہت سی ہیں ہندوستاں میں زبانیں

شاہ محمد ممتاز علی آہ مرحوم
(تلمیذ امیر مینائیؒ)

کہاں لایا گیا ہُوں؟

بہت کچھ دے کے ترسایا گیا ہُوں ۔۔۔ مقدر کہہ کے سمجھایا گیا ہوں

تصور اُس کا آ کر لے گیا ہے ۔۔۔ بہت اُس بزم میں آیا گیا ہوں

اُمیدوں سے مری دنیا ہے قائم ۔۔۔ فقط باتوں میں بہلایا گیا ہوں

کسی کا ناز تو یارب نہیں تھا ۔۔۔ جو اُس محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

حسینوں کو نہ چاہوں میں تو زاہد ۔۔۔ یہاں پھر کس لئے لایا گیا ہوں؟

دلِ جاناں میں تھا اب ہوں لحد میں ۔۔۔ کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں

کڑی منزل ہے آگے اس لئے میں ۔۔۔ یہاں دم بھر کو ٹھہرایا گیا ہوں

تبسم سے دلا کر حوصلہ کچھ ۔۔۔ نگاہوں سے میں دھمکایا گیا ہوں

نرالی حسرتیں پکڑے ہیں دامن ۔۔۔ نئے کانٹوں میں اُلجھایا گیا ہوں

مرے چرچے ہیں میری بیخودی سے ۔۔۔ میں جب کھویا گیا پایا گیا ہُوں

محبت چاہتی ہے جان دے دوں ۔۔۔ لگا کر آگ بھڑکایا گیا ہوں

مجھے رستہ بتایا شوخیوں نے ۔۔۔ پتے دے دے کے بھٹکایا گیا ہوں

اسی کوچے میں دل بھر لے چلا آہ
ابھی تو میں نکلوایا گیا ہوں

ناطق گلاوٹھوی

کیفِ غم

جو سرور آمادہ ہو دل میں وہ کیفِ غم نہیں — رنج و راحت اب ہمارے واسطے توأم نہیں

آج بھی کچھ یوں تو اس دنیا میں کل سے کم نہیں — ہے وہی عالم مگر افسوس وہ عالم نہیں

نا سمجھ غم بھی کہیں ہوتا ہے محتاجِ رسوم — ہے جہاں ماتم وہاں لطفِ صفِ ماتم نہیں

کون ہو سکتا ہے بحرِ غم سے سیرابِ ذوق — اے غلط اندیش آبِ تیغ کچھ مرہم نہیں

ہے بلائے جاں تو ہو، پھر زندگی کا ہے شریک — غم نہ ہو تو ہم نہ ہوں گے ہم نہ ہوں تو غم نہیں

دیکھ لو اہلِ چمن رسوائیِ صبحِ بہار — کون سا گل ہے کہ جس پر قطرۂ شبنم نہیں

مٹ گیا کھو کر شریکِ عیش ذوقِ اختلاط — غم ہے اور ہم، اب ہمیں فکرِ شریکِ غم نہیں

چارہ سازِ درد کی کر فکر اے تیماردار — جا ابھی دو چار دن تو اور مرتے ہم نہیں

مردہ دل کیا زندگی کا دیں گے اے ناطق ثبوت
شعر میں کیا جان ہوگی جب ہمیں میں دم نہیں

اطہر ہاپوڑی

پیمانے

اربابِ محبت ہیں سب عقل سے بیگانے
کچھ حسن کے متوالے کچھ عشق کے دیوانے

زاہد انھیں کیا سمجھے واعظ انھیں کیا جانے
یہ حسن کے قصے ہیں یہ عشق کے افسانے

ماہِ رمضاں گزرا سب کھل گئے میخانے
لو بادہ کشو آؤ لبریز ہیں پیمانے

سمجھنے نہ دیا اُن کو کچھ نخوتِ بیجا نے
شرمندہ کیا ہم کو اظہارِ تمنا نے

سمجھا ہے نہ اب سمجھے مانا ہے نہ اب مانے
سب جھوٹ سمجھتا ہے وہ عشق کے افسانے

رگ رگ میں ہے اک نشتر نس نس میں ہے اک خنجر
کی دل میں کھٹک پیدا وہ خارِ تمنا نے

تاریخ نے مجنوں کو دی ہے یہ اہمیت
ورنہ ہیں بہت ایسے اس وقت میں دیوانے

کیا جانیئے وہ کیونکر پھر زندہ ہے دنیا میں
جو تیری ادا کو بھی کم بخت قضا جانے

کعبہ ہو کہ بتخانہ دونوں کو سلام اپنا
ہر قید سے مذہب کی آزاد ہیں دیوانے

افسوس کہ دنیا کو کچھ قدر نہ ہو اس کی
دنیا سے کیا فارغ اک ساغرِ صہبا نے

جب بزم میں آ بیٹھے پروانے بھی ساتھ آئے
جب بزم سے وہ اُٹھے جلنے لگے پروانے

اک جوشِ محبت نے سب قطع کئے رشتے
سب توڑ دیں زنجیریں اک شورشِ سودا نے

حسن اور محبت کی اللہ رے ہمہ گیری
بلقیس و زلیخا کے قرآن میں افسانے

شرم آئی مجھے کہہ کر شرم آئی انھیں سن کر
دونوں کو کیا نادم اک حرفِ تمنا نے

کچھ میرے نصیبوں سے کچھ آپ کی زلفوں سے
یہ رنگ اُڑایا ہے شامِ شبِ یلدا نے

بت اور خدائی کا دعویٰ کریں حیرت ہے
یہ راز ہیں قدرت کے یہ بھید خدا جانے

یہ دیر نشیں اطہر وہ کافرِ الفت ہے
جو بت کو خدا سمجھے جو بت کو خدا جانے

آتا ہے مزا اطہر وحشت کا مجھے اپنی
جب مجھکو وہ کہتے ہیں دیوانے ارے دیوانے!

ترجمہ: عبدالرحیم شبلی (بی۔کام)

نوشتہ۔ شاتوبریان (فرانسیسی)

الحمرا کی آخری شمع

جب غرناطہ کے آخری بادشاہ باب عادل کو اپنے آباؤ اجداد کی سلطنت چھوڑنا پڑی تو وہ افریقہ کی طرف چل دیا۔ رستے میں اس نے پادفل کی چوٹی پر قیام کیا۔ یہاں اس نے اپنے سامنے ایک وسیع و عریض سمندر کو دامن پھیلائے دیکھا۔ یہی وہ سمندر تھا جس کی موجوں کو چیرتے ہوئے اُسے افریقہ پہنچنا تھا۔ دوسری طرف اس نے وفا اور جنیل دریاؤں کو سبزہ زاروں کے درمیان مچلتے دیکھا ان کے ساحلوں پر شاہ فرڈی نند اور ملکہ ایزابل کے خیمے مخروطی میناروں کی طرح اُبھرے ہوئے تھے۔ جب اس نے یہ خوبصورت ملک دیکھا اور سرو کے درختوں کے درمیان اسے مسلمانوں کے مقابر نظر آئے تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سلطانہ عائشہ جو جلا وطنی میں اپنے آقا کے ہمرکاب تھی یہ حالت دیکھ کر بولی۔ "عورتوں کی طرح اس سلطنت کی محرومی پر کیوں روتے ہو جس کی مردوں کی طرح تم حفاظت نہ کر سکے" اس کے بعد وہ پہاڑ پر سے اُترے اور غرناطہ ہمیشہ کے لئے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسپین کے موروں کا بھی وہی حشر ہوا جو ان کے بادشاہوں کا ہوا تھا۔ اس لئے وہ بھی افریقہ میں پھیل گئے۔ جمیلی اور زجری قبائل نے فیض کی راہ لی۔ وناعنہ اور آلبی اُذران سے الجزائر تک پھیلے ہوئے ساحل سمندر پر آباد ہو گئے اور بنو سراج نے تونس کے قرب و جوار میں ڈیرہ ڈال دیا۔ انھوں نے قرطاجنہ کے کھنڈروں میں ایک شہر بسایا جو اپنے قوانین کی نرمی اور خوش اخلاقی کے لئے موری افریقہ میں امتیازی شان رکھتا تھا۔ لیکن ان قبائل کے ذہن سے اپنے پرانے وطن کی یاد مدت تک محو نہ ہو سکی۔ وہ گلستان غرناطہ کو ایک لمحے کے لئے بھی بھول نہ سکے۔ مائیں اپنے بچوں کو بنو زجری اور بنو سراج کی لوریاں دیا کرتی تھیں۔ اور انھیں اپنے سینے پر لٹا کر غرناطہ کا نام دہرایا کرتی تھیں۔ اہل قبیلہ ہر پانچویں روز مسجد میں جمع ہوتے اور غرناطہ کی طرف منہ کر کے دعائیں مانگتے کہ اے قادر مطلق خدا! اپنے برگزیدہ بندوں کو اُن کی سلطنت واپس دلا تاکہ وہ اپنے مقدس وطن کا منہ دیکھ سکیں۔ اجنبی ملک نے ان جلا وطنوں کے دل بہلا دینے کے لئے اپنے پھل، چشمے اور سبزہ زار پیش کر دیئے تھے لیکن غرناطہ کے قصر احمر سے دُور رہ کر انہیں کوئی پھل اتنا میٹھا معلوم نہ ہوتا۔ کوئی چشمہ اتنا شفاف نظر نہ آتا اور کوئی سبزہ زار اتنا تر و تازہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اگر کسی جلا وطن کے سامنے بغداد کے میدانوں کا نام لیا جاتا تو وہ نفی میں سر ہلا دیتا اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا ـــ "غرناطہ!"

بنو سراج کو اپنے وطن کی یاد بہت ستاتی تھی۔ وہ ایک ایسے ملک کی یاد میں تڑپ رہے تھے۔ جہاں اُن کی عظمت کے نشان باقی تھے۔ اور جس کے ساحلوں پر ابھی تک ان کا یہ نعرہ جنگ گونج رہا تھا کہ "عزت یا موت" اب چونکہ وہ اپنی تلوار کے جوہر دکھا نہ سکتے تھے اور دہقانوں کی نو آبادی میں تاج پہننا بھی ممکن نہ تھا اس لئے وہ جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ یہ پیشہ عربوں کے نزدیک جہاد سے کم نہ تھا۔ اس طرح وہی قوم جو دوسروں کو زخمی کیا کرتی تھی۔ اب زخموں کا علاج دریافت کرنے لگی۔

شاہی خاندان کی قیامگاہ دوسرے جلا وطنوں کے ہمراہ پہاڑی کے دامن میں نہ تھی۔ بلکہ وہ ساحل سمندر کے نزدیک قرطاجنہ کے کھنڈروں میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سینٹ لوئی ہلاک ہوا تھا۔ اور جہاں آج کل ایک اسلامی خانقاہ ہے۔ جھونپڑے کی دیواروں پر شیر کی کھالوں کی ڈھالیں لٹکی ہوئی تھیں اور ان کی نیلگوں سطح پر دو خوفناک انسانوں کو اپنے عصاؤں سے ایک شہر کو تہس نہس کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کے ارد گرد یہ الفاظ کندہ تھے۔ "نہایت ہی معمولی بات ہے" دراصل یہ بنو سراج کا قومی نشان تھا۔ ڈھالوں کے نزدیک خنجروں کی ایک قطار چمک رہی تھی اور پاس ہی دوسرا سامان جنگ سجا دیا گیا تھا۔ اس تحریری سلسلہ کے نیچے ایک میز پر [illegible] کام آنے والی چیزیں رکھ دی

گئی تھیں۔ مثلاً کوہ اطلس اور صحرائے اعظم کی جڑی بوٹیاں۔ بنو سراج میں سے بعض جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے تھے اور بعض کو روحانی امراض دور کرنے کا دعویٰ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے بعض بوٹیاں اُلٹا اثر کرتی تھیں۔ اور بسا اوقات وطن کے کسی پھول کی خوشبو انھیں دیوانہ بنا دیتی تھی۔

غرناطہ پر اغیار کا قبضہ ہوئے ۴۴ برس گذر چکے تھے اور اس قلیل عرصہ میں بنو سراج کے کم سے کم چودہ افراد نئی آب و ہوا کے زیر اثر، صحرانوردی کے طفیل یا غریب الوطنی کے صدمے سے لقمہ اجل ہو چکے تھے۔ صرف ایک مردِ مجاہد باقی تھا۔ جس کی طرف اس باعظمت خاندان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ بنو سراج میں ابن حمید ہی وہ شخص تھا جس پر زجریوں نے سلطانہ تہیمہ پر جادو کرنے کا الزام لگا رکھا تھا۔ ابن حمید کی ذات میں حسن و احسان، شجاعت و بہادری اور فیاضی و دریادلی کی وہ صفات جمع تھیں جن سے اس کے آباو اجداد کا نام روشن تھا۔ لیکن غریب الوطنی اور پے در پے صدموں کی وجہ سے اس کی طبیعت میں اداسی و افسردگی پیدا ہو گئی تھی۔ ابھی اس کی عمر بائیس برس تھی جب وہ سایہ پدری سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آباو اجداد کے ملک کی زیارت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ذہن میں ایک تجویز بھی تھی جو اس نے خفیہ رکھی اور اپنی ماں کو بھی نہ بتائی۔

وہ تونس کی ایک بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہوا۔ ہوا موافق تھی اس لئے وہ بہت جلد قرطاجنہ پہنچ گیا۔ جہاز سے اُتر کر اس نے غرناطہ کی راہ لی اور مشہور کر دیا کہ میں عرب کا ایک طبیب ہوں اور سیرانواد کے پہاڑوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کرنے آیا ہوں۔ خچر پر سوار ہو کر وہ آہستہ آہستہ اس علاقے میں سے گزرنے لگا جو کسی زمانہ میں بنو سراج کے جنگجو گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجتا رہتا تھا۔ اس کے آگے آگے ایک رہنما تھا جو دو اور خچروں کو ہانکے لئے جا رہا تھا۔ ان خچروں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور ان پر رنگ رنگ کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ابن حمید نے سلطنت مرسیا کے بڑے بڑے میدانوں اور کھجوروں سے اٹی ہوئی وادیوں کو عبور کیا۔ رستے میں وہ درختوں کی عمر سے اندازہ کرتا جا رہا تھا کہ یہ پیڑ اس کے آباو اجداد نے وہاں لگائے ہیں۔ اور یہ خیال آتے ہی اس کے دل سے ہوک اُٹھتی تھی۔ ایک طرف اسے ایک مینار نظر آیا جس پر کھڑے ہو کر ایک سرفروش نے موروں اور عیسائیوں کی جنگ دیکھی تھی۔ دوسری طرف ایک عمارت کے کھنڈر تھے۔ جن کے آثار سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مُوروں کی صناعی کا کرشمہ ہے۔ اس کا دل رقت سے بھر آیا۔ وہ اپنی خچر پر سے اتر پڑا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش کے بہانے کھنڈروں میں آ کر زار زار رونے لگا۔ جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ تو وہ پھر خچر پر سوار ہو کر سفر کرنے لگا۔ خچروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور رہنما حدی خوانی کر رہا تھا۔ ان آوازوں کی یکسانی سے اس پر نیند طاری ہونے لگی۔ سڑک کے دائیں بائیں کبھی کبھی کوئی گڈریا اپنی بھیڑوں کے گلے کے پاس بیٹھا نظر آ جاتا یا کوئی اکا دکا مسافر ادھر سے گزرتا مل جاتا ورنہ بظاہر سڑک پر زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اور ہر طرف اداسی اور وحشت برس رہی تھی۔ مسافر عام طور پر اپنے جبّوں میں لپٹے ہوتے اور ان کے کمربند سے تلوار لٹک رہی ہوتی۔ وہ گزرتے وقت ابن حمید کو سلام کرتے لیکن وہ اپنے خیالات میں اس درجہ کھویا ہوا تھا کہ اُسے جواب دینے کی بھی ہوش نہ تھی۔

شام کو وہ ایک سرائے میں پہنچا اور یہاں اجنبیوں کے درمیان فروکش ہو گیا۔ لیکن کسی نے بھی اس کی طرف حیرت سے نہ دیکھا۔ اس کے عمامہ، اس کے لبادہ اور اس کے ہتھیاروں نے کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ نہ کیا۔ خدا کا چونکہ منشا ہی یہ تھا کہ اسپینی مُور اپنی سلطنت سے دست بردار ہو جائیں۔ اس لئے ابن حمید فاتحین کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

غرناطہ سیرانواد اکے دامن میں دو پہاڑیوں کے اوپر واقع ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک گہری وادی ہے۔ پہاڑیوں کے نشیب میں اور وادی کی گہرائیوں میں مکان بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے شہر کی شکل و صورت ایک درمیان سے کٹی ہوئی ناشپاتی کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہر غرناطہ کے نام سے مشہور ہو گیا پہاڑیوں کے دامن میں دو دریا بہتے ہیں۔ ایک کا نام جنیل ہے۔ دوسرے کا ڈورو۔ جنیل سنہری ریت میں سے مچلتا ہوا گزرتا ہے اور ڈورو کا رستہ سفید براق ریت میں سے ہے آگے چل کر یہ دریا مل جاتے ہیں اور وغا کے میدان سے ایک ہی دھارے میں بہتے ہیں یہ میدان غرناطہ سے صاف نظر آتا ہے اور انگور کی بیلوں ناشپاتیوں انجیروں، رنگتروں اور شہتوت کے درختوں سے اَٹا پڑا ہے اس میدان کو خوبصورت پہاڑوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ جب سیاح اس جگہ قدم رکھتا ہے تو اس پر وجد کا عالم طاری

ہو جاتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنت میں آ گیا ہے۔

جب ابن حمید نے غرناطہ کے پہلے مکانوں کی چوٹیاں دیکھیں تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ بیتاب ہو کر خچر سے اتر آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور اس مقدس شہر پر نظریں گاڑ کر خاموش و مبہوت کھڑا رہا۔ رہنما بھی ٹھہر گیا۔ اسپینی چونکہ ذہین ہوتے ہیں اس لئے وہ فوراً سمجھ گیا کہ نووارد کوئی مُور ہے جو اپنے قدیم وطن کی یاد میں کھو گیا ہے۔ آخر ابن حمید نے یہ سکوت توڑا۔

"اے میرے رہنما!" وہ بولا۔ "خدا تمہارا بھلا کرے مجھ سے سچ سچ کہنا۔ کیونکہ جس روز تم پیدا ہوئے تھے سمندر میں سکون تھا اور آسمان پر ہلال چمک رہا تھا۔ یہ سامنے جو منار ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ یہ کیسے ہیں؟"

"یہ الحمرا کے منار ہیں۔" رہنما نے جواب دیا۔

"اور وہ دوسری پہاڑی پر وہ قلعہ؟" ابن حمید نے پوچھا۔

"یہ غنارلیف کہلاتا ہے۔" اسپینی نے جواب دیا۔ "اسی قلعہ میں حنا کا ایک باغ ہے جہاں کہتے ہیں کہ ابن سراج اور سلطانہ نہیمہ کی داستان عشق رسوا ہوئی۔ اس سے پرے البیقین ہے اور اس کے نزدیک ہی قصر احمر ہے۔"

رہنما کا ہر لفظ تیر و نشتر بن کر ابن حمید کے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ یہ قسمت کا کتنا ظالمانہ فعل تھا۔ کہ اسے اپنے آباؤ اجداد کی یادگاروں کے نام ایک اجنبی سے دریافت کرنا پڑے اور اس کے کان اپنے بزرگوں کے حالات غیروں سے سن رہے تھے۔ ابن حمید کی توجہ دوسری طرف پھیرنے کے لئے رہنما نے کہا۔ "آیئے۔ مُور بہادر! اب چلیں۔ خدا کی مرضی پوری ہو گئی۔ آخر فرانسس بھی تو آج کل ہماری قید میں ہے۔ یہ خدا کی مرضی تھی۔" اس نے اپنی ٹوپی اتاری۔ سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اپنے خچر کو ہانکتے ہوئے چل دیا۔ ابن سراج نے بھی اپنے جانور کو ایڑ لگائی اور بولا۔ "جیسے خدا کی مرضی۔" ان دونوں نے غرناطہ کا رُخ کیا۔

وہ آیش کے عظیم الشان درخت کے قریب سے گزرے جو ابو موسیٰ اور غرناطہ کے آخری تاجدار کی جنگ دیکھ چکا تھا۔ انھوں نے المائدہ کا چکر کاٹا اس کے بعد الوبرا کے دروازے سے شہر کے اندر داخل ہوئے۔ پھر وہ رتیلا پر چڑھے اور بہت جلد ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں مُوری طرز کی بے شمار عمارتیں ایستادہ تھیں۔ وہاں افریقی مُوروں کا ایک خان رہتا تھا جو ریشم کی تجارت میں نام پیدا کر چکا تھا رہنما ابن حمید کو اسی کے گھر لے گیا۔

لیکن ابن حمید کو اس نئی قیامگاہ میں بھی چین نہ آیا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے آباؤ اجداد کا خیال آ رہا تھا۔ آخر آدھی رات کے وقت وہ اتنا بےچین ہوا کہ رہ نہ سکا اور اپنی قیامگاہ سے نکل کر غرناطہ کے بازاروں میں گھومنے لگا۔ اندھیرے میں نظریں دوڑاتے اور ٹٹولتے ہوئے اس نے بعض ایسی عمارتیں پہچان لیں جن کا تذکرہ اس نے بزرگوں کی زبانی سنا تھا۔ اسے ایک بلند و بالا عمارت نظر آئی جس کی دیواروں سے اس نے اندازہ لگایا کہ شاید کسی زمانہ میں یہی بنو سراج کے محلات تھے۔ عمارت کے قریب ہی ایک میدان تھا۔ اس نے سوچا ممکن ہے یہاں شاہی رسوم ادا کی جاتی ہوں۔ اور انہی بازاروں میں سے زرق برق سوار نیزے تانے اور فوجی کرتب دکھاتے گزرتے ہوں۔

لیکن افسوس! آج موسیقی کی تانوں۔ طبل جنگ کے دھماکوں اور محبت کے نغموں کی بجائے چاروں طرف خاموشی کی حکومت تھی۔ شہر میں ہُو کا عالم تھا۔ باشندے تبدیل ہو چکے تھے۔ اور مفتوحین کی جگہ اب فاتحین خوابیدہ تھے۔

"مغرور سپینی!" ابن حمید چلّایا۔ "آج وہ ان مکانوں میں سو رہے ہیں جہاں میرے آباؤ اجداد مکین تھے۔ اور میں؟ میں ابن سراج ہو کر بھی اپنے باپ دادا کے محلات کے سامنے گمنام اور تنہا کھڑا ہوں۔"

وہ انسان کے انجام پر، قسمت کے انقلابات پر اور سلطنتوں کے عروج و زوال پر غور کرنے لگا۔ اس نے تصوّر کی آنکھ سے عیش و عشرت کی آغوش میں کھیلتے ہوئے غرناطہ کو دشمنوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ اس کے آباؤ اجداد کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجروں کی جگہ بیڑیاں کھنکھنا رہی ہیں۔ اہل شہر اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں اور وہ ان شرابیوں کی طرح نظر آتے ہیں جو میخانے میں اچانک آگ لگ جانے کے بعد نیم عریاں اور نیم مدہوش نکل آئے ہوں۔

یہ سب خیالات اور یہ سب مناظر ابن حمید کی روح کی گہرائیوں تک سرایت کر گئے اور وہ حقیقی رنج و غم سے بیتاب ہو کر اس تجویز پر غور کرنے لگا جو اس کے ذہن میں موجود تھی لیکن اب وہ رستہ بھول چکا تھا۔ وہ خان کی قیامگاہ سے بہت دور نکل آیا تھا اور شہر کے مضافات میں گھوم رہا تھا۔ ہر چیز پر نیند طاری تھی

بازاروں کے سکوت میں ہلکی سی آواز بھی مخل نہ ہوتی تھی۔ مکانوں
کے دروازے اور دریچے بند تھے۔ صرف مرغ سحر کی بانگ نے اُسے
بتایا کہ غریبوں کی محنت و مشقت کا وقت آگیا ہے۔

ابن حمید دیر تک ادھر اُدھر بھٹکتا رہا لیکن اسے رستہ نہ مل سکا۔
آخر اس کے کانوں میں ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے ایک
نوجوان عورت کو باہر نکلتے دیکھا۔ جس نے گاتھی شہزادیوں کا سا لباس
پہن رکھا تھا۔ اس کے خوبصورت جسم پر سیاہ شلوکا بہت بھلا معلوم
ہوتا تھا۔ اس کا لہنگا بہت چھوٹا تھا۔ اور اس میں سے اس کے ساق
سیمیں اور نازک پاؤں صاف نظر آ رہے تھے۔ چہرے پر اُس نے سیاہ
رنگ کی نقاب اوڑھ رکھی تھی۔ جس میں سے اس کی بڑی بڑی
آنکھوں اور گلاب آسا ہونٹوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس
کے پیچھے پیچھے ادھیڑ عمر کی ایک اتالیق تھی اور آگے آگے ایک کمسن
خدمتگار کتاب الدعا اٹھائے جا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر دو پیادے
وردی پہنے اس گمنام حسینہ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ غالباً وہ صبح
کی دُعا میں شامل ہونے جا رہی تھی۔ کیونکہ اس عبادت کا اعلان بھی
قریب کے کلیسائے خانقاہ کی گھنٹی سے ہو رہا تھا۔!

ابن حمید کو یوں محسوس ہوا جیسے اسرافیل محو پرواز ہے۔ یا
جیسے کوئی نور مجسم اس کے پاس سے گزر رہی ہے۔ ہسپانوی دوشیزہ
بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے عمامہ، لبادہ اور
بازوؤں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے
جب اس کا اولیں جذبۂ تحیر دور ہوا تو اُس نے باوقار انداز سے
اجنبی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"معزز بہادر!" اس نے کہا "شاید آپ غرناطہ میں نئے نئے
تشریف لائے ہیں۔ کیا آپ رستہ بھول گئے ہیں؟"

"ہمیر گل!" ابن حمید نے جواب دیا۔ "نور چشم، مسیحی غلام، دوشیزۂ
جاریا سے حسین تر۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ میں اس شہر میں اجنبی
ہوں۔ ان محلات کے درمیان کھو گیا ہوں۔ مجھے مُوروں کے خان
کا گھر نہیں ملتا۔ رسول خدا تمہارے دل کو ایمان کی روشنی سے منور
کریں کیا تم میری رہنمائی کر سکو گی؟"

"مُور بہادر ہوتے ہیں۔" ہسپانوی دوشیزہ نے دلکش انداز میں
مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن نہ تو میں ہمیر گل ہوں۔ نہ مسیحی غلام۔ نہ مجھے
نور ایمان کی ضرورت ہے۔ تاہم میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میں تمہیں خان
کے گھر تک لے چلتی ہوں۔"

وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی مُور کے آگے آگے ہو لی۔ اور ہاتھ کے
اشارے سے خان کے مکان کا دروازہ بتانے کے بعد فوراً ایک گلی کی
اوٹ میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

انسان کی مسرت کا راز کیا ہے؟ ابن حمید کے دل میں اب وطن
کی محبت کا جذبہ اتنی شدت سے موجزن نہ رہا۔ اب اسے غرناطہ غیر آباد
اور سنسان نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہسپانوی دوشیزہ سے محبت کرتا تھا
اور یہی وہ جادو تھا جس کے زور سے کھنڈروں میں بھی حسن نظر آنے
لگا تھا۔ اور اس کے دل میں ایک نئی تڑپ سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ
بنو سراج کے مقابر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن جب وہ اُن
کے سرہانے کھڑے ہو کر دعا کرتا تو اس کے ذہن میں یہی ہوتا کہ اس کی
ہسپانوی محبوبہ یہاں سے گزری ہے۔ ورنہ آبا و اجداد کی یاد اُسے
پہلے کی طرح نہ تڑپاتی تھی۔

اس نے ناحق کوشش کی کہ اپنے ذہن میں آبا و اجداد کی یاد
کے سوا کسی کو جگہ نہ دے۔ وہ بے سود کوشش کرتا رہا کہ صبح سویرے
دورو اور جنیل کی گھاٹیوں میں جا کر جڑی بوٹیاں تلاش کرتا ہے
کیونکہ اصل پھول جو اُسے درکار تھا وہ مسیحی دوشیزہ کے سوا کوئی نہ
ہو سکتا تھا۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ اپنی محبوبہ کے مکان تک
پہنچ سکے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اکثر اوقات ان گلی کوچوں میں
گھومتا رہتا جہاں دینی رہنما سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی بعض
اوقات وہ اس گھنٹی کو پہچاننے کی کوشش کرتا۔ جو اجنبی دوشیزہ کے
مکان کے قریب اس نے سُنی تھی لیکن جب وہ کسی گھنٹی کو سُن کر
گرجے تک پہنچتا تو دوشیزہ کا مکان کہیں نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی کسی عورت
کا لباس دیکھ کر اس کے دل میں اُمید کی ایک کرن پھوٹتی لیکن قریب
جا کر اسے محسوس ہوتا کہ یہ عورت تو اس کی محبوبہ کی خاکِ پا بھی نہیں

ابن حمید نے کلیساؤں اور خانقاہوں کا ایک ایک کونا چھان
مارا لیکن وہ آسمانی حور کہیں نہ ملی۔ آخر وہ فردی نندا اور ایزابیلا کے
مدفن پر گیا۔ یہ محبت کی خاطر اس کی سب سے بڑی قربانی تھی۔ لیکن اس
دوشیزہ کا کہیں پتہ نہ ملا۔

ایک روز وہ وادی دورو میں جڑی بوٹیاں اکٹھی کر رہا تھا جنوب
کی طرف ایک پہاڑی تھی۔ جس کے گلفروش نشیب سے الحمرا اور
گلستانِ عنارلیف کی دیواریں بلند ہو رہی تھیں۔ شمال کی طرف ایک
پہاڑی کو "البیثیفنین" نے زینت دے رکھی تھی۔ اور اس کے بوستان
مسکرا رہے تھے۔ وادی کے عین مغرب میں غرناطہ کے گنجان گھر کی چوٹیاں

چمک رہی تھیں۔ مشرق کی طرف دیکھنے سے پہاڑ کی چوٹی پر نظریں اُن خانقاہوں، عزلت گاہوں اور راہب خانوں پر ٹھہر جاتی تھیں جو زمانہ قدیم سے یہاں موجود تھیں۔ دریائے دُورو وادی کے بیچ درمیان سے بہتا ہوا گزرتا تھا۔ اور اس کے ساحلوں پر کہیں نئی بنی ہوئی پن چکیاں کہیں ہنگامہ خیز آبشار، کہیں رومی نہروں کی ٹوٹی پھوٹی محرابیں اور کہیں مُوروں کے زمانے کے پُلوں کے آثار نظر آتے تھے۔

ابن حمید کو اب تنہائی میں نہ تو لُطف آتا تھا نہ افسردگی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ان سحر انگیز مقامات سے بے پروا اور بے خبر گزر گیا۔ وہ ایک پگڈنڈی پر سے ہوتا ہوا اس سڑک پر پہنچ گیا جو البیفین کے نشیب کے سارے گرد گھومتی تھی۔ اسے سنگترے کے درختوں کے درمیان ایک سادہ سا دیہاتی جھونپڑا نظر آیا۔ وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ تو اسے ستار پر گانے کی آواز آئی۔ عورت کی آواز، شکل و شباہت اور نظروں میں ایک خاص قسم کا ربط ہوتا ہے۔ جسے محبت میں انسان خود بخود محسوس کر لیتا ہے۔

"یہ وہی حور ہے" ابن حمید چلا اُٹھا۔ اور دھڑکتے دل کے ساتھ موسیقی سننے لگا۔ ابن سراج کا نام کئی مرتبہ دہرایا جا رہا تھا اس لئے اس کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ یہ نامعلوم ہستی کستیلا کا ایک گیت گا رہی تھی جس میں ابن سراج اور زجریوں کی داستان بیان کی گئی تھی۔ ابن حمید اب اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ وہ مہندی کی جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور چند خوفزدہ لڑکیوں کو ادھر اُدھر بھاگتے پایا۔ ہسپانوی دوشیزہ جو ستار پر گا رہی تھی اجنبی کو دیکھ کر بولی "مُوروں کے سردار صاحب تشریف لے آئے ہیں؟" اس کے بعد اپنی سہیلیوں کو بھی واپس بلا لیا۔

"جنّوں کی محبوبہ!" ابن حمید نے کہا "میں تیری تلاش میں اس طرح سرگرداں رہا جس طرح ایک عرب چلچلاتی دھوپ میں پانی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ میں نے ستار کی آواز سنی تو معلوم ہوا تو میرے ملک کے بہادروں کے گیت گا رہی ہے۔ میں تیری شیریں آواز پہچانتا ہوں اور ابن حمید کا دل تیرے قدموں پر نثار کرتا ہوں"

"میں بھی تو ابن سراج کا یہ گیت تمہاری یاد میں گا رہی تھی" دونا بلانکا نے جواب دیا "جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے ہر دم یہی خیال رہتا ہے کہ تمام مُوری بہادر تمہاری طرح ہی ہوتے ہونگے"

یہ الفاظ کہتے وقت اُس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ ابن حمید بے اختیار ہو کر اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہونے لگا تاکہ اسے بتائے کہ میں ہی آخری ابن سراج ہوں۔ لیکن اس کے دل میں ابھی تھوڑی بہت خودداری باقی تھی اس لئے اس نے اپنے جذبات پر بہت جلد قابو پا لیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر غرناطہ میں کسی کو اس کا نام معلوم ہو گیا تو ممکن ہے حاکم اسپین اسے تکلیف پہنچائے۔ مُوروں کی جنگ کو ختم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اس لئے بہت ممکن تھا کہ ابن سراج کو دیکھ کر اسپینی بھڑک اُٹھتے۔ ابن سراج بزدل نہ تھا لیکن اس نے سوچا اگر اس مرحلہ پر کوئی ناگوار واقعہ ظہور میں آ گیا تو بہت ممکن ہے اسے ڈان رُوڈرِیگوز سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہونا پڑے۔

دونا بلانکا ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس کا شجرہ نسب گورمیوں کے سردار کاؤنٹ گومیز کی بیٹی زمنا اور سید تیوار تک جا پہنچتا تھا۔ شاہ کستیلہ کی ناقدر شناسی کے باعث ولنشیہ کے فاتحین کی اولاد پر نکبت و ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں۔ بلکہ صدیوں تک یہی خیال کیا جاتا رہا کہ یہ خاندان اب صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکا ہے۔ لیکن غرناطہ کی فتح کے وقت بیجار خاندان کے آخری فرد نے اپنا نام ظاہر کر دیا۔ اور جنگ میں اپنی بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ یہی آخری مرد مجاہد بلانکا کا جد امجد تھا۔ مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کے بعد فرڈی نند نے سید کیوں کے درمیان مُوری خاندان کی جاگیریں تقسیم کر دیں اور اُن کے سردار کو نواب سانتانی کا خطاب دیا۔ نئے نواب نے غرناطہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی لیکن ابھی وہ نوجوان ہی تھا کہ موت کے زبردست ہاتھ نے اس کی زندگی چھین لی۔ وہ اپنے پیچھے ایک اکلوتا لڑکا چھوڑ گیا۔ جس کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس کا نام ڈان رودریگوز تھا۔ بلانکا اسی کی بیٹی تھی۔

ڈان رُوڈریگوز کی بیوی دونا تھریسیا کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا خاندانی نام رودریگوز تھا لیکن اسے ڈان کارلو کہہ کر پکارنے لگے۔ ڈان کو بچپن ہی سے عجیب و غریب حوادث کا شکار ہونا پڑا۔ اور شروع ہی سے وہ قسم قسم کے خطرات سے دوچار ہوتا رہا۔ اس لئے اس کی طبیعت میں وہ خصوصیت پیدا ہو گئی جو پریشاں حالی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس کی عمر چودہ برس تھی کہ اسے کرتیز کے ہمراہ میکسیکو جانا پڑا اس نے تمام خطرات کا مقابلہ کیا اور اس حیرت انگیز مہم میں عملی حصہ لیتا رہا۔ جب الحمرا کی آخری شمع بجھ گئی تو وہ موقع پر موجود تھا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ تین برس کے بعد ڈان کارلو یورپ میں موجود تھا اور جنگ پاویا میں اس نے ایک مسیحی بادشاہ کو قسمت کی زبردست ٹھوکروں سے زخمی ہوتے دیکھا تھا۔ نئی دنیا کی سیروں، گمنام سمندروں

میں لمبی لمبی سیاحتوں، خونریز بغاوتوں اور قسمت کے انقلابوں نے اس کے مذہبی اور روحانی تصورات پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ قلاطروؔ کے بہادروں کے نظام میں شامل ہوگیا۔ اور دانؔ ملدو ریگوز کی التجاؤں کے باوجود اس نے دنیاوی دولت اپنی بہن کے حوالے کردی۔ اور دنیاوی زندگی کو خیرباد کہہ دیا۔

بلانکا دی بیوار دان کارلو کی اکلوتی بہن تھی اور عمر میں اُس سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کا باپ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی جب اُس نے اٹھارویں برس میں قدم رکھا۔ تو اس کی ملاقات ابن حمید سے ہوئی۔ اس وقت وہ عنفوان شباب میں تھی۔ اس کی آواز میں بلا کی کشش تھی اور اس کے رقص میں نسیم شام سے کہیں زیادہ لطافت تھی، کبھی وہ آرمیدا کی طرح رتھ کی سواری میں مسرت محسوس کرتی تھی۔ اور کبھی اندلس کے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہوکر وہ جنگل کی پریوں کی طرح ادھر اُدھر اُڑتی پھرتی تھی۔ اگر اہل ایتھنز اسے دیکھ پاتے تو اسپاسیا خیال کرتے۔ اگر اہل پیرس کو وہ نظر آجاتی تو اسے شاہ فرانسس کی محبوبہ دیانا دی پوئیتی قرار دیتے۔ لیکن فرانسی کے ناک نقشے کے ساتھ ساتھ اس میں ہسپانوی جذبات محبت بھی پائے جاتے تھے اور حسن سادہ کے باوجود اس کے قلب کی بلندی، پاکیزگی، قوت اور محکمی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

ہسپانوی دوشیزاؤں کی چیخیں سُن کر دان رودریگوز باہر نکل آیا۔ بلانکا اسے دیکھتے ہی بول اٹھی "اباجان! یہی وہ مُوری سردار ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ انہوں نے میرے گانے کی آواز سنی اور میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے باغ میں چلے آئے۔"

سانتانی کے نواب نے مُور کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اس میزبانی کا ثبوت دیا جو ہسپانیوں سے مخصوص ہے۔ اس ملک میں غلام طرز کلام کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ آقا اور غلام کی زبان ایک ہے، لیکن جس طرح یہ لوگ اپنے معاہدے کا احترام کرتے ہیں اسی طرح جب انتقام پر اتر آتے ہیں تو ان سے بُرا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر ایک طرف جرأت و بہادری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے تو دوسری طرف وہ مصائب کے وقت بے نظیر صبر و شکر سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ فتح یا موت ——— ! وہ ہنسی مذاق کے عادی نہیں ہوتے لیکن اس کی کمی تخیل کی گہرائی اور عزم و ارادہ کی بلندی سے پوری ہو جاتی ہے۔ ایک ہسپانوی جو سارا دن چپ چاپ رہتا ہے۔ جس نے کچھ بھی نہیں دیکھا نہ اسے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جس نے کوئی علم حاصل نہیں کیا اور جو غور و فکر کا عادی نہیں ہے وہ بھی اپنی روحانی عظمت کی بدولت ایک ایسی قوت حاصل کر لیتا ہے جو اسے تکالیف برداشت کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

اُس روز دان رودریگوز کا یوم پیدائش تھا اور بلانکا نے اس تقریب پر اپنی سہیلیوں کو مہندی کے ایک باغ میں مدعو کیا تھا۔ سانتانی کے نواب نے ابن حمید کو دوشیزاؤں کے درمیان بیٹھنے کی دعوت دی وہ اس کے لبادہ اور عمامہ کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ محفل کے تکیے لائے گئے اور مُور ان سے اپنے ملک کے رواج کے مطابق ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ لڑکیوں نے اس سے اس کے ملک اور سیاحت کے بارے میں استفسارات کئے۔ جن کا وہ نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتا رہا وہ خالص کاستیلی زبان بول رہا تھا۔ اور اگر وہ "تم" کی جگہ "تو" نہ کہتا تو شاید اسے لب و لہجہ کے لحاظ سے بھی ہسپانوی خیال کر لیا جاتا۔ یہ لفظ اس کی زبان سے اتنا شیریں معلوم ہوتا کہ جب کبھی وہ اس لفظ سے دوسری لڑکیوں کو مخاطب کرتا تو بلانکا کو دل ہی دل میں رشک آتا۔

اس کے بعد خادماؤں کی ایک قطار ظاہر ہوئی۔ ان کے ہاتھوں میں چاکولیٹ، پھلوں کے رَس اور زلاغہ کی سفید سی خستہ مٹھائی تھی۔ کھانے کے بعد سہیلیوں نے بلانکا سے فرمائش کی کہ وہ خانہ بدوش لڑکیوں والا رقص دکھائے۔ اسے مجبوراً سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ابن حمید بظاہر خاموش تھا لیکن اس کی نگاہوں نے سہیلیوں کی تائید کردی۔ بلانکا نے "زمرہ" نام رقص کو ترجیح دی۔ یہ رقص ہسپانیوں نے مُوروں سے سیکھا تھا۔

ایک لڑکی رقص کی تال کے مطابق چِتارہ بجانے لگی۔ دان رودریگوز کی بیٹی نے نقاب اتار پھینکی۔ اور گورے گورے ہاتھوں میں آبنوسی مجیرے تھام لئے۔ اس کی سیاہ کالی زلفیں مرمریں گردن پر لہرا رہی تھیں۔ آنکھوں میں شوخی اور لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ تیز تر ہوتا جارہا تھا اچانک اس نے آبنوسی مجیرے بجانا شروع کئے۔ تین مرتبہ تال پر چوٹ لگائی۔ زمرہ کا نغمہ چھیڑا اور اپنی آواز کو چِتارے کی سُروں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے۔ بجلی کی طرح شعلۂ رقص میں بھڑک اُٹھی۔

اس کے قدم اٹھانے میں کس درجہ تنوع تھا۔ اس کی جنبشوں میں کس درجہ وقار تھا۔ کبھی وہ جلدی سے اپنے بازو اٹھاتی کبھی آہستہ سے گرا دیتی۔ کبھی میخواروں کی طرح جھومنے لگ جاتی۔ کبھی سر ہنوڑائے پیچھے کی طرف سکڑ جاتی۔ جیسے غم کے بوجھ سے دب گئی ہو۔ کبھی مُنہ

پھیر کر اشارے کرنے لگتی جیسے کسی نامعلوم ہستی کو پکار رہی ہو۔ کبھی جھکتے ہوئے اپنا منہ اوپر اٹھاتی گویا دولہا کو پیار کی دعوت دے رہی ہے پھر شرما کر پرے ہٹ جاتی اور مسکراتی ہوئی واپس آجاتی۔ کبھی شاہانہ انداز سے قدم اٹھاتی اور کبھی سبزہ زاروں میں ٹہلنے لگ جاتی۔ اس کے قدموں، تانوں اور چھاروں کی سُروں میں غضب کی ہم آہنگی تھی۔ آواز قدرے مدھم تھی لیکن اس میں وہ سوز و گداز موجود تھا جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جایا کرتا ہے۔ ہسپانوی موسیقی آہوں اور تیز جنبشوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گیتوں کے ٹیپ کے مصرعے نہایت دردناک ہوتے ہیں اور گیت اچانک ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بیک وقت غم اور مسرت کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ہسپانوی دوشیزہ کے رقص و نغمہ نے ابن سراج کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

شام کے وقت محفل برخاست ہو گئی۔ اور سب لوگ وادیٔ ڈراؤ کے رستے غرناطہ واپس آگئے۔ ساں رودریگوز ابن حمید کی خوش اخلاقی اور شریفانہ طرزِ عمل سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے جب تک ابن حمید سے وعدہ نہ لیا کہ وہ اکثر ان کے گھر آیا کرے گا اور بلانکا کا دل مشرق کی عجیب و غریب داستانوں سے بہلایا کرے گا اسے چین نہ آیا۔ نواب سانتا فی نے مُوری کے دل کی بات کہی تھی اس لئے یہ دعوت فوراً قبول کر لی گئی۔ چنانچہ دوسرے دن صبح ابن حمید اس محل میں گیا۔ جہاں اُس کی محبوبہ کا حسن مہرِ نیمروز کی طرح تابانیاں دکھا رہا تھا۔ بلانکا کو بہت جلد محسوس ہوا کہ وہ اس بہادر نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ لیکن ایک غیر عیسائی مُور سے محبت کرنا کچھ عجیب سی بات تھی۔ اس لئے بلانکا نے چاہا کہ اس جذبے کو اپنے دل سے نکال دے۔ لیکن محبت اس کی رگوں میں سرایت کر چکی تھی۔ اس لئے اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجبوراً اس نے ایک سچے ہسپانوی کی طرح قسمت کے آگے سر جھکا دیا۔ اُسے ان خطرات کی پروا بھی نہ رہی جو اسے پیش آنے والے تھے۔ اس نے دل سے بحث کرنا چھوڑ دی۔ اس نے سوچا "اگر ابن حمید عیسائی ہو جائے۔ تو میں دنیا کے آخری کنارے تک اس کے ہمراہ جا سکتی ہوں۔"

دوسری طرف مُور بھی جذبات کی رَو میں بہہ رہا تھا۔ وہ صرف بلانکا کے لئے زندہ تھا۔ اسے وہ تجویزیں بھی یاد نہ رہیں جو وہ غرناطہ میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ضروری معلومات حاصل کرنا اس کے لئے دشوار نہ تھا لیکن محبت نے اسے اندھا کر دیا تھا اس لئے وہ کچھ بھی دیکھ نہ سکا۔ اسے کسی چیز کی خواہش نہ رہی۔ وہ کچھ بھی جاننا نہ چاہتا تھا۔ اس نے سوچا "اگر بلانکا مسلمان ہو جائے تو میں آخری دم تک اس کا غلام رہوں گا۔"

ابن حمید اور بلانکا کا ارادہ پختہ تھا لیکن اپنے جذبات کے اظہار کے لئے وہ کسی مناسب موقع کی ٹوہ میں تھے۔ ان دونوں میں نہایت خوشگوار تھا۔ ایک روز نواب سانتا فی کی بیٹی نے مُور سے کہا: "تمہاری بعض باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے خاندان کا تعلق غرناطہ سے تھا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ تم اپنے قدیم بادشاہوں کے محلات دیکھنا پسند کرو گے۔ چلو آج شام کو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

ابن حمید خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔ اس نے رسولِ خدا کی قسم کھائی کہ میں ضرور چلوں گا۔ چنانچہ دونوں الحمرا کی زیارت کے لئے تیار ہو گئے۔ دآن رودریگوز کی بیٹی ایک سفید خچر پر سوار ہوئی جو گھاٹیوں پر ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر سکتا تھا۔ ابن حمید ایک اندلسی گھوڑے پر چڑھ بیٹھا جس کا ساز و سامان ترکی طرز کا تھا۔ گھوڑے کو دوڑاتے وقت مُور کا ارغوانی چغہ پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑاتا تھا۔ نیمچہ بلند زین سے ٹکرا رہا تھا۔ اور عمامے کی کلغی ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھی۔ رہگیر اس کے پرشکوہ انداز نشست کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے اور چلتے چلتے کہتے "یہ کوئی غیر مسیحی شہزادہ ہے جسے دونا بلانکا عیسائی بنانے والی ہے۔"

پہلے وہ ایک طویل بازار میں سے گزرے جو ایک مُور خاندان سے منسوب تھا۔ پھر الحمرا کی بیرونی دیوار تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد صنوبر کے ایک باغ میں سے ہوتے ہوئے وہ ایک چشمے تک پہنچے جو باب عادل کے محلات کے عین سامنے تھا۔

ایک دیوار میں جو قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی تھی۔ اور جس کے دونوں طرف بُرج بنے ہوئے تھے۔ ایک دروازہ تھا جسے "باب العدل" کہتے تھے۔ وہ اس دروازے میں داخل ہوئے اور ایک تنگ رستہ پر چلنے لگے۔ جس کے دونوں طرف اونچی اونچی دیواریں اور نیم شکستہ عمارتیں تھیں۔ یہ رستہ نصر الغیب میں ختم ہوتا تھا۔ جس کے نزدیک ہی چارلس پنجم نے ایک محل تعمیر کرنا چاہا تھا۔ وہاں سے شمالی کی طرف مڑ کر وہ ایک ویران مرے میں پہنچے جس کی دیواریں فرسودہ ہو چکی تھیں۔ ابن حمید فوراً گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور بلانکا کو اترنے میں مدد دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ملازموں نے ایک پرانے دروازے کو کھٹکھٹایا جس کی دہلیز گھاس میں چھپی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے الحمرا کے سربستہ راز نظر آنے لگے۔

ابن سراج یہ منظر دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اور بےحس و حرکت

پھر اجنبوں کی اس فرودگاہ کو دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ الف لیلیٰ کے کسی محل کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اسے چاروں طرف بارہ دریاں سنگ مرمر کی نہریں، لیمو کے درختوں کی قطاریں اور اچھلتے ہوئے فوارے نظر آئے۔ برآمدوں کی محرابیں بادِ تو سیس کو تھی طرز کی تھیں۔ اور ان میں سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ دیواروں پر قسم قسم کے نقش و نگار بنا دیئے گئے تھے تاکہ مُوری خاندان کا دل بہلا رہے۔ اس عجیب و غریب عمارت کے ایک ایک ذرّے سے عشرت پسندی، شان و شوکت اور جرات و بہادری کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ مُوروں نے زمین پر ایک جنت آباد کر رکھی تھی۔ جس کے کنج تنہائی میں وہ زندگی کے فرائض بھول جانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر تحیّر و سکوت کے بعد دونوں عاشق و معشوق عظمت رفتہ اور انبساطِ پارینہ کے مسکن میں داخل ہوئے پہلے وہ ایوانِ موستقلر کے قریب سے گزرے۔ پھر برج اسد میں آئے۔ ابن حمید کے جذبات میں ہر قدم پر ایک تلاطم برپا تھا۔ اس نے بلانکا سے کہا تم نے میری روح کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے لیکن یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ میں مُور ہو کر تم سے ان محلات کا حال دریافت کر رہا ہوں ـــ آہ یہ جگہ تو میرے لئے جنت ہے۔ اور میں . . . . . "

مُور نے ایک دروازے پر "باب عادل" کا نام کندہ دیکھا۔

" اف میرے بادشاہ!" وہ چلایا۔ "تجھ پر کیا آفت آئی ہے میں تجھے الحمرا کے کھنڈروں میں کہاں ڈھونڈوں"۔ اس کی آنکھوں میں خلوص و وفا اور تعظیم و محبت کے آنسو آگئے۔

"تمھارے قدیم آقا!" بلانکا نے کہا "بلکہ یوں کہو کہ تمھارے آبا و اجداد کے بادشاہ ناشکرے تھے"

"تو کیا ہوا؟" ابن حمید نے جواب دیا "وہ بدقسمت تھے"

جب یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے بلانکا اسے ایک چھوٹی سی آرامگاہ میں لے آئی۔ یہ کمرہ بالکل محبت کے معبد کا حرم معلوم ہوتا تھا کوئی مقام اس کی خوش وضعی کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ چھت پر سونے چاندی سے میناکاری کی گئی تھی۔ اور دریچوں کی جھلملیوں سے روشنی اس طرح آرہی تھی جیسے چقنوں میں سے چھن چھن کر آتی ہے۔ عمارت کے عین وسط میں ایک فوارہ تھا جس کی پھوار سنگ مرمر کے حوض میں گر رہی تھی۔

"ابن حمید!" ہسپانوی دوشیزہ نے کہا "اس فوارے کی طرف غور سے دیکھو۔ یہیں بنو سراج کے سر کاٹ کر پھینکے گئے تھے۔ سنگِ مرمر کے فرش پر اب بھی خون کا ایک دھبہ موجود ہے۔ یہ خون ان بدقسمت لوگوں کا تھا جن کو باب عادل نے سازش میں شریک سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ تمھارے ملک میں ان لوگوں کی سزا ہے جو سادہ لوح لڑکیوں کو گمراہ کرتے ہیں"

ابن حمید اس کی باتوں کو نہ سن رہا تھا۔ بلکہ اپنے خیالات میں گم تھا۔ وہ سجدے میں گر کر اپنے آبا و اجداد کے خون کے دھبوں کو چوم رہا تھا۔

"بلانکا!" ابن حمید نے سجدے سے سر اٹھا کر کہا "ان خون کے دھبوں کی قسم، مجھے تم سے محبت ہے"

"تو تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" بلانکا نے اشتیاق سے پوچھا "لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ تم ایک غیر عیسائی مُور ہو اور میں ایک عیسائی ہسپانوی ہوں"

"یا رسول اللہ" ابن حمید نے کہا "گواہ رہیئے کہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں"

"رسولؐ کی قسمیں کھا رہے ہو" بلانکا نے قدرے درشتی سے کہا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں"

ابن حمید گھبرا گیا۔ اس نے لڑکھڑائی آواز سے کہا "یہ سچ ہے میں تیرا غلام ہوں۔ لیکن . . . . . "

"مُور! دیکھو صاف بیانی سے کام لو" بلانکا نے کہا "تم نے میری آنکھوں میں محبت کی روشنی دیکھی ہوگی۔ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو میں تمھاری ہوں۔ لیکن اگر نواب سانتا فی کی بیٹی تم سے اس طرح بے جھجک ہمکلام ہو سکتی ہے تو سمجھ لو کہ وہ اپنے جذبات پر قابو بھی پا سکتی ہے اور اچھی طرح جان لو کہ مسیحیت کا دشمن میرا آقا نہیں بن سکتا"

ابن حمید نے بے اختیار ہو کر بلانکا کے ہاتھ تھام لئے۔ پہلے اپنے عمامہ پر رکھے۔ پھر سینے سے لگائے اور کہنے لگا "ابن حمید کی خوش ہے۔ یا رسول اللہ اس مسیحی کو ہدایت دیجئے۔ تاکہ . . . . . "

"کیوں کفر بک رہے ہو" بلانکا کی رگ مسیحیت پھڑک اٹھی۔

"آؤ اب چلیں" اس نے مُور کا بازو تھام لیا اور وہ دونوں "بارہ شیر" کے ایوان میں آئے۔

"اجنبی!" ہسپانوی دوشیزہ نے معصومانہ انداز سے کہا "جب میں تمھارے عمامے البادے اور بازوؤں کی طرف دیکھتی ہوں اور اپنی محبت کا خیال کرتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس تنہا

محل میں ابن سراج اور بدقسمت فہیمہ کی روحیں ٹہل رہی ہیں۔ ذرا مجھے اس مرمری تختی کی عبارت تو پڑھ کر سنانا۔"

ابن سراج نے تختی سے عربی اشعار پڑھ کر سنائے۔ "وہ ملکہ جو اپنے ہیرے جواہرات پہن کر پھرتی ہے۔ باغ کے حسن میں چار چاند لگاتی ہے۔" آگے الفاظ مٹ گئے تھے۔

"یہ عبارت تیرے ہی لئے لکھی گئی ہے۔" ابن حمید نے کہا "پیاری سلطانہ! یہ محلات اپنے زمانہ میں بھی اتنے خوبصورت نظر نہ آتے ہونگے جتنے ویران ہونے کے بعد اب نظر آتے ہیں۔ فوآرے کے منہ کو کائی نے ڈھانپ لیا ہے اس کے باوجود اس کا ترنم دیکھ! نیم شکستہ محرابوں کے اوپر سے ابھری ہوئی درختوں کی مخروطی چوٹیاں دیکھ! غلام گردش کے عقب میں دلوں کے ستاروں کو ڈوبتے ہوئے دیکھ۔ اس جگہ تیرے ہمراہ سیر کرنے میں کتنا لطف آ رہا ہے۔ تیری باتوں سے ان کھنڈروں میں بھی رونق نظر آتی ہے۔ تیرے لہجہ سے مجھے اپنے باپ کی زبان کا خیال آتا ہے۔ سنگِ مرمر کے فرش پر جب تیرا جامہ سرسراتا ہے تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ بادِ صبا اس لئے خوشگوار ہے کہ اس نے تیرے بالوں کو مس کیا ہے۔ تو اتنی حسین ہے جتنی ان کھنڈروں میں میر سفک کی روح! لیکن کیا ابن حمید تیرے دل پر فتح پا سکتا ہے؟ کیا اسے تیرے پہلو میں جگہ مل سکتی ہے؟ اس نے اپنے باپ کے ساتھ پہاڑ چھان مارے ہیں۔ وہ صحرا کی ایک ایک بوٹی کو جانتا ہے۔ لیکن آہ! ان میں سے ایک بوٹی بھی اس زخم کو مندمل نہیں کر سکتی جو تیری محبت نے اس کے دل میں لگایا ہے۔ اس کے پاس ہتھیار موجود ہیں لیکن وہ مجاہد نہیں ہے۔ میں کہا کرتا تھا کہ میری مثال سمندر کی اس موج کی طرح ہے جو چٹان کے جوف میں جا کر سو جاتی ہے اور قریب ہی بحرِ بیکراں میں طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ آہ ابن حمید! تیری زندگی بھی اسی طرح خاموش اور پرسکون رہے گی اور سلطان کے محلات میں طوفان آتے رہیں گے۔ لیکن اب اے مسیحی دوشیزہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ طوفان اس موج کو بھی جھنجھوڑ سکتا ہے جو چٹان کے جوف میں خوابیدہ ہو۔"

بلانکا نے ان عجیب و غریب الفاظ کو نہایت توجہ سے سنا۔ اس کے لئے یہ سب باتیں بالکل نئی تھیں۔ اور ان میں مشرقی رنگ غالب تھا، اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ پرستان میں گھوم رہی ہے۔ محبت اس کے دل کے گوشے گوشے میں سرایت کر چکی تھی۔ اس نے اپنے گھٹنوں میں ضعف محسوس کیا۔ وہ اپنے رہنما کے بازوؤں پر پہلے سے بھی زیادہ جھک گئی۔ ابن حمید نے اسے سہارا دیا اور بیخودی میں چلتے چلتے کہنے لگا۔ "آہ! اے کاش میں ابن سراج ہوتا۔"

"تو مجھے بالکل خوشی نہ ہوتی۔" بلانکا نے کہا۔ "بلکہ مجھے روحانی کوفت ہوتی۔ گمنام رہو اور صرف میرے لئے زندہ رہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہادر لوگ شہرت کی خاطر محبت کو بھول جاتے ہیں۔"

"میری طرف سے مطمئن رہو۔" ابن حمید نے جواب دیا۔

"اور فرض کرو تم ابن سراج ہوتے تو پھر مجھ سے کتنی محبت کرتے" زمنا کی بیٹی نے دریافت کیا۔

"میں عزت و شہرت سے بھی کہیں زیادہ محبت کرتا۔" ابن حمید نے جواب دیا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ انھوں نے الحمرا کا ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا تھا۔ ابن حمید کے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ یہاں خفیہ طور پر عود و عنبر سلگائے جاتے تھے اور وہاں سلطانہ کو ان کی خوشبو پہنچ جایا کرتی تھی یہاں وہ اپنا لباس تبدیل کیا کرتی تھی۔ اور وہاں اپنے محبوب کے ساتھ سیریں کیا کرتی تھی۔

چاند طلوع ہو چکا تھا۔ اور اس کی نکھری چاندنی الحمرا کے ویران معبدوں اور سنسان ایوانوں کو اجاگر کر رہی تھی۔ محلات کی دیواریں برآمدوں کی محرابیں اور نہروں کے کنارے اگی ہوئی جھاڑیاں چھٹکی چاندنی میں ایک عجیب ہولناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ ایک صنوبر کی چوٹی سے بلبل نے اپنا دردناک راگ چھیڑا۔ اور اس کی آواز ایک منہدم مسجد کے گنبدوں سے ٹکراتی ہوئی دور نکل گئی۔ ابن حمید نے چاند کی پژمردہ روشنی میں سنگ مرمر کی ایک تختی پر اپنا اور بلانکا کا نام عربی میں کندہ کیا تاکہ بعد میں آنے والے سیاحوں کو اس پراسرار محل میں ایک اور چیستان پر دماغ سوزی کرنا پڑے۔

"مُور! یہ بڑی خوفناک جگہ ہے۔" بلانکا نے کہا۔ "آؤ اب چلیں۔ میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ الفاظ یاد رکھو کہ مسلمان ہو جاؤ تو میں تمھاری مایوس محبوبہ ہوں۔ عیسائی ہو جاؤ تو میں تمھاری خوش قسمت دلھن ہوں۔"

ابن حمید نے جواب دیا۔ "عیسائی رہو تو میں تمھارا ناکارہ غلام ہوں۔ مسلمان ہو جاؤ تو میں تمھارا مفتخر دولہا ہوں۔" اس کے بعد یہ دونوں عاشق و معشوق اس خطرے کی آماجگاہ سے باہر نکل آئے۔

بلانکا کی محبت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ اور اسی طرح ابن حمید کے سینے میں بھی عشق کی چنگاری سلگتی رہی۔ وہ محبت کی دنیا میں اس درجہ کھویا رہا کہ اس نے نواب سانتافی کی بیٹی کو اپنی

پیدائش کا راز بتانا بھی مناسب خیال نہ کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں یہ راز اس دن فاش کروں گا جب بلانکا مجھ سے شادی کرے گی لیکن اچانک اسے تونس سے بلاوا آگیا۔ اس کی ماں بےحد بیمار تھی اور مرنے سے پہلے وہ اپنے بیٹے کا منہ دیکھنا چاہتی تھی۔ ابن حمید ہسپانوی دوشیزہ کے پاس گیا۔ اور اس سے کہنے لگا۔ "میری ماں بستر مرگ پر ہے۔ اب مجھے جانا چاہئے۔ لیکن یہ بتاؤ کیا تم مجھ سے بدستور محبت کرتی رہو گی؟"

"تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو" بلانکا نے مردہ آواز میں کہا۔ "کیا دوبارہ بھی ملاقات ہو سکے گی؟"

"آؤ!" ابن حمید نے کہا۔ "میں تم سے آخری وعدہ لینا چاہتا ہوں میرے ساتھ آؤ۔"

وہ باہر نکلے۔ اور مُوروں کے ایک قبرستان میں آکر ٹھہر گئے۔ کہیں کہیں مسلمانوں کے مزار نظر آتے تھے جن پر مُوری رسم کے مطابق "عمامے کندہ تھے۔ لیکن اب عیسائیوں نے ان کی جگہ صلیبیں ڈال دی تھیں۔ ابن حمید بلانکا کو ایک قبر کے پاس لے گیا اور کہنے لگا۔

"بلانکا! یہ میرے آباؤ اجداد کی قبریں ہیں۔ میں ان کی ہڈیوں کی قسم کھاتا ہوں کہ میں تجھ سے قیامت تک محبت کروں گا۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ میں تجھ سے اس وقت فوراً شادی کر لوں گا جب تو نور ہدایت حاصل کرے گی۔ میں ہر سال یہ دیکھنے کے لئے غرناطہ آؤں گا کہ تو اپنے وعدے پر قائم ہے یا نہیں اور تو نے صلیب کو ترک کیا ہے یا نہیں؟"

"اور میں بھی" بلانکا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "ہر سال تمہارا انتظار دیکھوں گی۔ میں اپنے مذہب پر آخری دم تک کاربند رہوں گی اور جب خداوند یسوع تمہارا دل پھیر دیں گے تو میں فوراً تم سے شادی کر لوں گی۔"

ابن حمید رخصت ہو گیا۔ ہوائیں اسے افریقہ کے ساحل پر لے گئیں اس کی ماں نے دم توڑ دیا۔ وہ زار زار رونے لگا۔ اور ماں کے تابوت کو بوسہ دے کر سپرد خاک کر دیا۔

مہینے گزر گئے۔ کبھی وہ قرطاجنہ کے کھنڈروں میں گھومتا رہتا کبھی سینٹ لوئی کے مقبرے میں بیٹھا رہتا۔ وہ اس دن کے انتظار میں تھا جب قسمت اسے غرناطہ لے جائے گی۔

آخر وہ دن بھی آگیا۔ اس نے ایک جہاز لیا اور اس کا رُخ ملاگہ کی طرف موڑ دیا جب اس نے ساحل ہسپانیہ کی پہلی جھلک دیکھی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیا بلانکا ساحل سمندر پر اس کا انتظار دیکھ رہی ہو گی؟ کیا وہ اب بھی اس غریب عرب کو چاہتی ہے جو صحرائی کھجوروں کے سائے میں ہر وقت اس کی یاد میں کھویا رہتا تھا۔

نواب سانتافی کی بیٹی اپنے وعدہ پر قائم رہی تھی۔ بلانکا اس نے اپنے باپ سے التجا کی کہ مجھے ملاغہ لے چلو۔ وہاں ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر وہ سمندر کی وسعتوں میں اپنی نظریں دوڑاتی رہتی۔ کہ شاید کسی کونے سے کوئی جہاز آتا دکھائی دے۔ اگر طوفان آ جاتا تو وہ اچھلتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ بارش میں بیٹھی رہتی، خطرناک جگہوں میں چلی جاتی، طوفان کی ان لہروں میں بہنا پسند کرتی جو ابن حمید کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتی تھیں۔ جب وہ سمندر کی موجوں کے ساتھ ساتھ کسی آبی پرندے کو ساحل افریقہ کی طرف سے آتی ہوئی دیکھتی تو اسے محبت کے پیغام دینے لگ جاتی اور ایسی ایسی احمقانہ تمناؤں کا اظہار کرتی جو صرف عشق خوردہ دل میں پیدا ہو سکتی ہیں۔

ایک روز جب وہ ساحل سمندر پر آوارہ خرام تھی اس نے ایک لمبا سا جہاز بندرگاہ کی طرف آتے دیکھا۔ اس جہاز کے اونچے ماتھے، خمیدہ مستول اور تکونی بادبان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی مُور کا ہے۔ بلانکا دوڑ کر بندرگاہ کی طرف گئی۔ ایک غیر ملکی جہاز سفید جھاگ اڑاتا تیزی سے اندر داخل ہوا۔ عرشہ پر ایک مُور کھڑا تھا جس نے بارعب وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے دو سیاہ فام غلام تھے جنہوں نے ایک عربی گھوڑے کی باگ تھامی ہوئی تھی۔ گھوڑے کے نتھنوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ ایال اُلجھی ہوئی تھی جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف اس کی طبیعت تیز ہے بلکہ وہ سمندر کی پُرشور تمام موجوں سے سہم گیا ہے۔ جہاز آیا اور رسّے کے ساتھ لگ کر لنگر انداز ہو گیا۔ مُور نے چھلانگ لگائی اور ساحل پر آ رہا۔ اس کے اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ سے بندرگاہ گونج اٹھی۔ اس کے بعد غلام بھی گھوڑے کو ساحل پر لے آئے۔ وہ چیتے کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ اور اپنے قدموں کے نیچے ایک دفعہ پھر زمین محسوس کر کے خوشی کے مارے ہنہنا اور اچھل کود رہا تھا۔ دوسرے غلاموں نے جہاز سے ایک ٹوکری اُتاری۔ جس کے اندر نرم نرم پتوں پر ایک غزال ٹانگیں سکیڑے لیٹا تھا۔ اس کے گلے میں ایلوے کے پھولوں کا ایک پٹا تھا۔ جس کے دونوں سروں کو ایک سنہری تختی نے جوڑ رکھا تھا۔ اس تختی پر عربی میں تعویذ اور ایک نام کندہ تھا۔

بلانکا نے ابن حمید کو پہچان لیا۔ وہ ہجوم کی نظروں میں نہ

آنا چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے اپنی خادمہ وردتھی کے ذریعہ ابن حمید کو کہلا بھیجا کہ میں تمہارا انتظار مُوزر محل میں کر رہی ہوں۔ اُس وقت وہ مُوزر کو اپنا فرمان پیش کر رہا تھا۔ یہ فرمان ایک قیمتی کاغذ پر پیلے حروف میں لکھا تھا۔ اور ریشمی صندوقچے میں بند تھا۔ وردتھی اُس کے پاس پہنچی۔ اور اُسے بلانکا کے نقش قدم پر محل میں لے آئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو مخلص اور وفادار دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ اُن کی ملاقات کافی مدت کے بعد ہوئی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا۔ جیسے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔

سیاہ فام حبشی گھوڑے کو لائے۔ اس کی پیٹھ پر زین کی جگہ شیر کی ایک کھال پڑی تھی جو ارغوانی پیٹی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد غزال لایا گیا۔ "سلطانہ!" ابن حمید نے کہا۔ "یہ میرے ملک کا ہرن ہے اور بالکل تیری طرح اچھلتا کودتا رہتا ہے۔"

بلانکا نے غزال کی رسی کھول دی۔ وہ تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ابن حمید کی عدم موجودگی میں نواب سانتافی کی بیٹی نے عربی سیکھ لی تھی۔ اس نے غزال کے پٹے پر اپنا نام پڑھا۔ اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ غزال اب آزاد تھا لیکن اتنی دیر بندھے رہنے کی وجہ سے ٹانگوں پر مضبوطی سے کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی مالکہ کے قدموں میں لیٹ گیا۔ بلانکا نے اسے تازہ کھجوریں کھلائیں اور اس کے ریشمیں جسم کو جس میں سے تونس کے گلاب اور ایلوے کی خوشبو آرہی تھی آہستہ آہستہ تھپتھپایا۔

اس کے بعد ابن سراج، نواب سانتافی، اور اس کی بیٹی غرناطہ روانہ ہوگئے۔ دونوں محبوں کے دن گزشتہ سال کی طرح ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ وہی لمبی لمبی سیریں، وہی اپنے ملک کو دیکھ کر ابن حمید کی گہری سوچیں، وہی محبت اور وہی خلوص و وفا کا اظہار۔

"عیسائی ہو جاؤ" بلانکا کہتی۔ "مسلمان ہو جاؤ" ابن حمید کہتا۔ اسی طرح چند روز کے بعد وہ دونوں جدا ہو گئے۔

ابن حمید تیسرے سال پھر ان جہاں گرد پرندوں کی طرح آ پہنچا، جو موسم بہار میں ساحل ہسپانیہ کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ اسے بلانکا بندرگاہ میں نظر نہ آئی۔ البتہ ایک حبشی خادم نے اسے ایک خط پیش کیا۔ جس میں اس کی محبوبہ نے لکھا تھا کہ "چونکہ اب نواب سانتافی مدرید چلے گئے ہیں اور دان کارلو ایک فرانسیسی قیدی کے ہمراہ غرناطہ تشریف لائے ہیں اس لئے میں حاضر ہونے سے قاصر ہوں۔" یہ خط پڑھتے ہی مُوزر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ ملاغہ سے غرناطہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن اس کے دماغ میں تفکرات کا ہجوم تھا۔ اسے ارد گرد کے پہاڑ سنسان اور بھیانک نظر آ رہے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ مڑ کر سمندر کی ان موجوں کو دیکھا جن کو چیر کر وہ ساحل ہسپانیہ پر آیا تھا۔

بلانکا باپ کی عدم موجودگی میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ بھائی نے اپنا سب کچھ بہن کی خاطر لٹا دیا تھا اور اب وہ سات برس کی غیر حاضری کے بعد اپنے گھر واپس آیا تھا۔ دان کارلو میں قومی شجاعت بدرجہ اتم موجود تھی وہ نئی دنیا کے فاتحین کی طرح خونخوار اور اسپینی بہادروں کی طرح کٹر ہسپانوی تھا۔ اسے مسلمانوں سے نفرت تھی اور وہ اپنے ملک میں عربوں کا عروج نہ دیکھ سکتا تھا۔

تھامس دی لاترک فائی کے مشہور خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس خاندان کی نسائی خوبصورتی اور مردانہ جرأت زبان زد خلائق تھی وہ نواب نادی فائی اور بہادر و بدقسمت اودے دی فائی حاکم لاترک کا چھوٹا بھائی تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اُسے "نائٹ" بنا دیا گیا۔ اس کے بعد پاویا کی جنگ میں اسے ایک کاری زخم لگا۔ جب دان کارلو نے لاترک کو زخمی ہوتے دیکھا۔ تو اس نے نوجوان فرانسیسی کی دیکھ بھال کی۔ اس کا زخم دھویا اور اس پر پٹی باندھی۔ اس کے بعد دونوں میں دوستی ہو گئی اور جنگ کے بعد دان کارلو، لاترک کو اپنے ہمراہ غرناطہ لے آیا۔

جب ابن حمید دان رودریگوز کے محل میں پہنچا تو اس نے بلانکا کے قدموں میں ایک نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ جو خاموش نگاہوں سے بلانکا کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس پر کیف طاری ہے نوجوان نے پیلے رنگ کے لمبے موزے پہنے ہوئے تھے جو کمر بند سے جکڑے ہوئے تھے اور کمر بند سے ایک تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے شانوں پر ریشم کا ایک چغہ ڈال رکھا تھا۔ اور اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے کنگروں والی ٹوپی تھی۔ جس میں پر اُڑسے ہوئے تھے۔ سینے پر اس نے چغے کو فیتے سے باندھا ہوا تھا۔ اس کی گردن ننگی تھی اور کالی کالی مونچھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بارعب معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پاؤں میں چوڑے چوڑے بوٹ تھے جن کے تلوں پر سنہرے رنگ کے مہمیز لگے ہوئے تھے۔ اور یہ "سرداری" کا نشان تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک اور سردار کھڑا تھا جس کا لباس بھی پہلے کی طرح تھا۔ لیکن قدرے معمر نظر آتا تھا۔ اس کی بارعب شکل و صورت دیکھ کر نہ صرف دہشت طاری ہوتی تھی بلکہ پرستش کرنے کو جی

چاہتا تھا۔ اس کی صدری پر قطاطروہ کی صلیب منقش تھی۔ جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ "اس لڑکی کے لئے اور میرے بادشاہ کے لئے۔"

جب بلانکا نے ابن حمید کو آتے دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ "میرے سردارو!" اس نے فوراً کہا۔ "یہ ہے وہ مُور جس کا تذکرہ میں اکثر کرتی رہتی ہوں۔ اس سے ڈرو کہیں وہ تم پر غالب نہ آجائے۔ وہ ابن سراج کی طرح ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ ابن سراج کی بہادری، جرأت اور وفاداری مشہور ہے۔"

دان کارلو آگے بڑھ کر ابن حمید کے پاس آیا۔ "مُور بہادر!" اس نے کہا۔ "میں نے تمہارا نام اپنے باپ اور بہن سے سُنا ہے۔ تم ایک ممتاز قوم کے فرد ہو اور تم نے اپنی خوش اخلاقی سے ہمارے دل میں گھر کر لیا ہے۔ میرا آقا چارلس دوم بہت جلد تونس پر چڑھائی کرے گا اس لئے امید ہے تم بھی میدان جنگ میں آکر ہم سے ملاقات کرو گے۔"

ابن حمید نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور بلانکا اور لاترک کی طرف دیکھتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ لاترک بھی حیران نگاہوں سے مُور کے مردانہ حُسن، جگمگاتے ہوئے اسلحہ اور شاندار لباس کی طرف دیکھ رہا تھا، بلانکا مضطرب نظر نہ آتی تھی۔ اس کی روح اُس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ دورنگی نہ دکھا سکتی تھی اس لئے اس نے محبت کا راز فاش کر دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ابن حمید اُٹھا اور دان رودریگوز کی بیٹی کو آداب بجا لانے کے بعد چلا گیا۔ مُور کے طرز عمل اور بلانکا کی نگاہوں کو دیکھ کر لاترک کو شک گزرا وہ بھی باہر نکل گیا اور بہت جلد اس کا شک یقین سے بدل گیا۔

صرف دان کارلو اپنی بہن کے پاس بیٹھا رہا۔

"بلانکا!" اس نے کہا۔ "صاف صاف کہو کیا بات ہے؟ تم اجنبی کو دیکھ کر اتنی پریشان کیوں ہو گئیں؟"

"بھائی!" بلانکا نے جواب دیا۔ "مجھے ابن حمید سے محبت ہے۔ اور اگر وہ عیسائی ہو جائے تو میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دونگی۔"

"کیا کہا؟" دان کارلو حیرت سے چلّا اٹھا۔ "تم ابن حمید سے محبت کرتی ہو؟ ہمارے خاندان کی بیٹی ایک مُور سے ایک غیر عیسائی سے ایک دشمن سے محبت کرتی ہے۔ وہی نا جس کے آبا و اجداد کو ہم نے دھکے دے کر ان محلات سے نکال دیا ہے۔"

"دان کارلو!" بلانکا نے جواب دیا۔ "میں ابن حمید سے محبت کرتی ہوں وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ تین سال تک مجھ سے جدا رہا ہے لیکن اس نے اپنے آبائی مذہب کو ترک نہیں کیا۔ اس میں شرافت، عزت نفس، اور شجاعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں آخری دم تک اس کی پرستش کرونگی۔"

دان کارلو اتنا عالی ظرف تو یقیناً تھا کہ ابن حمید کے عزم و ارادہ کی داد دیتا۔ تاہم وہ ایک غیر عیسائی کی کوتاہ نظری پر افسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"بدنصیب بلانکا!" اس نے کہا۔ "یہ محبت تجھے کہاں لے جائیگی۔ میرا تو خیال تھا کہ میرا دوست لاترک میرا بھائی بن سکے گا۔"

"یہ تمہاری غلطی ہے۔" بلانکا نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں اس اجنبی سے محبت نہیں کر سکتی۔ جہاں تک ابن حمید کے متعلق میرے جذبات کا تعلق ہے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ جس طرح میں اپنی محبت پر قائم ہوں اسی طرح تم بھی اپنی سرداری کا خیال رکھو۔ البتہ مطمئن رہو کہ تمہاری بلانکا ایک غیر عیسائی کی دلہن ہرگز نہ بنے گی۔"

"لیکن کیا ہماری نسل روئے زمین سے نابود ہو جانی چاہیئے؟" دان کارلو نے کہا۔

"یہ تمہارا کام ہے کہ اسے زندہ رکھو۔" بلانکا نے کہا۔ "لیکن آخر اس اولاد کا کیا فائدہ جسے تم دیکھ بھی نہ سکو گے اور جس میں تمہاری خوبیاں موجود نہ ہونگی۔ دان کارلو! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس نسل کے آخری افراد ہیں۔ ہم اپنے مرکز سے اس درجہ ہٹ چکے ہیں کہ اب ہماری اولاد ترقی نہیں کر سکتی۔ شاید ہمارا جدِ امجد تنہا اور غالباً ہماری نسل کا آخری فرد بھی وہی ہو گا۔" بلانکا وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

دان کارلو دوڑ کر ابن حمید کے پاس پہنچا۔ "مُور!" اس نے کہا "میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ ورنہ آؤ میرا مقابلہ کرو۔"

"کیا تجھے تیری بہن نے بھیجا ہے؟" ابن حمید نے پوچھا۔ "مجھے یقین ہے کہ میری خوش حالی کا باعث ہی تیری قوم ہے۔ واہ ابن حمید! کیسا اچھا دن ہے! میرا خیال تھا کہ بلانکا اس فرانسی سردار کی خاطر بے وفا ہو گئی ہے۔"

"یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔" دان کارلو نے جذبات آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "لاترک میرا دوست ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو وہ میرا بھائی ہوتا۔ تم نے ہمارے خاندان کو آنسو بہانے پر مجبور کیا ہے۔ میں اس کا بدلہ لونگا۔"

"میں تیار ہوں۔" ابن حمید نے جواب دیا۔ "لیکن میرا تعلق اس قوم سے ہے جس نے تیری قوم سے جنگ کی تھی۔ میں چونکہ سردار نہیں رہا اور یہاں یہ خطاب مجھے مل بھی نہیں سکتا اس لئے میں تیرے خطاب کی بے عزتی کر کے مقابلہ پر اترنا نہیں چاہتا۔"

دآن کارلوان الفاظ سے بیحد متاثر ہوا۔ اُس نے مُوزر کی طرف غصّے اور احترام کی ملی جلی نظروں سے دیکھا۔ پھر بولا۔ "میں تمھیں شہسوار کا خطاب دیتا ہوں۔ تم اس کے حقدار ہو۔"

ابن حمید نے دان کارلو کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس نے ابن حمید کو ننگی تلوار سے تین مرتبہ مَس کیا اور پھر تلوار اس کے کمربند سے لٹکا دی۔ حالانکہ ممکن تھا کہ یہی تلوار ابن حمید اس کے سینہ میں بھونک دیتا۔ لیکن عزت افزائی کا پرانا طریقہ یہی تھا۔

دونوں جوان اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور غرناطہ کی فصیل سے نکل کر "صنوبر کا چشمہ" پر پہنچے۔ یہ چشمہ مُوزروں اور عیسائیوں کی دست بدست جنگ کے لئے مشہور تھا۔ اس جگہ ملک اللہ بن نے قلاطروہ کے حاکم اعلیٰ سے دو دو ہاتھ کئے تھے اور اسی جگہ ابوعامر نے شہادت پائی تھی۔ صنوبر کی شاخوں سے اب بھی اس بہادر مُوزر کی مزار کے نیچے کچھ اسلحہ لٹکے ہوئے تھے۔ اور درخت کے تنے پر اس کا کتبہ موجود تھا۔ دان کارلو نے اس شہید کے مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن حمید سے کہا۔ "اس غیر عیسائی کی تقلید کرتے ہوئے میرے ہاتھوں سے موت یا بپتسمہ قبول کرو۔"

"غالباً موت ہی قبول کروں گا۔" ابن حمید نے جواب دیا۔ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

اس کے بعد دونوں میدان میں ڈٹ گئے اور غضبناک ہو کر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ دان کارلو کی طرح ابن حمید تجربہ کار نہ تھا۔ لیکن موخر الذکر نے اپنی تلوار دمشق سے تیز کرائی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا عربی گھوڑا بھی پھرتیلا تھا۔ یہی دو سبب تھے کہ وہ دان کارلو پر غالب آ گیا۔ وہ ایک بہادر مُوزر کی طرح اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے اپنی لمبی تلوار سے دان کارلو کے گھوڑے کی دائیں ٹانگ کاٹ ڈالی جانور زخمی ہو کر گر پڑا۔ دان کارلو گھوڑے سے گر کر فوراً سنبھل گیا۔ اور تلوار اٹھا کر ابن حمید کی طرف بڑھا۔ ابن حمید بھی گھوڑے پر سے اتر آیا۔ اور پورے جوش سے اپنے حریف کی طرف بڑھا۔ اُس نے ہسپانوی کے حملوں کو روکنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اُس کی تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ آخر مایوس ہو کر دآن کارلو نے کہا۔ "آؤ مارو۔ حملہ کرو۔ دان کارلو نہتا ہو کر بھی تم ایسے غیر عیسائیوں سے نفرت کرتا ہے۔"

"تو مجھے قتل کر سکتا ہے۔" ابن سراج نے جواب دیا۔ "لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تجھے زخمی کر سکوں گا۔ میں صرف اتنا ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں تیرا بھائی بننے کے قابل ہوں۔ اس لئے مجھ سے نفرت بیسود ہے۔"

عین اس وقت گرد و غبار کا ایک بادل اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔ لاترک اور بلانکا فیض کے دو تیز رفتار گھوڑوں پر سوار سرپٹ دوڑے آ رہے تھے۔ جب وہ "صنوبر کی چشمہ" پر آئے تو لڑائی ختم ہو چکی تھی "میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔" دان کارلو نے کہا۔ اس سردار نے میری جان بخشی کی ہے۔ لاترک شاید تم مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہو۔"

"لیکن میرے زخم مجھے اس خوش اخلاق سردار سے لڑنے کی اجازت نہ دے سکیں گے۔" لاترک نے شریفانہ اور باوقار انداز میں جواب دیا۔ اس نے قدرے شرما کر یہ بھی کہا۔ "مجھے تمھارے تنازع کی وجہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ میں ایک ایسے راز میں دخل دینا چاہتا ہوں جس کا انکشاف میرے دل پر موت طاری کر سکتا ہے میں عنقریب باہر جانے والا ہوں۔ میرے بعد تم صلح کر سکتے ہو بیاد رہے کہ بلانکا مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دے۔"

"سردار" بلانکا نے کہا۔ "تم میرے بھائی کے ساتھ ٹھہرو۔ اور مجھے اپنی بہن سمجھو۔ ہم سب کے دل زخم خوردہ ہیں۔ تم بھی زندگی کے مصائب برداشت کرنا سیکھ جاؤ گے۔"

بلانکا نے پوری کوشش کی کہ تینوں سردار ایک دوسرے سے ہاتھ ملا لیں۔ لیکن دآن کارلو نے کہا "مجھے ابن حمید سے نفرت ہے" لاترک بولا۔ "مجھے اس پر رشک آتا ہے۔" ابن حمید نے جواب دیا "میں دان کارلو کا احترام کرتا ہوں اور لاترک پر مجھے ترس آتا ہے۔ لیکن میں ان دونوں کا دوست نہیں بن سکتا۔"

"آؤ ہم اکٹھے رہیں۔" بلانکا نے کہا۔ "اور جلد یا بدیر یہ دوستی احترام سے بدل جائے گی۔ لیکن ان باتوں کا چرچا غرناطہ میں نہیں ہونا چاہئے۔"

اس کے بعد بلانکا کی نظروں میں ابن حمید کی وقعت بڑھ گئی۔ محبت کو بہادری پسند ہے۔ ابن حمید بہادر تھا۔ اس نے دآن کارلو کی جان بخشی کی تھی۔ بلانکا کے مشورے کے مطابق ابن حمید چند روز تک محل میں نہ آیا تاکہ اتنے میں دان کارلو کا غصّہ ٹھنڈا ہو سکے۔ اُس کے دل میں خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے ایک طرف خلوص و وفا کے وعدے اس کے دل کو ڈھارس دے رہے تھے۔ دوسری طرف آبائی مذہب کو خیرباد کہہ دینے کا مطالبہ تھا لیکن وہ مذہب کیونکر چھوڑ سکتا تھا؟ پہلے ہی کئی برس گزر چکے تھے لیکن ابھی

تک اس کے درد کا مداوا نہ ہو سکا تھا۔ کیا اُس کی باقی ماندہ زندگی بھی اسی طرح گزرے گی؟

ایک دن وہ گہرے تفکرات میں کھویا ہوا تھا کہ اُس نے شام کی دُعا کے لئے گرجے کی گھنٹی سنی۔ اس نے سوچا کہ چلو آج بلانکا کے "خداوند" کے گھر ہی ہو آئیں۔ شاید آسمانی باپ اس کی رہنمائی کر سکے۔

وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ایک پرانی مسجد کے دروازے پر پہنچا جسے عیسائیوں نے گرجا بنا لیا تھا۔ اس کا دل رقت سے بھر آیا تھا۔ وہ خدا کے گھر میں بلا تامل داخل ہو گیا۔ عیسائیوں کی دُعا ختم ہو چکی تھی اور اب عبادت گاہ خالی تھی۔ گرجے کے بیشمار ستون شام کی تاریکی میں درختوں کی قطاروں کی طرح خاموشی سے ایستادہ تھے۔ اس وقت خواہ مخواہ عبادت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ محرابوں میں کہیں کہیں دیئے ٹمٹما رہے تھے لیکن وسط میں عیسائیوں کی صلیب گاہ تھی جس پر بہت سی موم بتیاں روشن تھیں۔ اور ان موم بتیوں کی روشنی میں صلیب کے ہیرے جواہرات جگمگا رہے تھے۔ ہسپانوی اپنے معبودوں کو سونا چاندی سے لادنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ حالانکہ خود عبادت گزار پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ صحن میں بیٹھنے کی کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ سب لوگ فرش ہی پر گھٹنے ٹیکتے تھے۔ ابن حمید آہستہ سے آگے بڑھا اور اس کے قدموں کی چاپ سے گرجے کا بغلی رستہ گونج اٹھا۔ اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ایک طرف قدیم عبادت گاہ دیکھ کر اسے اپنے بزرگوں کے دین کا خیال آ رہا تھا۔ دوسری طرف آج اس نے عیسائیوں کے خداوند سے محبت کی بھیک مانگنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک ستون کے سائے میں اُس نے ایک بیجان سی مورتی دیکھی۔ جیسے مزار پر کوئی تصویر کندہ ہو۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو اسے ایک نوجوان سردار سینے پر ہاتھ باندھے، سر جھکائے اور گھٹنے ٹیکے نظر آیا۔ سردار نے ابن حمید کی آمد پر بھی کوئی جنبش نہ کی۔ وہ دُعا میں اس درجہ محو تھا کہ بظاہر اس میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ اُس کی تلوار قریب ہی زمین پر پڑی تھی۔ اور پروں والی ٹوپی بھی نزدیک ہی سنگ مرمر کے چبوترے پر رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جادو کے زور سے اُسے زمین میں نصب کر دیا گیا ہے —— وہ لاترک تھا!

"آہ!" ابن حمید نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ خوبصورت نوجوان فرانسیسی اپنے آسمانی باپ سے کوئی خاص دعا مانگ رہا ہے۔ وہ بہادر ہے۔ اس کی شجاعت کا شہرہ دُور دُور پہنچ چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے خداوند کے آگے عجز و تذلل کا اظہار کر رہا ہے۔ تو پھر میں بھی اس کی تقلید کیوں نہ کروں؟"

ابن حمید خداوند یسوعؑ کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی والا تھا کہ اُسے دیئے کی مدھم روشنی میں سامنے کی دیوار پر قرآن مجید کی ایک آیت نظر آئی جس کا کچھ حصہ بوسیدہ پلستر کی وجہ سے مٹ چکا تھا۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اس نے عیسائیوں کے خداوند کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اور فوراً گرجے سے باہر نکل آیا۔

پرانی مسجد کے اردگرد ایک قبرستان تھا۔ جس میں کھجوروں، سنگتروں اور شہتوت کے بیشمار درختوں کا ایک باغ تھا۔ اور دو چشمے اسے سیراب کرتے تھے۔ اس باغ میں سے ابن حمید گزر رہا تھا کہ اس نے ایک نقاب پوش عورت کو گرجے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے فوراً پہچان لیا۔ یہ نواب سانتانا کی بیٹی تھی۔ اس نے آواز دی اور پوچھا "لاترک سے ملنے آئی ہو؟"

"چھوڑو اس حاسدانہ جذبے کو۔" بلانکا نے جواب دیا۔ "اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں صاف صاف کہہ دیتی۔ مجھے دھوکہ دینا نہیں آتا۔ میں تو دعا کرنے آئی ہوں۔ اب میرے خیالات کی دنیا میں بس تم ہی تم ہو۔ تمہیں یا تو میری رگوں میں محبت کا زہر نہیں پھیلانا چاہیئے تھا۔ یا پھر تم اسی خداوند کے سائے میں آ جاتے جس کے سائے میں ہم لوگ بیٹھے ہیں۔ تم نے میرے سارے خاندان کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میرا بھائی تم سے نفرت کرتا ہے۔ میرے باپ کو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میں اپنے شوہر کا انتخاب کیوں نہیں کرتی۔ پھر دیکھئے! میری صحت کتنی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اس قبرستان کی طرف دیکھو۔ یہ مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب میں اسی کے آغوش میں جا لیٹوں گی۔ ورنہ جلدی کرو اور بپتسمہ لے لو۔ میرا جسم اندر ہی اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ محبت کی جو چنگاری تم نے سلگائی ہے وہ آگ بن کر میری زندگی کو خاکستر بنانے والی ہے۔ حضور! تمہیں عربی کا وہ مقولہ تو یاد ہی ہوگا کہ جو شعلہ شمع کو روشن رکھتا ہے وہی اسے بھسم بھی کر دیتا ہے۔"

یہ کہتے ہی بلانکا گرجے میں داخل ہو گئی۔ اور ابن حمید اُس کے آخری الفاظ پر غور کرتا رہا۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا۔ ابن سراج مغلوب ہو چکا تھا وہ اپنے مذہب کو خیرباد کہہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ بلانکا کو تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ "آخر" اس نے اپنے دل میں کہا۔ "عیسائیوں کا خدا بھی تو سچا خدا ہے۔ وہ بلانکا۔ دان کارلو اور لاترک کا خدا ہے اس لئے وہ یقیناً قابل پرستش ہستی ہے۔"

یہ سوچ کر ابن حمید دوسرے دن کا بیتابی سے انتظار کرنے لگا۔

وہ بلا نکالنے کہہ دینا چاہتا تھا کہ میں تمہاری غموں اور آنسوؤں کی زندگی کو خوشی اور مسرت سے بدل دینا چاہتا ہوں لیکن وہ شام تک نواب سانتا تا فی کے محل میں نہ جا سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم ہوا کہ بلا نکا اپنے بھائی کے ساتھ غرناطہ چلی گئی ہے جہاں لاترک نے ان کے اعزاز میں دعوت طعام کا بندوبست کیا تھا۔ ابن حمید کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں معاملہ دگرگوں نہ ہو جائے اس لئے وہ بھی بلا نکا کے پیچھے پیچھے گیا۔ لاترک ثمود کو دیکھتے ہی لال بھبوکا ہو گیا۔ دان کارلو نے نہایت سرد مہری سے اُس کا استقبال کیا تاہم یہ ظاہر تھا کہ وہ اپنے حریف کی عزت کر رہا ہے۔

لاترک نے ان کی تواضع ہسپانیہ اور افریقہ کے بہترین پھلوں سے کی۔ دعوت کا اہتمام غرناطہ کے اس کمرے میں کیا گیا جو "قصر الامرا" کے نام سے مشہور تھا۔ دیواروں پر ہر طرف ان شہزادوں اور سرداروں کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں جنہوں نے موروں کو مغلوب کیا تھا۔ تصویر کے نیچے غرناطہ کے آخری بادشاہ کی تلوار جگمگا رہی تھی۔ ابن حمید اپنے غصے کو پی گیا۔ اور اس روایتی شیر کی طرح جس نے ایک تصویر میں انسان کو شیر کی چھاتی پر سوار دیکھا تھا کہنے لگا۔ "افسوس! یہ تصویر صحیح نہیں بنائی"۔

لاترک نے جب دیکھا کہ ابن سراج کی نظریں باب عادل کی تلوار پر جمی ہوئی ہیں تو اس نے کہا۔ "مور بہادر! اگر مجھے علم ہوتا کہ تم بھی دعوت میں شریک ہو کر میری عزت افزائی کر رہے ہو تو تمہیں اس کمرے میں ہرگز آنے کی دعوت نہ دیتا۔ تلواریں اکثر کھو جاتی ہیں۔ میں نے بڑے بڑے بہادر بادشاہوں کو اپنی تلواریں دشمن کے حوالے کرتے دیکھا ہے"۔

"آہ!" مور نے اپنے چہرے کو جُبّے کے ایک گوشے سے چھپاتے ہوئے کہا "فرانسس کی طرح تلوار کھو جائے تو حرج نہیں۔ لیکن باب عادل . . . ."

شام ہو گئی تھی اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شمعیں روشن کی گئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ دان کارلو سے درخواست کی گئی کہ وہ میکسیکو کی فتح کے حالات سنائے۔ اُس نے عام ہسپانیوں کی طرح فصیح اور شستہ زبان میں میکسیکو کے ملکی کوائف پر روشنی ڈالی۔ مونتے زوما کی بدقسمتیوں کا نقشہ کھینچا۔ کستیلہ کے بہادروں کے عجیب و غریب کارنامے سُنائے۔ امریکیوں کے رسم و رواج کو موضوع بحث بنایا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ہم وطنوں کے مظالم کا بھانڈا پھوڑنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ابن حمید اس کی باتوں کو غور سے سن رہا کیونکہ آخر وہ عرب تھا اور عربوں کو قصص و حکایات سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ابن حمید نے سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال پر بحث کی اور بتایا کہ ترکوں نے کس طرح قسطنطنیہ کے کھنڈروں پر ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی ہے۔ پھر اس نے خلیفہ ہارون الرشید کے شاہی دربار کی شان و شوکت کا تذکرہ کیا اور سلطانہ زبیدہ کے حسن و جمال کا کچھ ایسے کشش انگیز پیرائے میں نقشہ کھینچا کہ محفل جھوم اٹھی۔ اس کے بعد لاترک نے فرانسس کے شاہی دربار کے چشم دید حالات سُنائے اور بتایا کہ کس طرح بربریت کے اُفق سے فنون لطیفہ کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ کس طرح قدیم زمانے کی جرات و شجاعت کے طفیل تہذیب و ترقی کے نئے ایوان تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اور کس طرح گوتھی اور یونانی تمدنوں کے امتزاج سے ایک نئی ثقافت ظہور میں آ رہی ہے۔

ان داستان سرائیوں کے بعد لاترک نے ربۃ طعام کو خوش کرنے کی غرض سے ستارا ہاتھ میں لیا اور اپنے ملک کے پہاڑی طرز پر ذیل کا گیت سنایا۔

"اپنے پیارے وطن کے خواب بھی
کس درجہ سہانے ہوتے ہیں۔
بہن! تیرے ہمراہ
میرا ہر دن خوشی سے کٹتا تھا۔
کیا تم ماں کی ان نگاہوں کو بھول گئیں
جن میں پیار کروٹیں لیتا تھا۔
کیا تمھیں وہ دن یاد ہیں
جب ہم جھیل کے کنارے کھیلا کرتے تھے
آہ! اے کاش!
وہ گزرا ہوا زمانہ ایک مرتبہ پھر لوٹ آئے ——!"

گیت کا آخری بند گاتے وقت لاترک کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور اس نے اپنے دستانے سے اپنے آنسو پونچھے۔ ابن حمید نے سوچا کہ جب لاترک کو اپنا وطن اس درجہ پیارا ہے تو مجھے اپنے آباؤ اجداد کا وطن کیوں نہ عزیز ہو؟ اتنے میں محفل کی طرف سے اصرار ہوا کہ ابن حمید بھی گانا سنائے اس نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا کہ مجھے صرف ایک گیت یاد ہے لیکن وہ عیسائیوں کو پسند نہیں آ سکتا۔

"اگر یہ گیت کسی غیر مسیحی شاعر کا ہے" دان کارلو نے کہا۔ "تو کوئی حرج نہیں۔ ہماری فتوحات سے اگر غیر عیسائی انگاروں پر لوٹ رہے ہیں تو یہ قدرتی بات ہے۔ مفتوحین کو رونے کی اجازت تو ہونی چاہیئے"۔

"ہاں ٹھیک تو ہے" بلا نکا نے بھائی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی تو زمانہ تھا جب موروں نے ہمارے آباؤ اجداد کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا"۔

آخر سب کے اصرار پر ابن حمید نے ستارا ہاتھ میں لیا اور بنو سراج

کے ایک شاعر سے سُنا ہُوا ذیل کا گیت گایا۔

"کہتے ہیں ایک روز دان جان گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ اس نے دُور سے غرناطہ کی عمارتوں کو جگمگاتے دیکھا۔ اس نے قسم کھائی کہ اس حسین و جمیل سرزمین پر قبضہ کر کے رہوں گا۔

اُس نے شہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے اپنی دلہن بناؤں گا قرطبہ اور سیوائل تجھے جہیز میں دوں گا۔ اور اپنی محبت کے ثبوت میں تجھے ریشمی پوشاکوں اور ہیرے جواہرات سے لاد دونگا۔"

دُلہن نے جواب دیا۔ "کیُون کے بادشاہ! میرا بیاہ تو پہلے ہی ایک مُور سے ہو چکا ہے۔ اس لئے اپنے تحفے رہنے دے۔ میرے لئے سنہرا پٹکا اور بہادر دولہا ہی کافی ہے۔"

اس کی باتوں سے غرور ٹپک رہا تھا اور در اصل وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ بدبخت نصرانیوں نے بنو سراج کی وراثت پر ہاتھ صاف کر لیئے۔ آہ قسمت!

اب عرب کے ساحل سے حاجیوں کے قافلے نہ آئیں گے۔ کیونکہ بدبخت نصرانیوں نے بنو سراج کی وراثت پر ہاتھ صاف کر لئے ہیں۔ آہ قسمت!

الحمرا ایک پرشکوہ محل تھا اسے چشمے سیراب کرتے تھے۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ لیکن آہ بدبخت نصرانیوں نے بنو سراج کی وراثت پر ہاتھ صاف کر لئے۔ آہ قسمت! ــــ"

باوجودیکہ نوحے میں نصرانیوں کو بُرا بھلا کہا گیا تھا اس کی سادگی دان کارلو کو متاثر کئے بغیر نہ رہی۔ ابن حمید کے بعد دآن کارلو کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی گانا سنائے۔ اس کا جی تو نہ چاہتا تھا تاہم لاترک کے اصرار سے مجبور ہو کر اس نے بھی چھتار ہاتھ میں لیا اور اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو فخریہ انداز میں بیان کرنے لگا۔

"زمنا مجھے حکم دیتی ہے کہ میں مُوروں سے جنگ کروں اور فتحیاب ہو کر واپس آؤں۔ وہ کہتی ہے اس کے بعد مجھے یقین ہوگا کہ تمہاری محبت سچی ہے۔

لاؤ میرا خود لاؤ۔ میرا نیزہ لاؤ۔ اور دنیا سے کہہ دو کہ رودر گوز کا دل بیتاب ہے۔ وہ ہر لڑائی میں "آگے بڑھو" کا نعرہ لگانا چاہتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ کو اپنی بہادری کا ثبوت دینا چاہتا ہے۔

ظالم مور! تو خواہ مخواہ اپنی شجاعت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ میرے بہادرانہ گیت کی تان تیرے نغمے پر حاوی ہو جائے گی۔ تا آنکہ لوگ اُسے "فخر ہسپانیہ" کہنے پر مجبور ہوں گے۔ کیونکہ وہ محبت اور شجاعت کا گیت ہے وادئ اندلس میں میری بہادری کی داستانیں اب بھی مشہور ہیں

اور بڑے بوڑھوں کی زبانی معلوم ہو سکتی ہیں کہ میں نے اپنے خداوندا اپنے بادشاہ، اپنے عشق اور اپنے وقار کو اپنی زندگی پر ترجیح دی۔"

دآن کارلو نے یہ فخریہ گیت کچھ ایسی مردانہ اور کھنکدار آواز میں گایا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود سیٔد ہے۔ لاترک بھی اپنے دوست کے جوش و خروش میں برابر کا حصہ دار تھا۔ لیکن ابن سراج سیٔد کا نام سنتے ہی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"یہ سیٔد کیا وہی سردار ہے۔" اس نے پوچھا۔ "جسے عرب لوگ ظالم کہتے ہیں۔ کاش وہ بہادر ہونے کے علاوہ فیاض بھی ہوتا . . . . "

"وہ یقیناً فیاض تھا۔" دآن کارلو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "مُور ہی ایک ایسے بطل حریت کو بُرا کہہ سکتے ہیں۔ جو میرے خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔"

"کیا کہا؟" ابن حمید نے جیسے چونک کر کہا۔ "سیٔد تمھارا مُورث اعلیٰ تھا۔"

"ہاں۔ اس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔" دآن کارلو نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے اس شاہی خون پر فخر ہے باوجودیکہ میرے دل میں خداوند یسوع مسیح کے دشمنوں کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ بھڑک رہی ہے۔"

"تو گویا تم بیوار خاندان کی فرد ہو۔" ابن حمید نے بلانکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہی بیوار جو سقوط غرناطہ کے بعد بنو سراج کے گھروں میں داخل ہوئے اور ان کے ایک بوڑھے سردار کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ اپنے باپ کے مقبروں کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔"

"مُور!" دان کارلو نے سیخ پا ہوتے ہوئے کہا۔ "میں کسی کے ساتھ جھگڑنا نہیں چاہتا۔ اگر میرے پاس بنو سراج کا مال غنیمت موجود ہے تو میرے آبا و اجداد نے اسے خون بہا کر حاصل کیا ہے۔"

"اس کے باوجود ایک بات ہے۔" ابن حمید نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔ "جلاوطنی کی حالت میں ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ سانتافی در اصل بیواروں ہی کا لقب ہے ــــ اسی وجہ سے مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"ہاں! بیوار نے بنو سراج پر فتح پائی۔" دان کارلو نے جواب دیا "اور فرڈی نند نے اسے سانتافی کے خطاب سے سرفراز کیا۔"

ابن حمید کا سر چھاتی پر ڈھلک گیا۔ وہ دان کارلو، لاترک اور بلانکا کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو جاری تھے جو لڑھکتے لڑھکتے کمربند کے خنجر تک جا پہنچے۔

ــــ (باقی صفحہ ۱۷۹ پر ملاحظہ فرمائیے) ــــ

شاد عارفی

رنگ و بُو

جب کاوشِ الم سببِ زندگی ہوئی — جس آرزو کی روح بجھا دی خوشی ہوئی

وہ چشمِ نیم خواب وہ زُلفیں گری ہوئی — صُبحِ بہار ایک ہی انگڑائی کی ہوئی

ہم اور سیرِ باغ اگر چاندنی ہوئی — منظر پہ لا کے بیٹھے ہیں گھری چھنی ہوئی

جاتی ہے بار بار تنبوں سے پرے نظر — اُٹھتی ہے بار بار یہ چلمن پڑی ہُوئی

جب دیکھئے کسی کا تصوّر ہے اور ہم — درکار تھی بغل میں صُراحی دبی ہُوئی

فقدانِ رنگ و بُو تھا گلوں میں ترے بغیر — لَو دے رہی ہیں آج یہ شمعیں بجھی ہُوئی

دُنیا میں ذوقِ نقدِ تماشا نہیں رہا — دُنیا گزر گئی ہے مجھے دیکھتی ہوئی

ہر شخص کو نصیب نہیں مجھ سے تجربے — کشتی ڈبو چکا ہوں کنارے لگی ہوئی

ٹھوکر یہ مارتا ہوں ہر اُس انجمن کو میں — میری طرف جہاں بھی ذرا لے رُکی ہوئی

کھلتے نہیں نگاہ شناسانِ بزمِ دوست — پھرتی ہے وہ نگاہ کسے ڈھونڈتی ہوئی

اے شاد شاعری میں تڑپ چاہتا ہوں میں
جو آرزو تڑپ سکی شاعری ہُوئی

منظر صدیقی اکبر آبادی

نذرِ جاناں

حُسن کو فطرت نے جب مقسومِ انساں کردیا
ایک ذرہ کو بڑھاکر ماہِ تاباں کردیا

اپنے جلوؤں کو عیاں تاحدِ امکاں کردیا
آپ نے بے موت مرجانے کا ساماں کردیا

کیا قیامت ہیں تمھاری یہ تلوّن کیشیاں
خود کیا آباد دل کو خود ہی ویراں کردیا

جلوہ گاہِ نالہ و گل سے اُسے کیا واسطہ
آپ نے خود جس کو مجبورِ بیاباں کردیا

کیا کسی بیکس کا بھی ہمدرد ہوتا ہے کوئی
آج کس نے میری تربت پر چراغاں کردیا

زندگی حائل ہوئی جب عشق کی تکمیل میں
زندگی کو ہم نے نذرِ موجِ طوفاں کردیا

آج ہم تربت میں ہیں آسودۂ طوفانِ غم
موت نے آخر علاجِ دردِ پنہاں کردیا

خارزارِ زندگی کو کردیا آراستہ
عشق نے مستقبلِ ہستی درخشاں کردیا

ہم یہ اُن سے کہہ تو بیٹھے تم بڑے بے درد ہو
اب تاسّف ہے کہ اُن کو کیوں پریشاں کردیا

اس کا حصہ ہے یقیناً امتیازِ خیر و شر
جس نے اپنی زندگی کو غرقِ عصیاں کردیا

باغباں کے اختیارات خصوصی الاماں
جس کو چاہا اس کو محرومِ گلستاں کردیا

ہم نے خود ہی کفر و ایماں کے جھمیلے چھوڑ کر
یوں عبادت کی کہ دل کو نذرِ جاناں کردیا

یا الٰہی اُس کو ہو جمعیتِ خاطر نصیب
جس نے اُمیدوں کا شیرازہ پریشاں کردیا

بڑھتی جاتی ہیں تپش اندوزیاں خورشید کی
کیا کسی نے اپنا داغِ دل نمایاں کردیا

کون اے منظرؔ یہ چمکا پھر حریمِ روح میں
کس نے میری خفتہ اُمیدوں کو خنداں کردیا

سید نادم سیتاپوری

مشاہیرِ اُدبا کے آٹوگراف

پہلے پہل جب میں نے آٹوگراف بُک رکھنے کا ارادہ کیا تو میرا خیال تھا کہ بہت جلد میں ہندوستان کے مختلف طبقوں اور بہت سی جماعتوں۔ مشاہیر اور بلند پایہ ہستیوں کے خیالات۔ رائیں اور نظریئے فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے کافی اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے مشاہیر پر مغربیت کا رنگ اس قدر غالب آچکا ہے کہ ان کے صحیح خیالات اور آزاد رائیں صرف دو حرفی دستخطوں میں پنہاں ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یورپ میں "آٹوگراف البم" Autograph Album رکھنے کا اس قدر زیادہ رواج ہے کہ درحقیقت وہاں دستخط حاصل کر لینا بھی ایک بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان میں ابھی اس قسم کی دشواریاں نہیں ہیں۔

"آٹوگراف" کے ابتدائی تخیل و تصور میں ممکن ہے کچھ ایسی حد بندیاں موجود ہوں کہ اس کی شان "دستخطوں کا میوزیم" بن کر رہ جائے۔ لیکن درحقیقت اس کا صحیح مصرف یہی ہے کہ عہدِ حاضر کی شخصیتوں کو تحریروں میں محفوظ کر لیا جائے۔ ان کے خیالات، ان کی رائیں، ان کے نظریئے سب یکجائی طور پر محفوظ ہو جائیں۔ مگر میری کوششیں ابھی چند ہی قدم آگے بڑھی ہوں گی کہ ناکامیاں سنگِ راہ بن گئیں ـــ "وہی دستخط" وہی دستخط ـــ مجبور ہو کر میں نے اس سلسلہ کو محدود کر دیا ـــ اور اب بالکل بند۔ یہ سچ ہے کہ اس آٹوگراف میں جس نے بھی جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ انھیں خصوصیات کی بنا پر ہے۔ جو میرے اور ان کے درمیان موجود ہیں ـــ اس کا معیار ـــ اس کی تربیت۔ سب کچھ ایک ایسا خلوص ہے جس کا اندازہ صرف میری نگاہوں سے کیا جا سکتا ہے۔ مشاہیر ـــ پرخلوص احباب ـــ محترم بزرگ، اور مجھے بھلا دینے والوں کی یہ زندۂ جاوید تصویریں ہیں۔ جب بھی دیکھتا ہوں تو ان کی محبت بھری یاد دل کو تڑپا دیتی ہے۔ میں نے قصداً ان افراد کو شامل نہیں کیا۔ جنھوں نے دستخط کر کے یا تو عذاب ٹال دیا یا جو کچھ لکھا بھی ـــ اس میں بناوٹ اور دکھاوے کو دخل تھا۔

حضرت نیاز فتحپوری ہندوستان کے ایک مشہور ادیب اور نامور انشا پرداز ہیں۔ میرے آٹوگراف میں سب سے پہلی تحریر انھیں کا مقطعہ ہے جو میرے لئے ایک تبرک سے کم نہیں ؎

بجز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

جناب واقف گجرامی مرحوم نہ محض میرے ایک مخلص بزرگ تھے بلکہ ان کا شمار گزرے ہوئے دور کے ان اہلِ کمال افراد میں ہے جن کو بھول جانے کے لئے بھی صدیاں درکار ہیں۔ ایک اچھے لکھنے والے ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک کہنہ مشق شاعر، ایک بے مثال تاریخ گو اور اچھے نقاد کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد آئیں گے۔ "مرقع" کی پرانی فائلیں آج بھی ان کے ذوقِ سلیم کی یادگار ہیں۔ مرحوم نے میرے آٹوگراف پر واقف کا یہ شعر لکھا تھا ؎

آزمودم ہمہ غمہائے جہاں را واقف
از غمِ دوریِ احباب بتر چیزے نیست

اودھ کی تاریخی اور روایتی حکایات کے بادشاہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی پچھلے دور کی انھیں شخصیتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا وجود ہم سب میں ایک متبرک شان رکھتا تھا۔ شاہانِ اودھ کے دورِ حکومت کی بیتی ہوئی کہانیاں جس خوش اسلوب انداز میں انھوں نے ہم کو سنائی ہیں ایسی مرقع کشی کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ اردو ادب اور شاعری پر ایک صاحبِ فن استاد کی حیثیت سے انھوں نے کیا کچھ احسانات نہیں کئے۔ حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کے توسل سے رسمی تعارف کے بعد صرف ایک ہی مرتبہ حاضر ہو سکا۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ تاریخ اودھ کا ایک چھوٹا سا واقعہ آج بھی میرے آٹوگراف پر ان کا لکھا ہوا موجود ہے۔

"میں نے تاریخ اودھ میں ایک ذکر راجہ تکیت رائے بہادر کے متعلق دیکھا تھا کہ جب نواب آصف الدولہ بہادر نے

ان کو فنس سواری مرحمت فرمائی اور وہ سوار ہو کر نکلے تو نہایت کم رو اور نحیف الجثہ سے ایک شاعر نے ان کے متعلق کہا۔ ع

چوں ہمزۂ الا ، یک در پالکی نشست

یہ لطیفہ ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے لطف سے خالی نہیں"

لسان قوم حضرت صفی لکھنوی ہندوستان کے ایک مشہور شاعر اور قادر الکلام استاد ہیں۔ موصوف نے میری استدعا پر اپنا یہ شعر تحریر فرما دیا ؎

زہر ہے زہر صفی آبِ حیات
زندگی بڑھنے مصیبت ہو گی!

محترمی سید آل رضا صاحب رضا لکھنوی آجکل کے ان ممتاز شعرا میں ہیں جو شہرت اور پروپیگنڈے سے بہت دور رہ کر اردو ادب اور زبان کے لئے آج بھی بہت کچھ کر رہے ہیں۔ موصوف نے اپنا یہ شعر عنایت فرمایا ہے ؎

رضا کتنی حسیں اور مختصر شرح محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آئے تو جنت ہے

اودھ کی ممتاز خواتین میں محترمہ کنیز فاطمہ حیا کسی تقریب تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کی آتش افروز نظمیں اور بلند پایہ غزلیں ہر شخص کی نظر سے گزری ہونگی۔ آپ کا یہ شعر میرے اوٹوگراف کی زینت ہے ؎

پھول کھلے چلی نسیم دل نہیں اختیار میں
پھر مری داستانِ غم تازہ ہوئی بہار میں

شفیق محترم پروفیسر سید مسعود حسن ادیب لکھنؤ یونیورسٹی ایم اے اردو کے ایک محسن ہیں بلکہ آپ کی نقادی اور علمی قابلیت صوبہ بھر میں ایک مثال رکھتی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"جو دوسروں کی خوشی سے خوش نہیں ہوتا وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا ——"

شیر پنجاب مولانا ظفر علی خاں بی۔ اے (زمیندار لاہور) نے گو آج مجھے بالکل بھلا دیا ہے لیکن ان کی یاد اب بھی میرے دل کو بے چین کر دیتی ہے۔ جب میں اوٹوگراف میں ان کی یہ تحریر پڑھتا ہوں۔

"تو نے زمین والوں کے احکام سن لئے اب آسمان کے فیصلے کا انتظار کر —— !"

محترم شوکت تھانوی ملک کے مشہور مزاح نگار اور ظریف ادیب ہیں۔ درجن بھر سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور فی الحال انڈیا کے سانگ پبلسٹی آفیسر۔ آپ نے بلا کسی معاوضہ کے تحریر فرمایا ہے۔

"کاش میں مہاتما گاندھی ہوتا۔ بر ہنگی یا جیل جانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ نمونۂ تحریر کی اجرت مل جاتی۔ یا کم سے کم منشی شمس الدین مرحوم ہوتا کہ میری تحریر پڑھنے والوں کے لئے نور نگاہ ثابت ہوتی۔ مگر افسوس کہ میں وہ ہوں نہ یہ! بلکہ محض شوکت تھانوی"

برادر معظم سید اخلاق حسین صاحب بی۔ اے آکسن بار ایٹ لا (لکھنؤ) ایک صاحب ذوق اور بلند مذاق رکھنے والے بزرگ ہیں آپ نے مرزا صائب کے اس شعر سے مجھے نوازا ؎

کہ گزشت است ازیں بادیہ صائب امروز
نبض جادہ طپید و سینۂ صحرا گرم است

رسالہ الناظر (مرحوم) لکھنؤ کے مدیر محترم مولانا ظفر الملک علوی کا احترام میرے دل میں بحیثیت ایک ادیب ہونے کے زیادہ ہے۔ کاش وہ لیڈر نہ ہوتے۔ آپ نے غالب کا یہ شعر مرحمت فرمایا ہے ؎

کشتی بے ناخدائم سرگزشتم می مپرس
از شکستِ خویش بر دریا کنار افتادہ ام

برادرم سید مرتضیٰ حسین رضوی ایم اے پروفیسر آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ نہایت بے لوث اور خاموش ادیب ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی وعدہ فرمائیاں بسا اوقات تکلیف دہ طور پر گراں ثابت ہو جاتی ہیں اور وعدہ تو ان کے نزدیک "وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا" بلا تخلص کے شاعر بھی ہیں۔ چنانچہ اپنا ہی ایک شعر لکھا ہے ؎

حسن ادراک نہیں پر تو نادانی ہے
ڈھونڈتا ہے جسے وہ دل میں ترے رہتا ہے

عالیجناب مہاراجکمار محمد امیر حیدر خاں صاحب آف محمود آباد سلیمنٹ نہایت بلند علمی مذاق رکھنے والے اور وسیع النظر نوجوان ہیں۔ انتہا درجہ انتہا معروفیت اور عدیم الفرصتی کے باوجود آپ نے میری درخواست پر میرے اوٹوگراف کی عزت و توقیر میں اضافہ فرمایا ہے۔

Behind is life and its longing
Its grief its suffering & its sorrow,
Beyond is the eternal morning
Of a day without a tomorrow.
(E. Abbot)

پیچھے ہے مرے قافلۂ حسرت یک عمر
آگے مرے وہ شب ہے سحر جس کی نہیں ہے
بیسود ہے اندازۂ مستقبل ہستی
ہونا ہے وہی ہم کو خبر جس کی نہیں ہے

جنوبی ہند کے قادر الکلام شاعر سید سکندر علی وجد حیدر آبادی دور حاضر کے ان خوش فکر نوجوان شعرا میں ہیں جن کا کلام جذب و اثر میں ہندوستان کے ان بہتیرے پیشہ ور شاعروں سے اعلیٰ و افضل ہے جو مشاعروں کی بدولت مشہور ہو چکے ہیں۔ آپ نے اقبال کا ایک شعر تحریر فرمایا ہے ؎

مصاف زندگی میں صورت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

جناب محترم چودھری محمد علی صاحب (تعلقدار ردولی) نہایت کہنہ مشق لکھنے والے ہیں۔ اس دور کے لکھنے والوں میں آپ ہی وہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جن کو ہر طبقہ اور خیال کی ہم آہنگی حاصل ہے گزرے ہوئے دور کے لوگ آپ کی تحریر اپنے لئے کشش آگیں سمجھتے ہیں اور ترقی پسند مصنفین آپ کو امام فن مانتے ہیں۔ از راہ شفقت بزرگانہ آپ نے ذیل کی حدیث نقل فرمائی ہے۔

"المومن لا یکون محتشما و لا مفتنا"

سید جلال رضوی (اگزیکٹیو افیسر میونسپل بورڈ سیتاپور) "ایام جاہلیت" میں لکھتے بھی تھے اور اچھا۔۔۔ مگر اب تو "اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی" یعنی جب سے دنیا کے جھمیلوں میں پڑ گئے بس ۔۔۔ کچھ نہ پوچھئے۔ "وائلڈ" کا نظریہ لکھا ہے۔

"میں زاہدان خشک سے نفرت کرتا ہوں
وہ آئینہ ہیں ایک غلیظ ماضی کے
میں گنہگاروں سے الفت کرتا ہوں
وہ مالک ہیں ایک درخشاں مستقبل کے!"

برادر محترم سید اشفاق حسین صاحب ایجوکیشن افیسر (شملہ) ہندوستان کے ایک بہت بڑے ماہر تعلیم ہیں۔ ممدوح نے میرے اوٹوگراف پر تحریر فرمایا ہے۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم عمل جراحی کا محتاج نہیں ہے اس سے بڑھ کر کیا افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ اپنے خیالات کو الفاظ میں ادا کرنے کے لئے کسی غیر زبان کی مدد لینا پڑے"

حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے چھوٹے بھائی جناب عبد المجید صاحب دریاآبادی (ڈپٹی کلکٹر) میرے محترم کرم فرما ہیں۔ آپ نے میرے اوٹوگراف پر یہ شعر لکھا ؎

دیکھنا بھی تو اسے دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

حبیبی سید اعظم حسین اعظم ایڈیٹر روزنامہ "سرفراز" لکھنؤ نے ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کی اہمیت پر ایک خیال ظاہر کیا ہے۔

"ہندوستانی نیشنلزم کے لئے سب سے اہم سوال "مسلمان" ہے اگر یہ سوال حل ہو گیا تو ہندوستان بہت جلد حکومت خود اختیاری حاصل کر لے گا۔ ورنہ پیچیدگیاں بڑھیں گی سچے نیشنلسٹ کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو تسخیر کرنے کی کوشش کرے اور سچے مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے وطن کے ساتھ غداری نہ کرے"

منظمی مولانا آشہر لکھنوی ایم۔ اے پروفیسر انٹر کالج جھانسی بہت پرانے لکھنے والے اور میرے محترم بزرگ ہیں۔ ادبی مشاغل اب بہت کم ہو گئے ہیں صرف آموں کی فصل میں بندیل کھنڈ سے

آم کھانے کے لئے تشریف لے آتے ہیں — اودھر۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

"غم خوشی کو دبائے یا خوشی غم کو بھلا دے مگر انسان کبھی
جادۂ استقلال نہ چھوڑے — !"

محترمہ حما اخلاق حسین صاحب نے سعدی شیرازی کا ایک شعر تحریر فرمایا ہے ؎

نیاز مندئ یاراں ندارد ت سودے
مگر عمل کہ ترا بار یار خواہد بود

برادرم جناب امین سلولوی اودھ کی مشہور خبر رساں ایجنسی "انڈیپنڈنٹ نیوز سروس" کے ایڈیٹر اور میرے شفیق محترم! اب بھی جب کبھی ٹائپ رائٹرز کی بے ہنگم آوازوں سے گھبرا کر یہ کچھ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تو خوب لکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان سے کیا کیا توقعات رکھتا ہے۔ بعض وقت اس چیز کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن موت کے آہنی پنجے بڑی آسانی سے ان توقعات کو ختم کر کے مشکلات سے انسان کو آزاد کر دیتے ہیں۔ اگر اسی زندگی پر انسان مسرور ہوتا ہے تو اس کو اختیار ہے ورنہ اُسے غور کرنا چاہیئے کہ دنیا کیا ہے؟ اور اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ میری ذاتی رائے صرف یہ ہے ؎

وہ زندگی کہ جس سے کسی کو خوشی نہیں
نام اُس کا زندگی ہے مگر زندگی نہیں

خواجہ اسد اللہ اسد یوپی کے ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار جرنلسٹ کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ آپ کی تحریروں میں کافی زور اور اسپرٹ پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اتنے بے لاگ اور بے جھجک لکھنے والے بہت کم ہیں۔ خصوصاً اردو صحافت میں۔ کاش خواجہ صاحب ایک مخصوص طبقہ کے ترجمان بن کر نہ رہ جاتے۔ آپ نے اپنا جو شعر لکھا ہے وہ یہ ہے۔

میں اس کی ناخوشی کے غم سے اندازہ لگاتا ہوں
کہ وہ مجھ سے جو خوش ہوتا تو کیا ہوتی خوشی میری

آچاریہ نریندر دیو جی ہندوستان کے مشہور سوشلسٹ لیڈر ہیں جن کی عزت و عظمت ہندوستان کے تمام سیاسی حلقوں میں مسلمہ ہے۔ میری طرف سے آپ کے دل میں جن پُر خلوص محبت کا جذبہ موجود ہے اس بنا پر آپ نے میرے اٹوگراف کے لئے بہت کچھ لکھا ہے:

He who wants to command the future must command the youth of the nation. Adam Smith has written a book called the "Wealth of Nations". But the true wealth of a nation consists in its youth.

This wealth has to be carefully protected and augmented. Therefore, it is the duty of every well-wisher of his country to educate & train youngmen for self-govt., and to develop in them initiative, enterprise and constructive ability.

The youth must be taught virtues of fearlessness, courage and self-sacrifice to serve the larger social purpose.

Everything must be subordinated to social welfare. That is the highest ideal.

(Sd) Narendra Deva

جناب محترم خان بہادر نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی ڈکشنر

نہ محض ایک مسلم الثبوت شاعر بلکہ بحیثیت ایک ادیب کے بھی آپ کی ہستی ہر طرح واجب التعظیم ہے۔ آپ نے ایک مخلص بزرگ کی حیثیت سے اپنا یہ شعر تحریر فرما کر میری عزت افزائی فرمائی ؎

کوئی کہتا ہے کہ موت انجام ہونا چاہیئے
زندگی کا زندگی پیغام ہونا چاہیئے

سید عباس رضا صاحب (منصف) اعلیٰ ذوق شعری رکھتے ہیں اپنے استاد مولانا بیخود دہلوی مرحوم کا ایک مشہور شعر تحریر فرمایا ہے ؎

یا تو انداز زمانہ کے بدل جانے دے
یا مجھے اپنی خدائی سے نکل جانے دے

خال المعظم حضرت وصی سیتاپوری مرحوم ایک خوش فکر اور صاحب فن [illegible] شاعر تھے۔ ناموری سے بہت دور، داد تحسین سے مستغنی۔ آپ نے اپنا یہ [illegible] تحریر فرمائی ہے ؎

اُلٹی مری سانس چل رہی ہے — دنیا کی ہوا بدل رہی ہے
محو ناؤ میں سو رہا ہے غافل — جو بحر فنا میں چل رہی ہے

وہ انسان جو شاعر سے سب انسپکٹر پولیس ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آئندہ اس سے کسی قسم کی توقعات رکھنا عبث ہیں۔

نذر بریلوی بی۔ اے میرے انھیں دوستوں میں ہیں جن کی یاد اب بھی اس شعر کو دیکھ کر امنڈ آتی ہے ؎

ہر اک کو شغل دامان و گریباں ہو نہیں سکتا
مرا ایمان زمانے بھر کا ایماں ہو نہیں سکتا

مسٹر محمد محمود بار ایٹ لاء (ایم۔ ایل سی) ایک سخن سنج شخصیت رکھتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے ؎

خزاں جیسے عدو صیاد دشمن باغباں اپنا
خدا رکھے تو رہ جائے چمن میں آشیاں اپنا

عزیزم سید اسعد سیتاپوری ایک خوش فکر نوجوان ہیں جنھوں نے موجودہ حالات پر یہ شعر لکھا ہے ؎

مشرق کی نگاہوں سے دیکھا جو سوئے مغرب
تہذیب کی اک تھوتھی تصویر نظر آئی

اختر ہوشیارپوری

کیا کرتے؟

جب دستِ جنوں ہی اُٹھ نہ سکا تو جشنِ بہاراں کیا کرتے
اندازۂ دامن کیا ہوتا ہم چاکِ گریباں کیا کرتے

مخمورِ نظر مخمور رہی، مجبورِ نظر مجبور رہی
تم زیست کا ساماں کر نہ سکے ہم موت کا ساماں کیا کرتے

معلوم ہے اتنا ہی ہم کو ساحل سے چلی تو تھی کشتی
آسودۂ ساحل آ نہ سکے پھر اندازۂ طوفاں کیا کرتے

تیرا تو الم پھر تیرا الم ہے زیست کا غم بھی سہہ نہ سکے
اک داغ بھی دل پر کھا نہ سکے محفل کو چراغاں کیا کرتے

ہر چند کہ دعویٰ تم کو ہے ہر گام پہ بزم آرائی کا
"اک پھول کا دامن سی نہ سکے تنظیمِ گلستاں کیا کرتے"

جس تارے کو دیکھا نوچ لیا جس پھول کو دیکھا توڑ لیا
ہم اس سے زیادہ وحشتِ دل عالم کو پریشاں کیا کرتے

مجبوریٔ دل بھی کیا شے ہے ہم نظریں تک بھی اٹھا نہ سکے
اب تو ہی بتا ہم ان کے مقابل اپنے غمِ پنہاں کیا کرتے

آنسو تھے کہ امنڈے آتے تھے شمعیں تھیں کہ جلتی جاتی تھیں
دل تھا کہ وہ بیٹھا جاتا تھا اور ہم شبِ ہجراں کیا کرتے

تم سے تو سنواری جا نہ سکی خود اپنی زلفِ برہم بھی
تم میرا فسانہ کیا سنتے، مشکل مری آساں کیا کرتے

یہ فیض ہے عشق کی نظروں کا کچھ حسن کا تو اعجاز نہیں
وہ آئینہ خانے میں ورنہ آئینہ کو حیراں کیا کرتے

عقل اور جنوں میں اے اختر جب تصفیہ کچھ بھی ہو نہ سکا
ہم جنگل جنگل کیا پھرتے ذروں کو بیاباں کیا کرتے؟

ابوالاقبال عیشؔ فیروزپوری

میخانۂ عیش

محبت کا جو دم بھرتا ہے رسوا ہو ہی جاتا ہے — تماشائی ترے آگے تماشا ہو ہی جاتا ہے

ہر اچھی شکل پر نظروں کو دھوکا ہو ہی جاتا ہے — جسے میں دیکھ لیتا ہوں وہ تم سا ہو ہی جاتا ہے

نہیں کچھ منحصر دل پر کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے — تمہارا دوست تو دشمن ہمارا ہو ہی جاتا ہے

کبھی اپنا کبھی اُن کا تقاضا ہو ہی جاتا ہے — سبب ہر روز مَے پینے کا پیدا ہو ہی جاتا ہے

نہیں آساں نہالِ آرزو کا بارور ہونا — جگر کا خون تو صرفِ تمنا ہو ہی جاتا ہے

ہمیشہ میرے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے پیمانہ — حضورِ ساقیِ میخانہ ایسا ہو ہی جاتا ہے

ہو آنسو پونچھنے والا تو آنسو اور بہتے ہیں — کوئی چاہے تو سونے پر سہاگا ہو ہی جاتا ہے

کہاں تک کارفرما ہے دُعائے پیرِ میخانہ — کر دُں توبہ تو سر پر ابر پیدا ہو ہی جاتا ہے

وہ اکثر رو دیئے افسردہ خاطر دیکھ کر مجھ کو — اگر دل ہو تو دل میں درد پیدا ہو ہی جاتا ہے

حرم بھی میکدہ بھی بتکدہ بھی سب برابر ہیں — سبُو کا تذکرہ، ساقی کا چرچا ہو ہی جاتا ہے

شبِ تاریک میں اکثر پکار اُٹھتا ہوں میں تم کو — خدا شاہد ہے مجبوری ہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے

سکونِ رُوح گو میں جلوۂ ساقی سمجھتا ہوں — مگر اس پر بھی رسّا دورِ صہبا ہو ہی جاتا ہے

وفورِ بےخودی میں پائے ساقی چوم لیتا ہوں — خمار آلود آنکھیں ہوں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے

گواہی دے رہا ہے خود دلِ برباد کا عالم — ہمیشہ جو تمہارے مُنہ سے نکلا ہو ہی جاتا ہے

پلا دی جب کسی نے بےتکلف عیشؔ نے پی لی
پرانا بادہ کش ہے اکثر ایسا ہو ہی جاتا ہے

مذاق عیشی فیروزپوری

گردشِ ایام

میں نے توبہ توڑ دی ساقی نے بخشش عام کی
بٹ رہی ہے آج میخانے میں میرے نام کی

جب دُعا مانگی دمِ آخر بخیر انجام کی
آگئی کام آخری ہچکی تمہارے نام کی

دیکھنے میں پھر کوئی دیکھی ہوئی شکل آگئی
یہ نئی گردش ہے کیسی گردشِ ایام کی

میری آوارہ روی منزل پہ لے آئی مجھے
آبرو رکھ لی خدا نے کوششِ ناکام کی

میری صورت دیکھ کر محفل میں تم بھی ہنس دیئے
وقت پر تائید فرما دی خیالِ عام کی

بھر دیا، اور انجمن کی انجمن کے سامنے
بات رکھ لی دیدۂ پُرنم نے خالی جام کی

لے لیا حلقے میں اپنے مجھ کو دورِ جام نے
رہ گئی گردش اُلٹ کر گردشِ ایام کی

جام برکف مطمئن، بے جام برکف مطمئن
دیکھنے کی شے ہے مستی تیرے تشنہ کام کی

جُھک گیا میری نظر کے آگے ہر بالا بلند
طُور پر تصویر اُتاری ہے تمہارے بام کی

فصلِ گُل میں ہر قدم پر جام برکف ہم رہے
فصلِ گُل میں عام پی، بادہ پرستی عام کی

گردشِ شام و سحر خود وجہِ دورِ جام ہے
کارفرما ہے دعا کس مستِ تشنہ کام کی

بے خبر ہیں ساکنانِ سرزمینِ کوئے دوست
ہے رسائی اور کہاں تک؟ چرخِ نیلی فام کی

بوئے مے آنے لگی ہر شعر سے اب اے مذاق
پڑ گئی تجھ پر نظر کس مستِ مے آشام کی

غلام عباس مولوی

گاڑی چلتی رہی

انجن نے جماہی لی۔ گارڈ کی سیٹی بجی۔ ہری جھنڈی لہرائی اور ریل گاڑی جرأت رندانہ سے کام لیکر اپنے مستقر سے چل پڑی۔

گاڑی کا چلنا تھا کہ ڈبہ کی بے بساط لمبائی چوڑائی بزرگوں کی میراث کی طرح کٹنے بٹنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے باون نشستوں کے ڈبہ میں بلا تکلف و شبہ دو سو تین مسافر نشستوں کے اوپر، نیچے دائیں، بائیں، آگے پیچھے کسی نہ کسی طرح جم گئے۔ قناعت واقعی بڑی اچھی چیز ہے۔ اگر یہ ملکوتی صفت ہم ہندوستانیوں میں نہ ہوتی تو کبھی بھول کر بھی ریل گاڑی کے سفر کا نام نہ لیتے اور ظاہر ہے کہ کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ جاتے۔ بہرحال گاڑی نے تال سُر درست کئے اور مسافر بھقا بھق کی تھاپ پر جھومنے لگے۔

ہم ہندوستانی بھی سفر کرتے ہیں اور اپنی صفات عالیہ کی بدولت انتہائی ٹھاٹ سے سفر کرتے ہیں۔ تکلفات غیر ضروری سے بے نیاز۔ اجنبی مسافروں کی بغلوں میں ہاتھ دیئے۔ انجان لوگوں کی پیٹھ سے تکیہ کئے، غیر متعارف دوستوں کی ٹانگ پر ٹانگ رکھے۔ اطمینان سے جھومتے جھامتے چلے جاتے ہیں۔ نہ اپنی فکر، نہ دوسروں کا خیال، نہ منزل کا دھیان نہ راہبر کا احسان، نہ خدا سے شکوہ، نہ بندوں سے گلہ، بس جھوم رہے ہیں اور جھومتے چلے جا رہے ہیں۔

"کہاں جائیے گا آپ؟" ایک بے تمیز یا بے تکلف شریک سفر نے مجھ سے پوچھا ——

"اگر قبرستان نہیں تو ہسپتال ضرور ——!" میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا بوجھ اپنے بغلی مسافر پر لاد کر جواب دیا۔

"اوہ" انھوں نے منہ بنا کر کہا —"تو آپ اندر سبھا کی صدارت کی نیت سے نکلے تھے"

اب مصلحت اسی میں تھی کہ میں خاموش ہو رہوں۔ میں کہتا ہوں کوئی اتنا بھی بے غیرت کیوں ہو جو اجنبی لوگوں سے ان کے ذاتی مشاغل کی بازپرس کرتا پھرے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجیئے کہ میں ڈاکو ہوں۔ ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے کہ اپنے ارادوں کے سلسلے میں کیا کچھ بتایا جا سکتا ہے؟ اور اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ اتفاق سے آپ پولیس افسر واقع ہوئے ہیں پھر بھی جب تک آپ کو کسی سے باضابطہ تعارف حاصل نہ ہو آپ استفسار حال کا کوئی حق نہیں رکھتے —— خیر تو میں نے خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔

گاڑی چلتی رہی۔ سر ٹکراتے رہے۔ شانے چھلتے رہے۔ ٹانگیں قینچی مار کر صورت اختیار کرتی رہیں۔ زمان و مکان کی قدریں گھٹتی بڑھتی رہیں اور میں اگلے سٹیشن کا انتظار کرتا رہا۔

بارے سٹیشن کی آمد آمد ہوئی۔ ہچکولے ناریجا کم ہونے لگے۔ مگر ڈرائیور نے شاید کچھ اور ٹھان لی تھی۔ پلیٹ فارم سے لگتے لگتے ہچکولے زائل ہو رہے تھے اور دل میں سکون کی ایک لہر پیدا ہونا چاہتی تھی کہ یکبارگی ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی اچھل کر سامنے جا پڑا۔

کسی نے وہ شعر ریل گاڑی ہی میں بیٹھ کر کہا تھا شاید جس میں بتایا تھا کہ ایک آفت سے تو مر کر جینا ہوا تھا کہ دوسری آن پڑی۔ ڈبہ کا دروازہ تیزی سے کھلا اور ایک بڑے میاں نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اپنی اٹھارہ سالہ چاندی کی کٹوری سی لڑکی کو اٹھا کر مجھ پر پھینک مارا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ گر پڑا کر اور آگے بڑھ آئی۔ اب بہت لئے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ بظاہر اس میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ پشت پر سے بڑھتی ہوئی یلغار سے بے نیاز ہو کر اپنی جگہ جمی رہتی لمحہ بھر میں اس نے صورت حال کو تاڑ لیا اور شاید خیریت اسی میں دیکھی کہ جلدی سے مجھ میں سما جائے۔ میں لوگوں کی نیتوں کو ذرا تیزی سے بھانپ لیا کرتا ہوں لیکن ابھی میں اس کے ارادہ کی معقولیت یا نامعقولیت کا جائزہ بھی نہیں لینے پایا تھا کہ ایک زناٹے کے ساتھ لڑکی کم و بیش میری گود میں تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دو صندوق سات گٹھریاں، ایک صراحی، ایک چھاتا، ایک چھڑی، ایک بوڑھا

اور دوسری درجن بھر چیزیں اللہ کے دین کی طرح ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔

میں سانس روک کر اپنی نشست پر گٹھری بن گیا۔ میرے بغلی مسافر نے بھی ایسا ہی کیا اور اس طرح ہمارے درمیان جو کم و بیش ساڑھے تین انچ کی جگہ پیدا ہو گئی اس پر وہ چونچال چھوکری اس شان سے بیٹھ گئی جیسے اس نشست پر اس کا کوئی آبائی حق ہو۔

مجھے سخت کوفت ہوئی۔ دراصل ایک بیہودہ بوڑھے کے مقابلے میں مجھے نیچا دیکھنا پڑا۔ نامعقول کہیں کا۔ ایک چھوکری کے سہارے اپنی جگہ حاصل کر لی۔ ایسے ہی بزدلوں کے طفیل ہمارا ملک ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ "عورتیں پہلے" قطعی بدیسی مقولہ ہے۔ ہمارے دیس میں اس پر عمل کرنا حماقت ہی نہیں اچھی خاصی بدتمیزی ہے۔ آخر حوّا بھی تو آدم کے پیچھے ہی آئی تھیں۔ پھر یہ آج کل کی لڑکیاں کیا آسمان سے ٹپک پڑی ہیں۔

مگر یہ بنیا ان باتوں کو کیا سمجھے۔ اسے تو صرف روپے جوڑنے اور سود کا حساب لگانے کی فکر تھی۔ شادی بھی اس نے تجارتی اصولوں پر کی ہو گی۔ بس ذرا ہمت کی اور زندگی کا سرمایہ لگا کر بیاہ کا بیوپار کر ڈالا۔ بیوی معاوضے میں ملی اور لڑکی تو محض سود کی مد میں حاصل ہو گئی۔ بس چھٹی ـــــ اب لگاتے رہو زندگی بھر جمع خرچ کا حساب ورنہ یہ بدذوق بنیا کہاں ـــــ اور زندگی کے لطیف احساسات کہاں ـــــ؟

تو خیر میں کہہ رہا تھا کہ بنیا بھی ڈبہ میں موجود تھا۔ اور اس کی چھوکری بھی۔ بنیئے نے نشستوں کے درمیان صندوق پر صندوق رکھ کر بیٹھک بنائی اور گٹھریوں کے گاؤ تکیے لگا کر سفر کے اخراجات کا حساب جوڑنے لگا۔

بعض لوگ پیدا ہی حساب جوڑنے کے لئے ہوتے ہیں۔ دن رات، گھر میں، سفر میں، ہر وقت اور ہر جگہ بس حساب جوڑے جاتے ہیں۔ انہیں نہ اپنی فکر ہوتی ہے نہ اپنے گرد و پیش کی۔ میں نے سوچا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ لڑکی بھی اپنے باپ کی طرح حساب داں ہوتی اور اسی لئے ساتھ صندوقوں کے مچان پر جا بیٹھتی۔ چنانچہ میں نے اس کی حساب دانی کا امتحان لینے کی نیت سے اس سے پوچھا۔

"دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟"

میرے سوال پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے



چاندی کی کٹوری میں جواہرات بھر کے کسی نے مرمر کے فرش پر لڑھکا دیا ہو
"ہاں بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" میں نے انتہائی سنجیدگی سے پھر پوچھا۔

"چار" اس نے جلدی سے جواب دیا اور پھر ہنسنے لگی۔

"چار" میں نے اس کا منہ چڑایا۔ "نہیں —— پہلے تین ہوتے ہیں پھر چار ——"

"پھر پانچ، پھر چھ، پھر سات ——" اس نے آنکھیں مٹکا کر ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔

"عجیب چھوکری ہے" میں سوچنے لگا۔ "حساب کتاب تو کچھ جانتی ہی نہیں۔"

بوڑھے نیٹے نے لڑکی کی شوخی کو شاید سونگھ لیا اور عتاب بھری نگاہوں سے ایک بار اسے گھور کر دیکھا پھر حساب جوڑنے میں مصروف ہو گیا

"تمھارے پتاجی ——" میں لڑکی سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ اُس نے تڑپ کر انگلی کے اشارے سے میری بات کاٹ دی۔

"پتا نہیں تو کیا پتی؟" میرے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔

"یا خدا —— حساب میں اتنی بڑی غلطی کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اُنیس بیس کا فرق تو خیر ایک بات بھی ہے۔ مگر یہ تو "الف" اور "ی" کا "تفاوت ہے۔ حساب لگاتے لگاتے ان لوگوں کو ساڑھے انیس صدیاں گزر گئیں —— مگر ابھی تک غلط حساب لگائے جاتے ہیں۔

میں نے ندامت بھری نگاہوں سے لڑکی کی جانب دیکھا مگر وہ گردن نیچی کئے ہوئے تھی۔

ریل گاڑی اپنی پوری رفتار سے چلتی رہی۔ سر ٹکراتے رہے شانے چھلتے رہے۔ ٹانگیں تینچی مار کر صورت اختیار کرتی رہیں، زمان و مکان کی قدریں آپس میں گتھم گتھا ہوتی رہیں اور قناعت پسند مسافر بدمستوں کی طرح جھومتے رہے۔

شاہ عبدالباری عشق (خلف و تلمیذ حضرت آہ مرحوم)

کانٹے اور کلیاں

ازل میں پڑگئی دل پر نظر اک چشمِ فتاں کی
وہی بس ابتدا تھی اس جنونِ فتنہ ساماں کی

کہا اس شوخ نے ہنس کر الٰہی خیر داماں کی
بڑھا دی اور کچھ قیمت مرے چاکِ گریباں کی

مری دیوانگی کے واسطے کیا قید زنداں کی
مرے پاؤں میں بیڑی ہے محبت زلفِ پیچاں کی

کسے یہ ہوش رکھے قید داماں و گریباں کی
اُڑا کر دھجیاں دونوں کی حالت ہم نے یکساں کی

تصور ہے مرا آزادجی یوں ہی بہلتا ہے
گلستاں چھٹ گیا تو یاد رہتی ہے گلستاں کی

مری اور اُن کی صورت آئینے نے ایک کر دی ہے
بنے وہ آج حیرانی سے تصویر اپنے حیراں کی

بہار آئی چمن میں اے جنوں کچھ تیز دستی کر
نکلتیں ہی نہیں کانٹوں سے کلیاں میرے داماں کی

بہت ہیں چاہنے والے بجا ارشاد ہے لیکن
کسی نے دل دیا بھی ہے کسی نے جان قرباں کی؟

جو شب کو شمع جلتی ہے تو دن بھر ٹھنڈی رہتی ہے
یہاں تو رات دن ہے ایک حالت سوزِ پنہاں کی

جنابِ شیخ یہ بُت بھی خدا ہی کی تو صنعت ہیں
پھر ان کو چاہنا کیسا ہوا؟ کہیئے گا ایماں کی

وہ میرے حال پہ روتی رہی میں حال پہ اُس کے
رُلایا اور ہمدردی نے شب بھر شمعِ سوزاں کی

شرف حاصل ہوا ہے اس کو مجنوں کی محبت کا
پتہ دیتی ہے اب تک یہ ہمیں وحشت بیاباں کی

جگر میں داغ، دل میں درد، سودا سر میں، دم لب پر
ضرورت اور ہے اے عشق اب کس ساز و ساماں کی

شفیق بانو شفق

مجلسی افسانہ

"بہت اچھّا"

"دیکھنا کالج میں کھانا ٹھیک وقت پر بھجوا دینا"
"بہت اچھا"
"اور ہاں شام کے کھانے پر میرے دو دوست ہونگے دو چار قسم کے کھانے بھی اپنے ہاتھ سے پکا لینا"
"بہت اچھا" ———

بھلا سکینہ جیسی لڑکی جس نے باپ کی دہلیز پر چودہ برس یوں گزارے کہ اُسے ریل، تار جیسی عام چیزوں سے بھی صحیح واقفیت نہ تھی کیونکہ لفظ "بہت اچھا" کی تابیداری کرتی سترہ برس اسی ماحول میں گزر گئے ——— زندگی کے انتہائی حسین لمحات!!

سکینہ کے شوہر خیر سے کالج کے پروفیسر تھے ——— کچھ شاعری کا بھی خبط رکھتے تھے لیکن دماغ جناب کا یہ تھا "عورتیں محکوم ہیں ——— عورتیں کمزور ہیں ——— عورتیں مردوں سے کمتر ہیں ——— عورتیں محتاج ہیں"

پروفیسری تو گویا شوقیہ تھی۔ ورنہ گھر کی جائیداد بہت کافی تھی ———

سکینہ کا بہترین مشغلہ فرصت کا یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اُس مکان میں ضرور جھانکا کرتی جو کرایہ پر برابر ہی میں تھا گھر کیا تھا چڑیا خانہ کہنا چاہئے۔ کبھی اس میں تجارت پیشہ خاندان آ کر رونق بخشتا۔ کبھی اخباری دنیا کے "مدیر" یا "ایڈیٹر" رونق افروز ہوتے۔ کبھی اس میں کوئی خانہ بدوش آ کر بستا!!

سکینہ کے شوہر نے احتیاطاً کھڑکی میں کیلیں جڑ دادی تھیں کہ کہیں بے پردگی نہ ہو۔ پھر نہایت موٹے کاغذ سے کھڑکی چھپا دی تھی۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔

اتفاق سے اس مکان میں ایک افغانی خاندان آ کر رہا ——— چار نوعمر لڑکے۔ دو لڑکیاں۔ ماں باپ۔ سب بچوں میں گل رخ بے انتہا شریر تھی۔ گو سب سے بڑی تھی لیکن مزاج میں انتہائی بچپن جب دیکھو نئی اسکیم۔ دو تین ہی روز میں سارے محلہ کا چکر یا اندازہ لگا لیا کہ کس طرح کے لوگ ہیں۔ محلہ کی ایک بیوی نے بتایا کہ تمہارے صحن کی طرف جو دیوار ہے اُس کے بائیں ہاتھ جو کھڑکی ہے وہ مالک مکان کی طرف کی کھڑکی ہے ——— اب کیا تھا سب کے سب سراغ رساں بن گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ پڑوس کی بیوی سے کوئی آج تک اس مکان میں رہنے والا کنبہ میل جول نہیں رکھ سکا۔ مالک مکان کا قطعی حکم ہے۔ گل رخ ہر معمہ سے زیادہ دلچسپی لیا کرتی تھی۔ اُس نے چھوٹے بھائی کو چاکلیٹ کا لالچ دیا۔ ایک بکچر دکھانے کا وعدہ کیا تب کہیں وہ راضی ہوا اور ہمت کر کے دوپہر کے وقت مکان میں دروازہ تلاش کرتے جا گھسا۔

"معاف کیجئے میری بجیا نے مجھے بھیجا ہے۔ کہا ہے ہمارا دل بہت گھبراتا ہے۔ آپ کیسی پڑوسن ہیں کہ آٹھ دن ہو گئے نہ صورت دکھائی نہ تعارف کیا؟"

بے چاری سکینہ گھبرا سی گئی۔ پھر بھولے بھالے بچّے کو جو مشکل گیارہ برس کا ہوگا۔ دیکھ کر مسکرا دی ——— زندگی میں پہلی مرتبہ وہ لفظ "تعارف" کے معنی سمجھی ——— "اپنی بجیا سے کہنا کھڑکی کا راستہ بند ہے اور پروفیسر صاحب ویسے آنے جانے کو پسند نہیں کرتے۔" غالب یہ کہ ملنے ملانے کو بہت بُری بات کہتے ہیں بچہ کچھ ناراضی کے انداز میں چلا گیا۔ بجیا نے معقول جواب نہ پا کر دُھتکار دیا "جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے۔ تم نے نہ جانے کیا بکا ہوگا؟ گل رخ سوچ میں پڑ گئی ——— اُس کے دماغ میں "منصوبے" ناچ اُٹھے ——— گل رخ اپنی ملنے والیوں میں افسانہ نگار سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت وہ بیچ بیچ میں انداز سے دور درختوں کی ہلتی پتیوں کو دیکھنے لگی۔ اُس کا دل چاہنے لگا کہ کھڑکی کا راز کسی طرح جلد سمجھ لوں۔ اور ایک بہترین افسانہ لکھوں جسے پڑھ کر ساری دنیا جھوم اُٹھے۔

"رکیئے جاؤ کوشش مرنے دو مقولہ" اس اصول کو سامنے رکھکر اُس نے ایک پرچہ لکھا۔

محترمہ!

معاف کیجئے۔ اگرچہ خلافِ تہذیب ہے "مان نہ مان میں تیرا مہمان" پھر بھی دل چاہتا ہے کہ آپ سے نیاز حاصل کروں یہ ہمارا وطن نہیں۔ پردیسی ہیں۔ جی گھبراتا ہے۔ کیا آپ ملنے کی کوشش کریں گی۔

گلِ سرخ

چھوٹے بھائی سے پھر پیار کی باتیں کیں۔ اُسے خط لیجانے پر آمادہ کیا۔ وہ جواب لایا "کیا کروں دل تو میرا بھی چاہتا ہے لیکن میرے شوہر کی اجازت نہیں"

گلِ رُخ نے تھوڑی دیر اپنا حسین ہاتھ گال پر رکھ کر کچھ سوچا پھر فیصلہ کن انداز میں سر ہلایا۔ کپڑے بدل چند منٹوں میں گلِ رُخ پڑوسن کے ہاں جا پہنچی۔ گویا وہ بغیر پڑوسن کے ملے زندگی بے معنی سمجھ رہی تھی۔

سکینہ دیکھ کر خوش ہوئی۔ لیکن چہرے پر خوف کے اثرات نمایاں تھے۔ گلِ رُخ کچھ اس انداز سے ملی گویا پہلی ہی ملاقات میں تمام مراحل طے ہو گئے۔ یہ ایک عجیب ساسحر ہے کہ بعض انسانوں سے پہلی ملاقات میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہمیشہ سے دوستی تھی۔

ایک دن گلِ رُخ نے باتوں باتوں میں کہا کہ آج سالانہ کانفرنس ہے کیا آپ بھی چل سکینگی؟ زندگی میں سکینہ نے یہ نیا لفظ سنا۔ گلِ رُخ نے مفہوم بتایا۔

پھر ایک روز گلِ رُخ بولی "کیوں بہن سکینہ کبھی آپ نے سینما بھی دیکھا ہے؟"

"نہیں —— ہاں سُنا ہے کہ تصویریں بولتی ہیں"

گلِ رُخ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی "چلئے میں دکھا لاؤں؟"

"اے ہے بہن۔ ہمارے شوہر تو کہتے ہیں یہ دیکھنا گناہ ہے"

"اچھا! تو پھر خود بھی کبھی نہ دیکھتے ہونگے"

"وہ تو چوتھے پانچویں روز جاتے ہیں"

"تو پھر یہ گناہ صرف تمہارے لئے ہے اور اپنے لئے ثواب؟"

سکینہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں اور بھی بہت سے کارہائے نمایاں کرتے ہیں"

"وہ کیا؟ کیسے کیسے؟"

"شام کو کہہ کر جاتے ہیں مشاعرہ میں۔ لیکن پہنچتے ہیں حُسن فروشی کے بازار میں —— حکم یہ ہوتا ہے کہ کسی سے کہنا بھی نہیں صبح سے شام تک بس مظالم ہی مظالم ہیں اور میں —— فریاد کا کوسوں تک پتہ نہیں"

گلِ رُخ بہت دیر تک ہمدردی سے حالات سنتی رہی اور سانپ کی طرح سر دھنتی رہی۔ پروفیسر صاحب موسم گرما کی چھٹیوں میں ذرا سیاحت کرنے گئے ہوئے تھے۔ گلِ رُخ نے شام کا پروگرام بنایا۔ اپنے بہن بھائیوں کو اور سکینہ اور اُس کے تینوں چھوٹے بچوں کو جو باپ کے ڈر سے سہمے ہوئے لڑکیوں کی طرح گھر میں رہنے کے عادی تھے۔ اپنے ساتھ لیا۔ "بندھن" چل رہا تھا وہ دیکھا —— وہاں سے نکل کر نمائش ہو رہی تھی وہ دیکھی —— راستہ میں کتابوں کی دکانیں پڑیں گلِ رُخ کے چھوٹے بھائی نے چلانا شروع کیا "اللہ بجیا گل میری تاریخ کی کتاب کھو گئی —— پنسل ایک لڑکے نے مانگ لی۔ اور کاپی کا نہ جانے ورق کس نے پھاڑ لیا —— یہ تینوں چیزیں ابھی ابھی لے کر دیجئے۔ گلِ رُخ نے جھنجلاتے ہوئے روپے دئے۔ توبہ ہے یہ جرمانہ مجھ پر اچھا رہا۔ تمہاری تو روز کی یہی مصیبت ہے"

آج زندگی آدھی گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ سکینہ کو لفظ نمائش سنیما، دکان، کا مفہوم دماغ نے سمجھایا۔ "بندھن" جیتے جاگتے انسانوں سے بھرا آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اُس میں ایسی سچ مچ کی زندہ عورتیں اُس نے دیکھی تھیں کہ حیران تھی۔ مرد ایسے دیکھے تھے کہ گویا عورتوں کی پرستش کر رہے ہوں۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے آنکھیں استعمال کی تھیں۔ ورنہ باپ کی دہلیز سے ڈولے میں بیٹھ کر ہزاروں پردوں میں نہاں شوہر کے ہاں اتاری گئی تھی۔ اور شوہر نامدار کے ہاں سے رات کی تاریکی میں کبھی نہ کبھی قبر کے دروازہ پر جا پہنچتی۔ لیکن گلِ رُخ کے آزاد خیال نے اُسے سب کچھ منٹوں میں دکھا دیا۔ واپسی پر گھر کے ہر نوکر کو رازداری پوری تلقین کی گئی اور منہ بند کرنے کے لئے دو دو روپے گویا رشوتاً دیئے گئے —— سکینہ رات بھر سو نہ سکی۔ آج اُسے اپنے بچپن کا

اور پرچھائیاں بہت عجیب دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس کے دماغ میں کوئی خیال رُکتا ہی نہ تھا۔ وہ بیٹھی کمرے کی دیوار تک رہی تھی۔ اُس کا دل زندگی کی کتاب کا ورق اُلٹ رہا تھا۔ افسوس مجھے کیسے کیسے دھوکے دیئے۔ شادی کے بعد ہی مجھے تنہا کمرے میں چھوڑ چلے جاتے۔ پچھلے پہر چوروں کی طرح بستر میں آ جاتے۔ رات رات بھر کی عیاشیاں میرے دیور بھی سناتی ماں بہنوں کو سناتے ہیں۔ میں کمبخت بچپن ہی سے دلیر نہیں پھر اُن کی صورت بھی وحشت زدہ ہے۔ اُس سے کچھ پوچھتے نہیں ڈر سا لگتا رہا۔ اُف منہ سے بدبو نہ جانے کیسے آتی ہے؟ کتنی دفعہ تو مجھے اُلٹی ہوگئی۔ سنتی ہوں شراب کی بو ہوتی ہے۔ . . . . . بچے کیسے ڈرتے ہیں —— نہ پڑھنا نہ لکھنا۔ یونہی برائے نام ماسٹر سے جو پڑھ لیا —— بھائی صاحب نے کہہ سن کر تو اسکول میں اگلے سال نام بھی لکھوا دیا ورنہ انہیں اس کی بھی پروا نہ تھی۔ ماں باپ مر گئے ورنہ کچھ تو ہاتھ پاؤں مارتی۔ بھائی بہن تو ہیں لیکن وہ سب خود ہی اُن کی بدماغی سے ڈرتے ہیں۔ سب نے مجھے جیتے جی صبر کر لیا۔ نہ حکم آنے کا نہ بلانے کا۔ الٰہی توبہ! مجھ سے مہترانی ہی اچھی —— اُس دن کہہ رہی تھی دلہن بیگم تقدیر میں ہوگا تو پھر روشن کر لونگی ورنہ میکے میں بسنے جا رہی ہوں۔ موا جوتی خور دارو پی پی کر جانور بن گیا۔ برابر سے ٹھکانے سنبھالا کرتی ہوں۔ پھر بھی مارنے دوڑتا ہے —— میں بھی تو منہ رکھتی ہوں۔"

لیکن میں تو اونچے خاندان کی ہوں۔ اگر ذرا بولی تو ناک کٹ جائے گی۔ منہ دکھانے کی جا نہ رہے گی۔ اور کچھ سچی بات یہ ہے کہ میرا دل تو اُن کی آواز ہی سے دھک دھک ہونے لگتا ہے . . . . یا اللہ خیر —— دشمنوں کے کان بہرے۔ اگر گل رخ کے ساتھ جانے کا کسی نے حال کہہ دیا تو کیا ہوگا —— ؟ جیتا نہ چھوڑینگے بلا سے زہر ہاتھ آجائے تو خدا کی قسم پی کر یہ روگ ختم کروں اب دل میں طاقت نہیں رہی۔ لو تین بج گئے کمبخت نیند جانے کہاں گئی؟

پروفیسر صاحب سے کسی نوکر نے ساری رپورٹ کر دی۔ اب کیا تھا ایکدم سے گویا بھونچال آگیا —— چیختے چیختے گھر سر پر اُٹھا لیا۔ ساتھ ساتھ گل رخ کو بھی خرافات بکنے لگے۔ بیوی کو تو چھوٹتے ہی آوارہ کا خطاب دے دیا۔ سکینہ میں نہ جانے کہاں سے تیزی آگئی "بس بس بہت محلہ والوں کو پروفیسری کا رعب دکھا چکے۔ اب خاموش ہو جایئے۔ جیتے جی اب گل رخ کو نہ چھوڑونگی۔"

"میں تمہیں گھر سے نکال باہر کرونگا۔"

"مجھے پروا نہیں۔ اس امیری سے فقیری بہتر۔"

فرعون کی زندگی میں یہ نیا تجربہ تھا کہ سکینہ جواب دے۔ بہت اچھا کہنے والی آج "بہت اچھا" کا سبق شاید بھول چکی تھی۔ پروفیسر صاحب غصہ میں دیوانے اس ارادہ سے بڑھے کہ سکینہ کا گلا گھونٹ دیں۔ بدقسمتی یہ یاد نہ رہا کہ یہ ہنگامہ دوسری منزل پر ہے۔ پاؤں جو بے خیالی میں بہکا تو قلابازی کھا گئے۔ بھاری بھرکم آدمی۔ کچھ غصہ اور کچھ بہت اونچائی سے گرے۔ بیہوش ہو گئے۔ تمام محلے والے جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر آگئے سب کی رائے ایک رہی کہ دماغ پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ حالت صحیح ہونے پر دماغ خطرناک صورت اختیار کرلے۔ دو دن قطعی غفلت رہی پھر کبھی کبھی ایک غصہ بھری چیخ نکلتی تھی تیسرے دن ہوش آیا لیکن دماغی کیفیت بالکل ردی۔ دس پندرہ دن کی لگاتار کوششوں کے بعد ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ دماغ لاعلاج ہو چکا۔

بیچاری سکینہ کی اب اور بھی مصیبت آگئی تھی۔ رات رات بھر پروفیسر صاحب چیختے "گل رخ کو مار ڈالونگا —— جان سے —— وہ تمہیں بہکا دیگی —— تم کہاں جا رہی ہو؟ کہاں گئی تھیں تمہیں زندہ نہ چھوڑونگا . . . ارے کہاں؟"

سکینہ بے ساختہ گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیتی "بہت اچھا اب ایسا نہ ہوگا۔" کبھی کبھی گل رخ مذاق میں کہتی "ارے سن سکینہ تیرے اس دیوانے بڈھے سے تو عاجز آگئی۔ لا اسے آگرہ پہنچا آؤں۔"

سکینہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر گل رخ کو گھور دیتی —— نہیں پھر ایسا مت کہنا۔ پگلی میرے رونگٹے رونگٹے میں صرف پروفیسر ہی چھائے ہوئے ہیں۔ ہاں اُن کی بدماغی سے یہ جذبہ دل ہی دل میں دفن ہوگیا۔ کبھی اُبھرنے ہی نہ پایا —— میری آنکھیں محبت کے موتی لٹایا کرتیں لیکن بُرا ہو کمبخت اس خوف کا کہ جس نے کہیں کا نہ رکھا۔ سوتے سوتے بھی اُن کی کرخت آواز دل ہلا دیتی ہے ——

گل رخ کہتی "لا تیرا دل ہندوستان کی نمائش میں بھیجدوں کچھ نہ کچھ انعام ضرور مل جائے گا —— دشمنوں کے کان بہرے۔

کبھی میری عقاد ی پروفیسر سے ہو جاتی تو میں اپنے کانوں میں کم از کم ضرور کوئی دوا ڈلوا لیتی جو ایسی خوفناک آواز سنائی ہی نہ دیتی ——— اچھی سکینہ تم تو واقعی فرشتہ ہو۔ بھولے سے آسمان سے ادھر چلی آئی ہو ——— اے ہے سکینہ لو وہ کمرے کی طرف سے پروفیسر صاحب آ رہے ہیں۔ لِلّٰہ مجھے جلدی بتاؤ کہاں چھپوں؟

سکینہ نے شرارت سے کہا بیٹھی رہو۔ وعا سلام کر لینا بہنوئی سے کیسا پردہ؟ بیوی سے پیاری سالیاں"۔ یہ مثل نہیں سنی؟

گل رُخ یہ کہتے ہوئے بھاگی "پھٹکار تمہاری صورت پہ ——— لیلا تو دم نکلا ——— پردہ کے پیچھے بھاگی۔ وہاں سے کمروں سے ملی ہوئی بغلی کوٹھری میں چھپ گئی۔ جہاں بہت سے فالتو بستر۔ بکس رکھے ہوئے تھے۔ مصیبت یہ آئی کہ گل رُخ کو زکام تھا ہر منٹ پر کھانسی آ رہی تھی لیکن وہ سانس تک روکے ہوئے تھی ——— ڈیڑھ گھنٹہ تک پروفیسر صاحب اُلٹی سیدھی باتیں کر کے شور مچاتے رہے۔ سکینہ ہر حکم پر بہت اچھا کہتی رہی آخر کار خدا خدا کر کے باہر سے کسی دوست نے آواز دی تو تشریف لے گئے۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ دوستوں سے دیوانہ پن کم تھا۔ سکینہ سے زیادہ: اصل میں تو جب اچھے تھے جب بھی سکینہ کے لئے پاگل سے بدتر۔ اب تو کہنا ہی کیا؟

دو سال اسی مصیبت میں گزر گئے۔ بچے سہم سہم کر کانٹا ہو گئے ——— بیوی کو جو دیکھتا کہتا کہ بس ایک سال اور چل سکو گی۔

آخر کار قدرت کو سین بدلنا ہی پڑا۔ پروفیسر صاحب پر فالج کا حملہ ہوا اور بیچارے چوتھے روز ختم ———

بچے ابا جان کہہ کر جان کھو رہے تھے۔ سکینہ اپنے سہاگ کا دونوں ہاتھوں سے ماتم کر رہی تھی۔ گل رُخ ساتھ ساتھ ہچکیاں لے کر آنسو بہا رہی تھی ——— اُسے اپنی سہیلی کے غم کا شدید احساس تھا۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ پروفیسر صاحب جیسے کچھ بھی تھے سکینہ کے شوہر تھے۔ دل پر ہر وقت گزشتہ زندگی کے سناٹے پڑے۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ گل رُخ آہستہ قدم اُٹھاتی سکینہ کے کمرے میں آئی۔ سکینہ کے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا بہت سخت ذہنی اُلجھن میں ہے۔ دونوں ہاتھ سامنے گویا تو بہ کر رہے تھے۔ سوتے میں اُس کی چیخیں ہی نکل رہی تھیں ——— خدا کے لئے معاف کرو ——— گل رُخ کو چیخ کر دوں گی . . . . نہیں نہیں کون کہتا . . . . نوکر جھوٹ بکتا ہے . . . . سینما . . . . کہاں نہیں میں پردہ کرتی ہوں کبھی نہیں دیکھا سینما . . . . جو کچھ آپ کہتے ہیں . . . . نہیں دنیا میں بس آپ ہی ہیں۔ بہت بہت اچھا . . . . میرے سر تاج تم ہی میرے ہو . . . . جیسے تم کہو۔ گل رُخ بہت متاثر ہوئی۔ ایک گہری آہ بھری "سکینہ سکینہ! ارے کیا کہہ رہی ہو؟ فرمانبرداری کی حدیں ختم ہو گئیں ——— بس کرو میرا کلیجہ پھٹا ——— اے ہے تمہارے دل پر کیا اب بھی وحشت کا دورہ ہے؟

سکینہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ——— گل رُخ کیا کروں یہی حال رات بھر ہوتا رہتا ہے۔ میں خواب بھی اپنے منہ نہیں لے سکتی ——— ماحول بدل گیا لیکن خیال وہی ہے۔

گل رُخ نے جھنجلا کر کہا۔ لا حول ولا قوۃ ابھی دنیا میں ہی نے دوست بنائی۔ میرا دل ہی تمہارے ساتھ روتے روتے کمزور ہو گیا ——— ہنسی کو اب مجھ سے دشمنی ہو چکی۔ لو بس حواس میں ہو۔ یہ شربت پیو ——— آئینہ میں صورت تو دیکھو گویا چھ وقت کا فاقہ ہو ——— آج ہی یہ کوٹھی کرایہ پر دو اور ملاحظہ فرما کر آب و ہوا تبدیل کرنے کسی اچھے مقام پر جاؤ ——— بلا سے حج ہی کرنے چلی جاؤ جو وحشت تو کم ہو ——— خدا کی پھٹکار ——— پروفیسر صاحب مر کر بھی میرے دشمن ہی رہے۔ یہ تم کیا میرا نام لے رہی تھیں؟

سکینہ مسکرا پڑی "چل پاگل تجھے تو ہر بات میں مذاق ہی سوجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا دل ایک تندرست انسان کا سا نہیں رہا۔ ہزار بہلاتی ہوں۔ سوتے جاگتے وہی خیال ——— کیا کروں؟

گل رُخ جل ہی تو گئی ——— اللہ کا شکر کہ تمہیں محبت کے جھولوں میں پروفیسر صاحب نے کبھی نہ جھلایا۔ ورنہ اور بھی مصیبت آتی ——— اُن کی خیر کی سی گرج پر تو یاد کا یہ حال ہے ———

سکینہ نے ایک جاں نثار سید کیا ——— اور دور جذبات بھری نگاہوں سے درختوں کی سرسبز پتیاں دیکھنے لگی ——— *

* کھڑکی سے ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا جس نے سکینہ کے بال منتشر کر دیئے!! شاید اس وقت بھی سکینہ کو پروفیسر ہی یاد آ رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں کسی بچے نے ریڈیو کا کان مروڑا تھا ——— فلم "بجلی" کا کوئی گانا ہو رہا تھا۔ او بھولنے والے تجھے میں کیسے بھلا دوں؟ او بھولنے والے . . .

عاصم جے پوری

محبّت کی کہانی

سُنتے ہیں وہ جب مجھ سے محبت کی کہانی — دیتے ہیں اُمیدوں کو زلیخا کی جوانی

کر دیتے ہیں ہر رنگ کو ہمرنگِ تمنّا — بھر دیتے ہیں ہر نقش میں خونِ غمِ فانی

جاتی ہے جہاں تک نگہِ ناز وہاں تک — ہو جاتی ہے ہر چیز محبت کی نشانی

آتی ہے ہوا میں نفسِ ناز کی خوشبو — دیتا ہے مزہ لعلِ مئے آشام کا پانی

ملتی ہیں نگاہیں تو اتر جاتے ہیں دل میں — ممنونِ تلفظ نہیں ہوتے جو معانی

وہ ہیں متبسّم تو ہے مستی کا یہ عالم — ہر شے مترنم ہے کہ ما اعظم شانی

دزدیدہ نظر ہے کہ تقاضا اَرِنی کا — اندازِ تبسّم ہے کہ تفسیر ترانی

وہ غمزۂ بیباک میں رہ رہ کے جھجک سی — وہ ہوش میں آتی ہوئی مخمور جوانی

وہ لوحِ جبیں پر اثرِ نازشِ پنہاں — ارژنگ میں بیتاب وہ اندیشۂ مانی

وہ کاکلِ شبرنگ میں تابانیٔ رُخسار — حسرت میں بَر آئی ہوئی حسرت کی نشانی

وہ چشمِ حیا کوش کے پُر کیف ترانے — وہ موجِ نفس کی روشِ عطر فشانی

وہ ضبطِ تبسّم کا اثر اُن کے لبوں پر — وہ موجِ گلِ تر کی رگِ گل میں روانی

وہ محوِ خرام اک شجرِ نور کا عالم — وہ کفر کی سر تا بقدم ریشہ دوانی

مستانہ خرامی کا یہ عالم ہے کہ موجیں — لیتی ہے مئے میکدہ آشوب جوانی

جس وقت پلٹتی ہے نظر مل کے نظر سے — ہوتی ہیں وہ باتیں نہیں ہوتیں جو زبانی

دنیا کی زباں پر ہے وہ افسانۂ اُلفت — دل جس کو سمجھتا ہے ابھی رازِ نہانی

سبزہ ہو لبِ آب ہو وہ ہوں مرے آگے — دیکھے کوئی اس وقت طبیعت کی روانی

احساسِ محبت کو تمنا سے نہ جانچو! — وہ دولتِ جاوید ہے یہ عشرتِ فانی

وہ ہیں نظر افروز تو عاصم کی نظر میں
ہر چیز دلاویز ہے ہر بات سہانی

دُعا ڈبائیوی

حیلے حوالے

حسینوں کی ساری ادائیں نرالی حسین حسن و صورت میں خود بھی نرالے
مگر سب کو اللہ محفوظ رکھے کسی کا کبھی اُن سے پالا نہ ڈالے

ہمیشہ نئی حجتیں پیش کر دیں ہمیشہ نئے جھگڑے مجھ سے نکالے
نہ آنا تھا ان کو نہ آئے یہاں تک نہ آنے کے ہیں لاکھ حیلے حوالے

مرے یا جیئے کوئی اُن کی بلا سے وہ چلتے ہوئے شکل اپنی دکھا کر
اب آفت میں دم ہے تو عاشق کا دم ہے جگر کو سنبھالے کہ دل کو سنبھالے

کہاں تک حفاظت حفاظت کی زحمت مجھے بھی ہوئی رنج و غم سے فراغت
یہ اچھا کیا آج دل لے چلے تم تمھاری امانت تمھارے حوالے

جفاؤں سے باز اب بھی آجاؤ ورنہ کسی بات کا مجھ سے شکوہ نہ کرنا
جہاں تک مرا بس چلا میں نے روکا نہیں رکتے اب میرے روکے سے نالے

یہ جیسے ہیں قاتل ہمیں کو خبر ہے یہ جتنے ہیں ظالم ہمیں جانتے ہیں
کوئی خوبرویوں کو دیکھے تو سمجھے بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے

وہ دل لیکے مجھ پر ستم ڈھا رہے ہیں پھنسی جان میری عجب کشمکش میں
کروں کیونکر اس ناخوشی کا مداوا دلِ زار بھی اب نہیں جو منالے

دلِ زار! ظالم پر آنا بُرا ہے محبت غضب ہے ستم ہے بلا ہے
اب اس کے سوا اور تجھ سے کہوں کیا نہیں مانتا تو خدا کے حوالے

تمھاری طرح بادہ نوشی کو میں بھی بُرا حضرتِ محتسب جانتا ہوں
مگر ہرج کیا اس سے تھوڑی سی چکھ لی اگر مدتوں میں اندھیرے اُجالے

وہ کہتے ہیں ہم کب ہیں وعدے کے سچے مگر تم کو بھی ہم نے جھوٹا ہی پایا
تمھیں جان دو بھر تھی اب تک ہو زندہ نہ تم بات والے نہ ہم بات والے

خدا کے لئے عشق سے باز آؤ دعا کیوں کسی پر نگاہیں اُٹھاؤ
جسے جان دُوبھر ہو اپنی جہاں میں حسینوں کی اُلفت کا وہ روگ پالے

مولوی انوار احمد خاں فریدی

تاریخی مضمون

اے بادشاہ تو کہاں ہے؟

"بجرمِ عشقِ توام مے کشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست"

فیروز شاہ بہمنی گلبرگہ کا بلند اقبال سلطان گزرا ہے۔ اسے شکار سے شغف نہیں بلکہ عشق تھا۔ ہفتے میں دو بار خاصہ فوج کے جانباز ہمراہ لے پچھلی رات کو دارالحکومت سے نکلتا۔ اور بہمنی کے مضافات میں شکار کھیل کر پہر دن چڑھے واپس آتا تھا۔ اگرچہ بظاہر اس معمول سے غرض "تفریح" تھی مگر حقیقت میں شکار محض بہانہ تھا۔ مقصود اس سے فوج اور اپنے آپ کو حرب و ضرب کے لئے تیار رکھنا تھا۔ چنانچہ اس پروگرام پر سختی سے عمل کیا جاتا۔ اور بیماری کے سوا اس میں کبھی ناغہ نہ ہونے پاتا۔

سنہ ۸۰۱ھ میں ایک دفعہ سلطان شکار کے لئے گلبرگہ سے برآمد ہوا۔ بارہ ہزار جاں نثار جن کے سروں پہ جواہر نگار فولادی خود عجب بہار دے رہے تھے۔ ہمرکاب تھے۔ اور احمد خاں سپہ سالار[1] دائیں پہلو میں تھا۔ دونوں بھائی آپس میں باتیں کرتے گھوڑے اڑائے چلے جاتے تھے۔ کرشن کے قریب لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گئے۔ معلوم ہوا دریا پار سے کوئی سپاہی زخمی ہو کر آیا ہے۔ اور پڑا دم توڑ رہا ہے۔ بادشاہ جست مار کر گھوڑے سے اترا۔ قریب جا کر دیکھا کہ ایک مسافر فوجی لباس میں زمین پر چت لیٹا ہے۔ کپڑے خون سے لت پت ہو رہے ہیں۔ اتنے میں لشکر سلطانی بھی آ پہنچا۔ معالج شاہی نے زخموں کو دھو کر مرہم کے پھاہے رکھے۔ اور منہ میں "آبِ حیات" کے چند قطرے ٹپکائے۔ سپاہی نے آنکھیں کھول دیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہنشاہ کو دیکھنے لگا۔ گویا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عالمِ خواب ہے یا حالتِ بیداری۔

بادشاہ سپاہی کے پاس بیٹھ گیا۔ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نرمی سے بولا۔ "میرے بہادر بول تجھے کس بدبخت نے زخمی کیا؟" سپاہی رو پڑا۔ اور بادشاہ کے قدموں سے آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ "میں کیا کہوں۔ عالم پناہ کہتے ہوئے زبان لرزتی ہے میرے آقا۔ دریا پار کی تیری ساری رعایا کٹ چکی۔ مدکل اور رائچور تباہ کر دیئے گئے!!" سپاہی کمزوری کے سبب بولتے بولتے رک گیا اور ملتجیانہ نگاہوں سے بادشاہ کو دیکھنے لگا۔

سلطان نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "میرے مظلوم بیٹے کہے جا!" اور پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا "آہ میری غریب رعایا!"

سپاہی نے اپنی ساری قوت کو صرف کر کے بولنا شروع کیا "اے بادشاہ! تیری بدقسمت رعایا جان بچانے کے لئے تیری طرف دوڑی۔ مگر کرشنا کے مہیب پانی نے انہیں تیرے قدموں تک پہنچنے نہ دیا۔ انہوں نے کنہریوں کے مقابلہ میں دریا کی لہروں کو ترجیح دی۔ وہ اس بحر [illegible] میں کود پڑے۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کی خوفناک موجوں سے زندہ سلامت بچ نہ سکے۔ جب میں دریائے کرشنا سے نکل کر ادھر کو روانہ ہوا۔ دریا کی پرشور موجوں میں ڈوبنے والوں کی پکار برابر سنائی دے رہی تھی۔ کہ "اے بادشاہ تو کہاں ہے؟""

بادشاہ کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ اور رنج و غم سے دانت پیستے ہوئے بولا۔

"بدبخت دیورائے! اپنے بزرگوں کی بدنامیوں اور رسوائیوں

---

[1] احمد خاں سپہ سالار سلطان کا چھوٹا بھائی۔

کو بھول گیا!"

پالکی منگوا کر سپاہی کو اس میں آرام سے لٹایا۔ اور چند ملازم ساتھ کر کے دارالحکومت کو روانہ کیا۔ پھر کرنا ہاتھ میں لے کر اس زنالے سے پھونکی۔ کہ جنگل گونج اٹھا۔ تمام فوج الیمانی تلوار ہاتھ میں لے حکم شاہی کا انتظار کرنے لگی۔ دفعتہً بادشاہ کی بارعب آواز بلند ہوئی۔

"میرے وفادار دوستو! ہم جنگلی ہرنوں کا شکار کرنے آئے تھے۔ مگر قضا و قدر نے بجائے ان کے درندوں کو بھیجدیا۔ اب ان سے منہ موڑ کر پیچھے لوٹنا۔ جوانمردی سے بعید ہے اس لئے جس کو سوچنا ہے وہ سوچ لے۔ اور جس کو حق نمک ادا کرنا ہو وہ ہمارے پیچھے گھوڑا سرپٹ ڈالدے"۔

یہ کہہ کر سلطان ایک کرشبدیز پر سوار ہو گیا اور اسے ایڑی لگا۔ ہفتوں کی منزلوں کو لپیٹ تیسرے دن کرشنا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ پیچھے منہ پھیر کر دیکھا۔ تو ساری فوج مرنے مارنے کو کمر بستہ پائی۔

دریا کالے ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اور پار دیورائے کی فوج ناکہ بندی کئے پڑی تھی۔ سلطان گھوڑے سے اتر کر سپہ سالار کے ہمراہ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ چوٹی پر جا کر دیکھا تو کرشنا اس سرعت سے بہتا نظر آیا۔ گویا پہاڑوں کو بھی کاٹ کر بہا لے جائیگا۔ اور پھر پاٹ میلوں تک پھیل رہا تھا۔

بادشاہ کا دل ڈوب گیا۔ اور افسردہ خاطر ہو کر نیچے اترنے لگا۔ پیادے چند ملاحوں کو گرفتار کر لائے تھے۔ اور ان سے دشمن کی فوج کا پتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دیورائے نو لاکھ پیادے اور تیس ہزار سواروں سے کئی میلو میں کیمپ لگائے پڑا ہے۔ اور سامان اسقدر ہمراہ لایا ہے کہ اگر پانچ سال بھی یہیں گزارنے پڑ جائیں۔ تو اور منگوانے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس خبر سے فیروز شاہی امرا کے اوسان خطا ہو گئے۔ عالم خان افغان نے گھبرا کر کہا:-

"جہاں پناہ! اس میں کچھ شک نہیں کہ لشکر سلطانی کا ایک ایک سپاہی دس دس کنہریوں پر بھاری ہے۔ مگر یہاں تو ایک کے مقابلے میں ایک سو سپاہی پڑا ہے اور پھر ہاتھیوں اور توپوں کی مار الگ ہے۔ ساتھ ہی کرشنا کی طغیانی کا یہ عالم ہے کہ سوا اس گھاٹ کے اور کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی۔ جہاں سے فوج گزر سکے۔ ایسے حالات میں اتنے خوفناک دشمن سے ٹکر لینا جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا ہے"۔

سلطان نے کہا "یہ سب درست ہے۔ مگر مسلمانوں نے دشمنوں کی کثرت پر کبھی غور نہیں کی۔ اور قرآن حکیم کا یہ ارشاد ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہا ہے۔ كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

اگر مٹھی بھر مسلمانوں سے طارق اندلس کے لاکھوں نبرد آزما سپاہیوں کو شکست دے سکتا ہے اور اگر عرب کا سترہ سالہ جرنیل محمد بن قاسم چند ہزار شامیوں سے داہر کی بے قیاس افواج کا قلع قمع کر سکتا ہے۔ تو فیروز بھی بارہ ہزار جانبازوں سے دیورائے کا خاتمہ کر سکتا ہے"۔

احمد خاں سپہ سالار نے دست بستہ عرض کیا۔ "ظل الٰہی کا ارشاد بجا۔ مگر طارق اور ابن قاسم کی فوجیں ہزاروں میل گھر سے دور تھیں۔ اُن کو تخت یا تختہ کے سوا کوئی صورت نظر نہ آسکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ذلت کی موت پر شہادت کی عزت کو پسند کیا اور کامیاب ہوئے۔ مگر یہاں ہر شخص گھر کے قریب پڑا ہے۔ اور وہ جانتے ہیں۔ کہ بھاگ کر جان بھی بچائی جا سکتی ہے۔ پھر اس بار طغیانی اتنی ہے گویا مالابار کے تمام پہاڑ اسی دریا میں پگھل کر بہہ رہے ہیں یا سون سون ہواؤں نے بحیرہ عرب کو اٹھا کر کرشنا میں دے مارا ہے"۔

میاں سندھو بڑھ کر بولے "بہتر یہ ہے کہ ہم اسیطرح دشمن کا رستہ روکے پڑے رہیں۔ وہ کسی طرح کرشنا کو عبور نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس نے جرأت کی بھی۔ تو اس کا کوئی متنفس زندہ اس کنارے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس اثنا میں تمام مملکت میں پروانے بھیج کر کمک منگوائی جا سکتی ہے زیادہ نہ سہی مگر نو لاکھ کے مقابلہ میں ایک لاکھ جان نثاروں کا ہونا لازمی ہے"۔

بادشاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ جب سے میں نے مدکل اور رائچور کی تباہی کی داستان سنی ہے۔ اس وقت سے رات کی نیند اور دن کا آرام مجھ پر حرام ہو چکا ہے۔ جب سونے لگتا ہوں مظلوم رعایا خواب میں آ کر مجھ سے فریاد کرتی ہے۔

اور اُس کی یہ صدا اے بادشاہ تو کہاں ہے؟ آٹھوں پہر میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اس لئے کسی صورت میں بھی آپ مہاجان کا مشورہ میرے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ہاں واپس جانے کی ہر شخص کو اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر سلطان نے امرائے دربار پر افسردہ نگاہوں سے نظر ڈالی اور اپنے خیمہ میں داخل ہو گیا۔

قاضی سراج جو دربار کے بہت بڑے عالم اور گالبکرکے چیف جسٹس تھے اب تک خاموش کھڑے امرائے لشکر کی تقریریں سُن رہے تھے جب بادشاہ چلا گیا تو اُنہوں نے احمد خاں خانخاناں سے کہا:-

"آپ نے یہ بہت بُرا کیا۔ کہ سلطان کو ناراض کر دیا۔ اُس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ دیو رائے سے جنگ کئے بغیر کبھی نہ لوٹے گا۔"

احمد خاں نے آشفتہ ہو کر کہا۔

"عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر زید بکر کو توپ دم کرا دینا آسان ہے۔ لیکن میدان جنگ کی گتھیوں کو سلجھانا بہت مشکل۔ اگر دعویٰ جوانمردی ہے تو کچھ کر کے دکھائیے!"

قاضی سراج نے ہنس کر کہا۔ دعا کیجئے۔ ممکن ہے کہ مسند قضا پر بیٹھنے والوں سے بھی کوئی ایسی خدمت انجام پا جائے جو بڑے بڑے نبرد آزما سپہ سالار بھی انجام نہ دے سکیں۔

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں بغلط بر ہدف زند تیرے

یہ کہہ کر سیدھا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ آہٹ پا کر آنکھ اُٹھائی۔ قاضی صاحب کو دیکھ کر فرمایا ؂

جیبا یکے دفتر خویش بکشا گر درد ما را دوا سے بر آمد

قاضی صاحب نے زمینِ خدمت کو چوم کر کہا "اگرچہ یہ غلام میدان حرب و ضرب کا شہسوار نہیں۔ مگر جان پر کھیل جانا خوب جانتا ہے۔"

سلطان کے پژمردہ چہرے پر مسرت اور شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ فرمایا:-

"قاضی صاحب! میں جانتا ہوں کہ جہاں خداوند پاک نے آپ کو قرآن فہمی اور عدل گستری کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ وہاں شجاعت و بسالت بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ آپ کو اپنے ہمراہ رکھتا ہوں۔"

قاضی صاحب ادائے شکر کے لئے جھک گئے۔ کہا "عالم پناہ کی ذرہ نوازی ہے کہ غلام پر اس قدر شفقت فرماتے ہیں۔ ناچیز کے ذہن میں اس وقت ایک تجویز آئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کی جائے۔"

"ہاں ہاں! ضرور کہو!" بادشاہ نے متبسم ہو کر کہا۔ اور اس نے ایسا محسوس کیا گویا بڑا بھاری بوجھ اُس کے کندھوں سے اُتارا جا رہا ہے۔

قاضی نے دوبارہ زمینِ خدمت کو چوما اور کہا۔

"دیو رائے اور اُس کا ولیعہد رات کو ہمیشہ مجلس عیش گرم کیا کرتے ہیں۔ اگر ظل اللہ اجازت دیں تو یہ غلام اپنے رفقا کی مدد سے دونوں میں سے کسی ایک کو قتل کر سکتا ہے۔ اور جس وقت کنہریوں کے لشکر سے شور و غل کی آواز اُٹھے حضور خاطر جمعی سے دولت و اقبال کو رکاب میں لے کر دریا کو عبور کر آئیں۔"

"ہاں! تجویز تو خوب ہے۔ اس سے دُشمن کی فوج کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور اچھی طرح سے پامال کیا جا سکیگا مگر سراج ایسے خیر سگال کو اتنے خطرے میں بھی تو ڈالا نہیں جا سکتا۔"

"اس امر کی آپ فکر نہ کریں جس خدائے حیّ و قیوم نے آپ کو اتنا اقبال بخشا ہے۔ وہی آپ کے نمک خوار کی حفاظت کو کافی ہے۔" یہ کہہ کر قاضی صاحب کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے باول ناخواستہ اپنے جان نثار صاحب کو گلے سے لگا کر اپنی دعاؤں کے سایہ میں رخصت کیا۔

(۲)

قاضی صاحب نے اپنے رفقا کو جمع کر کے اُن میں سے سات یک دل و یک زبان جوان منتخب کئے۔ اور انہیں جوگیانہ لباس پہنا۔ خود زرد رنگ کی ایک چادر آدھی اوپر اور آدھی نیچے پہن کشکول بغل میں ڈال چمٹا ہاتھ میں لے احمد خاں کے خیمہ میں داخل ہوا۔ اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ وہ حیران ہو کر بولا "قاضی صاحب یہ کیا؟" کہا جب آپ ہمیں مرد میدان ہی نہیں سمجھتے تو پھر یہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ ؂

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو بے آبرو رہنا

پھر مسکرا کر سپہ سالار کو آغوش میں لے لیا۔ اور آہستہ سے کان میں کہا "آج رات کو راجہ یا اُس کا ولیعہد ضرور مارا جائیگا اور یہ کام آپ کا یہی حرب نا آشنا قاضی انجام دیگا جس وقت دشمن کے لشکر سے شور و غل کی آواز بلند ہو۔ چار پانچ ہزار نبرد آزما لے کر دریا عبور کر آئیے۔ ہم لڑتے لڑتے گھاٹ تک آپہنچینگے۔ انشاءاللہ آگے راستہ صاف ہوگا۔"

سپہ سالار نے فرطِ تعجب سے گھور کر قاضی کو دیکھا۔ اور کہا "کیا یہ درست ہے؟"

"بالکل!!" قاضی صاحب نے متانت سے جواب دیا۔

"شاباش! خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہو۔" احمد خاں نے محبت سے قاضی صاحب کو بغل میں لے لیا۔ اور کہا:-

"بھائی واقعی تم بہادر ہو۔ میں نے جل کر جو الفاظ کہے تھے۔ اُن کی معافی چاہتا ہوں۔ ہاں اتنا کرنا۔ کہ جونہی تمہیں اپنے ارادے میں کامیابی ہو۔ پہاڑ پر آگ جلا دینا۔ شور و غل ممکن ہے سنائی نہ دے۔ لیکن آگ میلوں تک نظر آسکتی ہے۔"

"بہتر۔ ایسا ہی ہوگا!"

اتنے میں قاضی کے ساتھی چرمی ٹوکرے لیکر حاضر ہوئے جو دریا عبور کرنے کی غرض سے خاص طور پر تیار کئے گئے تھے۔ اور قاضی صاحب اور خان خاناں کو آخری سلام کرکے رخصت ہوئے!

(۴)

دوپہر کا وقت تھا۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ آفتاب عین نصف النہار پر چمک کر انگارے برسا رہا تھا۔ کرشنا کے دونوں کناروں پر حضرت آدمؑ کی اولاد تلواروں کو زہر میں بجھائے ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہو رہی تھی۔ ہابیل قابیل کے خاکے میں قدرت پھر رنگ بھرنا چاہتی تھی۔ مگر گرمی کی تپش سے سب لوگ اپنے خیموں میں چھپے پڑے تھے۔ دریا کے چڑھاؤ کا یہ عالم تھا کہ دوسرا کنارہ دکھائی نہ آتا تھا کوہ قامت موجیں اُٹھ اُٹھ کر آسمان کو چوم رہی تھیں۔ کنہری دیدبان اسی ماحول میں پہاڑی پر کھڑا دریا کے پاٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُسے سطحِ آب پر چند سیاہ دھبے نظر آئے اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کے گرد ہالہ بنا کر غور سے دیکھا اور پھر نرسنگھا ہاتھ میں لے کر اتنے زور سے پھونکا کہ سوتے جاگتے سب اُچھل پڑے۔ پہرے دار کھانڈے اور کٹار سنبھال گھاٹ پر آموجود ہوئے۔ سب نے نظریں اُٹھا اُٹھا کر تیرنے والوں کو دیکھنا شروع کیا۔ اگرچہ دریا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ مگر تیراک کوئی ایسے زبردست تھے کہ تیر کی طرح پانی کو چیرتے سطحِ آب پر لپکے چلے آتے تھے۔ قریب آئے۔ تو رسالدار نے گھور کر دیکھا اور ہنس کے کہا۔ یہ تو کوئی جوگی معلوم ہوتے ہیں۔ مسافر دریا سے نکلے ہی تھے۔ کہ کنہریوں نے اُنہیں گھیر لیا۔ اور اپنی زبان میں طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ درحقیقت یہ مسافر قاضی صاحب اور اُن کے رفقا تھے۔ اور قاضی صاحب تو اچھے خاصے سادھو معلوم ہوتے تھے۔ اُنہوں نے کنہری زبان میں رسالدار کو نمسکار کیا۔ اُس نے درشتی سے کہا:-

"تم کون لوگ ہو اور کس غرض سے ہمارے لشکر میں آئے ہو؟"

"بابا ہم سادھو لوگ ہیں۔ جگہ جگہ پہنچ کر دیوی دیوتاؤں کے درشن کرتے پھرتے ہیں۔ کاشی سے آرہے ہیں اور وجے نگر میں "شری رنگ" کی یاترا کو جانے کا ارادہ ہے۔"

"مجھے تو شبہ پڑتا ہے۔ کہ تم جاسوسی کی غرض سے یہاں آئے ہو۔" رسالدار نے غصہ بار نگاہوں سے گھور کر کہا۔

"رام رام! رام رام!! مہاراج آپ یہ کیا کہتے ہیں۔ فقیروں سے مذاق اچھی بات نہیں۔ ہم دنیا تیاگ چکے۔ ان مورکھ دھندوں سے منہ موڑ چکے۔ پھر ہم کسی کی جاسوسی کیوں کرنے لگے۔"

رسالدار اس جواب سے کچھ ٹھنڈا ہوا۔ اور بولا۔

"باباجی جنگ کے شعلوں میں گرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیا وجے نگر کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ان دنوں آدمی تو بجائے خود رہا اس کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اب جب تک یدھ ختم نہیں ہوتا۔ آپ کو یہاں قید رہنا پڑیگا!"

قاضی نے نعرہ لگایا "اللہ اکبر" [illegible]

رہ سکتا ہے۔ ارے بابا دو دن ہم ملیکھشوں کے
ہاں رہے۔ آنے سے تو انہوں نے بھی نہ روکا۔ بلکہ ان کے
سیناپتی فیروز مہاراج نے دریا گزارنے کے لئے ٹوکرے دلائے
دیوراستے کے لشکر یاں آکر ہم قید بھگتیں؟" چلو ہم راجہ کے
پاس چلتے ہیں۔ اگر تمہیں کرشنا میں ڈبکیاں نہ دلاؤں تو رام داس
نام نہیں"۔

رسالدار ڈر گیا۔ اور کہا "باباجی معاف کرو۔ جاؤ جہاں
جانا ہو۔ ہم تمہیں نہ روک سکیں گے"۔ قاضی نے لال پیلی آنکھوں
سے رسالدار کو گھور کر دیکھا اور اپنی ٹولی کے ساتھ بڑبڑاتے
ہوئے لشکر کو روانہ ہوئے۔

"بڑا آیا ہے روکنے والا۔ پھر روکا کیوں نہیں۔ جلا
کر بھسم نہ کر ڈالتا۔ پورب پچھم سب ہمیں جانتا ہے"۔
اب قاضی صاحب نے چلتے چلتے پر بھجن گانا شروع کیا۔

سپن یہ سنسار بھائی مرے سپن یہ سنسار
سپن ماتا سپن پتا سپن گورو دوار
سپن گھوڑا سپن ہاتھی سپن اور تار
سپن راجہ سپن پرجا سپن سب بیوپار

قاضی صاحب بمشکل چند قدم ہی چلے تھے۔ کہ آگے دیوراؔ
کا سیناپتی زرہ بکتر لگائے۔ چار آئینہ سجائے سر سے پا
تک اونچی بنا گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ ایک رسالہ ساتھ لئے
سینا کو دیکھتا پھرتا تھا۔ قاضی نے پھر زور سے نعرہ لگایا
"الکھ نرنجن"

سیناپتی نے گھوڑے پر سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور
کہا مہاراج آپ کرشنا پار سے آرہے ہیں۔ کچھ پتہ ہے
ملیکھشوں کا سلطان کتنی فوج سے چڑھ کر آیا ہے۔

قاضی نے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا "سیناپتی جی!
ہم سادھو لوگ ہیں۔ ان باتوں سے ہمارا کیا واسطہ! اگر ایک
دوسرے کی جاسوسی کرنے لگیں۔ تو پھر ہمیں اپنے ملک سے
کون گزرنے دے"۔

سیناپتی کچھ ایسے مرعوب ہوئے۔ کہ پھر بول نہ سکے۔
سادھو اسیطرح چمٹے بجاتے اور بھجن گانے خیمہ خیمہ
صدا کرتے چلے جاتے تھے کہ ایک جگہ سے گانے بجانے کی
آواز آئی۔ بڑھ کر دیکھا تو عجب عالم نظر آیا خیمہ میں غالیچہ پر
وجے نگر کی حسینہ "کلاونتی" بصد عشوہ و ناز ستار بجانے میں
مصروف تھی۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں کمان کی
مانند تنی ہوئی بھویں، دراز پلکیں، گھنگھریالے بال۔ پتلے پتلے
یاقوتی ہونٹ۔ سفید موتیوں ایسے ننھے ننھے دانت۔ عطر بیز
کالی زلفیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ قاضی کچھ دیر ٹھٹکا۔ مگر پھر
کچھ سوچ کر دفعتہً خیمہ میں گھس گیا۔ اور بیتابی سے حسینہ کے
پاؤں چومنے لگا۔

کلاونتی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بولی "باباجی آپ یہ کیا غضب
کرتے ہیں"۔

بولا "اے جانِ جہاں! عرصہ گزرا خواب میں تیری
دلفریب اور من موہنی شکل دیکھی تھی۔ اس وقت سے یہ حالت
ہے کہ نہ رات کو چین ہے نہ دن کو قرار۔ قریہ قریہ تیری تلاش
میں پھرتا تھا۔ کہ آج پورے چار سال کے بعد بھگوان نے تیرا
درشن کرایا۔ یہ کہہ کر قاضی نے اپنی گودڑی میں ہاتھ ڈالا۔ اور
جواہرات و اشرفیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں نکال کر
اس کے قدموں پر نچھاور کر دیں۔

پہلے تو "کلاونتی" ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ جب اسقدر
دولت دیکھی۔ تو نرم ہو گئی۔ اس نے اپنے نیم عریاں اور پر
شباب جسم کو لچکاتے ہوئے صراحی میں سے شراب الٹی اور
قاضی کو چھلکتا ہوا جام پیش کیا۔ کہا "سوم رس ہے پی لیجئے"۔
قاضی نے پیالہ ایک جانب کو رکھ دیا اور کہا "میں تو اس
امرت کا پیاسا ہوں جو تیری نشہ بار متوالی آنکھوں میں چھلک
رہا ہے۔ "سوم رس" کا نشہ عارضی ہے۔ مگر نشیلی نگاہوں
کی مستی دائمی اور ابدی ہے۔ یہ کہہ کر بے تکلف حسینہ کے
پہلو میں جا بیٹھا۔ کلاونتی کی آنکھیں جواہرات کی جگمگاہٹ سے
چندھیا گئی تھیں۔ اس نے قاضی کی تراش خراش سے یہ اندازہ
لگا لیا تھا۔ کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس نے اپنی مرمریں
بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور بولی:۔

"سائیں جی۔ اتنی دولت کہاں اکٹھی کی؟"

"یہ دولت! قاضی کے لبوں پر ایک نفرت انگیز تبسم
کھنڈ گیا "سندری! تیرا یہ پجاری کاشی کے ایک بڑے
جوہری کا اکلوتا لڑکا ہے۔ اس نے گولکنڈہ کی کانیں ٹھیکہ پر
لے رکھی ہیں۔ وہاں جواہرات گنے نہیں جاتے۔ ہر سال تراشیدہ

جواہرات کی ہزاروں بوریاں دساور کو جاتی ہیں۔ جب میں تیری تلاش میں نکلا۔ بوڑھے باپ نے یہ دو تھیلیاں ہمراہ کر دیں کہ شاید سفر میں کام آئیں۔ مگر سادھوں کا روپے پیسے سے کیا کام! جب یہ صورت اختیار کی۔ تو پھر ضرورت ہی نہ پڑی۔ سادھوں رفیق سفر ہمیں نصیب ہو گئے۔ اور ان کی صحبت میں رات دن بسر کرتا شری رنگ کی یاترا کو جاتا تھا کہ راستے میں دُرِ مقصود ہاتھ آگیا۔

کلاونتی نے پہلی بار محسوس کیا کہ دُنیا میں اُس کے سچے طلبگار بھی ہیں۔ اُس کے نازک نازک نتھنے اور پر پیچے پھڑکنے لگے۔ اُس کے دل و دماغ کی تہوں میں کیف و سرور کی موجیں لہرانے لگیں۔ بولی:۔

"مہاراج کی یہ بڑی دیا ہے۔ کہ اِس لونڈی پر اتنا کرم فرمایا۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جب تک رہیں چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر اس وقت اجازت دیجئے۔ رات کو مجھے یوراج کے دربار میں ناچنا ہے"۔

قاضی نے لپک کر پکڑ لیا اور کہا "کئی سال کی خاک چھاننے کے بعد بمشکل آج تجھے پایا ہے۔ اب تو میں کسی طرح نہ جانے دونگا"۔

حسینہ نے نیم در آغوش نگاہوں سے اپنے مجنوں کو دیکھا۔ اور شیریں آواز میں بولی "مہاراج گھبرائیے نہیں۔ میں جلد لوٹ آؤنگی"!

قاضی حسینہ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ "اے بُتِ جفا کار! اتنی دولت ملنے پر بھی حرص کی آنکھ سیر نہیں ہوئی؟ کہ چاندی کے چند سکوں کی خاطر اپنے پریمی کو ہجر و فراق میں تڑپتا چھوڑ کر راجہ کے دربار میں جانا چاہتی ہے؟"

حسینہ بولی "مہاراج آپ رائے زادہ کو نہیں جانتے وہ بڑا پاپی اور ظالم نش ہے۔ اگر میں آج رات اُس کے دربار میں حاضر نہ ہوئی تو کل وہ مجھے مروا کر چیلوں اور کتوں کے آگے پھنکوا دیگا"!

"اگر تو جانے کے لئے اسقدر مجبور ہے۔ تو پھر ہمیں بھی ہمراہ لے چل۔ قاضی نے حسینہ کے گورے گورے نازک ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! یہ اس سے بھی مشکل بات ہے۔ راجہ کے دربار میں صرف وہی جاسکتے ہیں جو گانا بجانا جانتے ہوں۔ مگر آپ تو اس فن سے بے بہرہ ہیں"!

"اے پری شمائل اگرچہ میں پہلے اس نعمت سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ مگر جب سے تیرا دیدار کیا ہے۔ تیرے عشق نے خود بخود اُس فن سے بہرہ ور کر دیا ہے۔ اگر تو مجھے ہمراہ لے جائے تو نہ صرف گا کر راجہ کو خوش کرونگا۔ بلکہ بعض ایسے کرتب دکھاؤنگا۔ جو اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہونگے"!

حسینہ نے مسکرا کر مندل پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر واقعی آپکو گانا آتا ہے تو اس سے شوق فرمائیے"!

قاضی نے مندل اُٹھا کر اس پر اس طرح سے دھرپد خیال ٹپا گایا کہ کبھی اس کے وہم و گمان بھی نہ آیا تھا۔ قاضی نے راگ ختم کیا ہی تھا۔ کہ حسینہ وفورِ کیف سے بیتاب ہو کر اُس سے چمٹ گئی۔ اور اپنے حسن و شباب کی فسوں کاریوں اور دلآویزیوں کا کمند پھینکتے ہوئے بولی:۔

"اے جگت گرو! مجھے یہ گمان تک نہ تھا۔ کہ تم اتنے بڑے راگی ہو۔ اب تم بے تکلف میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے کلاونتی کا نام زیادہ چمکیگا"!

رائے زادہ وجے نگر نے ایک بڑے خیمہ میں جشن ترتیب دے رکھا تھا۔ ریشمی پردوں پر چاروں طرف سُنہری اور روپہلی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ہر طرف شمعیں اور قندیلیں روشن تھیں۔ اگر بتیوں اور عود و عنبر کی خوشبو سے دربار مہک رہا تھا۔ کنہری سپاہی ننگی تلواریں لئے چاروں طرف پہرے پر استادہ تھے۔ خیمہ کے درمیان میں آبنوس کے مرصع اور جواہر نگار تخت پر وجے نگر کا حسین و جمیل راجکمار بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال سے بیٹھا داد عیش دے رہا تھا۔ دائیں بائیں دور تک رنگین مزاج مصاحب پرِ جامِ شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب نے سروں پر کامدار دوپٹے اور گلے میں جڑاؤ مالائیں پہن رکھی تھیں۔

تین گھڑی رات گزر رہی تھی۔ کہ دربار میں دُنیا بھر کے باکمال مطربوں اور مغنیوں کی حاضری شروع ہوئی۔ میر نشاط جس کا نام لیتا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ سٹیج پر رقص میں

مصروف تھے۔ راگی باری باری اپنے رقص کا کمال دکھانے لگے۔ ہر طرف سے واہ واہ کا غل برپا ہو گیا۔ ٹھاکر اور درباری امرا بھول گئے تھے۔ کہ اب وہ کہاں بیٹھے ہیں۔ دفعتہً میر نشاط نے پکارا "کلاونتی"! ابھی یہ صدا فضا میں لہرا رہی تھی کہ وجے نگر کی حسین رقاصہ شعلۂ جوالہ کی طرح اچھل کر رقص گاہ میں ناچنے لگی۔ اس کی نشہ میں ڈوبی ہوئی مدبھری آنکھیں، متبسم لب، نیم عریاں رانیں، گداز جسم، متناسب اعضا تماشائیوں کی پیاسی آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے اپنی مرمریں باہنوں کو پیچ و خم دے کر گورے گورے نازک بدن کو لچکا لچکا کر اس نے وہ رنگ جمایا کہ اندر کا دربار بھی ماند پڑ گیا۔ راجکمار سیاہ تخت پر کالے ناگ کی طرح مستی کے عالم میں بیٹھا جھوم رہا تھا۔ اور ٹھاکر تو اس طرح مبہوت ہو رہے تھے۔ گویا رقاصہ کے فنی کمال نے ان کی تمام ذہنی قوتیں سلب کر لی تھیں۔

کلاونتی کے بعد قاضی سٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے مخصوص انداز میں ستار بجانا شروع کیا۔ ساز میں سوز بھی تھا۔ اور سرور بھی۔ ایک وقت اس سے ایسی سُریں پیدا ہوئیں۔ کہ دل ڈوبنے لگ جاتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا۔ گویا دل پر آرے چلائے جا رہے ہیں۔ پھر تھوڑی سی تبدیلی سے ایسا سماں بندھتا۔ کہ سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اب قاضی نے کھنکھارا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ گویا راگی گانا چاہتا ہے۔ سب اہل دربار ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔ قاضی نے بڑے سوز سے گانا شروع کیا ؎

رنگالے چندریا گندلے ری سیں
تو کیا کیا کرے گی اری دن کے دن
نہ جانے بُلا لے پیا کس گھڑی
کھڑی مُنہ تکے گی اری ایک دن

بڑے بڑے ٹھاکر جو شراب پی پی کر مدہوش ہو رہے تھے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اور بے اختیار ان کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس کے بعد قاضی نے مسخروں کا روپ بدلا۔ اور بھانڈوں کی طرح کرتب دکھانے لگا۔ مندل نوازی اور کھیل تماشے سے اہل دربار کو اس طرح محظوظ کیا۔ کہ خیمہ تالیوں سے گونج اٹھا۔

راجکمار کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ اور اس کی موٹی موٹی آنکھیں وفور مسرت سے چمک رہی تھیں۔ خادمائیں اس قدر کھوئی گئیں کہ بجائے راسنے نہاد ہ کے اپنے آپ کو پنکھے جھل رہی تھیں۔ قاضی نے جب اہل دربار کو اس طرح بدمست دیکھا تو اس نے ننگی کٹار ہاتھ میں لے کر ناچنا شروع کیا۔ اس کا چیلا بھی کٹار سے مقابلے پہ نکل آیا۔ دونوں نے تلواروں سے لڑنا شروع کیا۔ کوئی نصف گھڑی تک یہ شمشیر زنی کے کمالات کا مظاہرہ کرتے رہے پھر ناچتے کودتے راجکمار کے قریب پہنچے۔ اور کچھ دیر رقص کرنے کے بعد یکایک اس چستی اور چابکدستی سے راجکمار پر حملہ کیا کہ کٹاریں سینہ کو چیرتی ہوئیں پار نکل گئیں۔ اس کا کام تمام کر کے دوسروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ٹھاکر اور درباری امرا جو شراب کے نشے میں ہوش و خرد کھو چکے تھے۔ تلواریں نکال لڑنے کو اٹھے۔ مگر لڑکھڑا کر گر گئے پانچ ملنگ جو باہر گوش بر آواز کھڑے تھے۔ شور سنتے ہی سراپردہ پھاڑ اندر گھس آئے۔ اور سب نے مل کر دشمنوں کو گاجر مولی طرح کاٹنا شروع کیا۔ جب نامی گرامی امرا کا خاتمہ ہو چکے تو چراغ اور مشعل بجھا جس سوراخ سے آئے تھے اُسی راستہ سے باہر نکل گئے۔

کنہریوں کا لشکر پندرہ میلوں کی مسافت میں پھیلا پڑا تھا۔ سب اپنے اپنے خیمے میں بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ جونہی خیمہ شاہی سے غلغلہ بلند ہوا۔ گھبرا گئے۔ کسی نے کہا ملیچھوں کا سلطان دس بارہ ہزار سوار سے کرشنا کو عبور کر آیا ہے۔ اور اس نے راجہ و راجکمار کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ کوئی کہتا کہ مسلمان لشکر شاہی سے جدا ہو کر کسی دوسرے گھاٹ سے گزر آئے ہیں۔ اور انہوں نے ہی شبخون مارا ہے۔ الغرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ رات اتنی اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ پڑے باتیں بناتے رہے۔ مگر کوئی باہر نہ نکلا۔

(۴)

کوئی آدھی رات کا عمل تھا۔ سلطان فیروز اپنے خیمے میں مصلے پر بیٹھا خدا کی جناب میں قاضی سراج اور اُس کے

رفقا کی فتح و نصرت کے لئے دعا مانگ رہا تھا۔ کہ اچانک شور سُنائی دیا۔ بادشاہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ہنگامہ بتا رہا تھا۔ کہ واقعہ جس کا انتظار تھا وقوع میں آ چکا ہے۔ فوراً موگری اُٹھا کر گھڑیال پر ماری۔ آواز کے ساتھ ہی چوبدار حاضر تھا

"سپہ سالار کو حاضر کرو" سلطان نے للکار کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد احمد خاں خیمے میں داخل ہوا۔ بادشاہ دریا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پا کر بولا "احمد خاں سگنل ہو گیا وہ دیکھو پہاڑ پر آگ جل رہی ہے۔"

"جی ہاں، قاضی مقصد میں کامیاب ہو گیا۔"

"تو پھر دیر مت کرو۔ پانچ ہزار چابکدست جانباز ہمراہ لے فی الفور دریا میں کود پڑو۔ ما بدولت بہت جلد پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

"بہتر عالم پناہ!" یہ کہہ کر احمد خاں باہر نکلا۔ فوج پہلے سے تیار تھی۔ چار ہزار گھوڑے زیر بند کاٹ کر دریا میں چھوڑ دئے۔ اور اسقدر جنگ آزما مجاہد چرمی ٹوکروں میں بیٹھ دریا کو عبور کرنے لگے۔ کرشنا کالے پہاڑوں میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور اُس کی مہیب طوفانی موجیں پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور محشر بپا کر رہی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا۔ کہ دیو لڑ رہے ہیں۔ دو گھنٹے کی جرأت آزما کشمکش کے بعد غازیانِ اسلام کنارے پر جا پہنچے۔ ابھی رات کا پچھلا پہر رہتا تھا۔ شرق سے چندر ماروپہلی رتھ پر سوار ہو کر دنیا کو منور کرنے کے لئے برآمد ہوا۔ پہرے دار جو ساحل دریا پر ہوشیاری اور حفاظت پر مامور تھے بادشاہی لشکر سے خائف ہو کر بھاگ گئے۔ فیروزی لشکر نے کنہریوں کو نوک سناں پر دھر لیا۔ دیو رائے کو جب اپنے ولیعہد کے قتل ہونے کا علم ہوا۔ تو جہان اُس کی نگاہوں کے سامنے تیرہ و تار ہو گیا۔ روتا پیٹتا بیٹے کے ویران دیوان خانے میں آیا۔ مشعل کی روشنی میں اپنے فرزند جگر بند کی لاش دیکھ کر دھاروں دھار رو دیا۔ ملازموں نے حاضر ہو کر عرض کی کہ سلطان کا لشکر ادھر کو آ رہا ہے۔ دیو رائے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بے تحاشا لاش اُٹھا وجے نگر کو بھاگ نکلا۔ ابھی نیر اعظم کا طلوع نہیں ہوا۔ کہ خورشید جہد کلاہ اقبالمند سلطان نے کرشنا کے مہیب دریا کو عبور کر کے ساحل پر قدم رکھا۔ قاضی صاحب برہمنوں کے لباس میں حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ سلطان کا اقبال بلند، دشمن بُری طرح بدحواس ہو کر بھاگم بھاگ وجے نگر کو جا رہا ہے۔ اس کا سارا لشکر پندرہ میل تک بے ترتیبی سے پڑا ہے۔ اگر پوری طاقت سے حملہ کیا جائے تو فتح یقینی ہے

قدردان بادشاہ نے فرط محبت سے قاضی کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا "زود بینی کہ تر ا نہال خور ہم گردد" اور پھر کرنا ہاتھ میں لے زور سے پھونکی اور للکار کر کہا۔

"مرداں بکوشید تا جامۂ زنان نپوشید"

ادھر سورج کا خون میں نہایا ہوا تھال مشرق کے سر افلک سیاہ پہاڑوں سے نمودار ہوا۔ ادھر جنگ کا سُرخ پھریرا ہوا میں لہرایا۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور گلبرگہ کا سلطان سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، مشکی گھوڑے پر سوار، چتر لگائے اصفہانی تلوار علم کئے بڑے جوش کے ساتھ دشمنوں پر حملہ آور ہوا۔ وجے نگر کا سفیاتی مقابلے میں جم نہ سکا اور شکست کا داغ ماتھے پر لگا اس طرح بھاگا کہ دار الحکومت میں جا کر دم لیا۔ فیروز مند لشکر نے بیجانگر کے اطراف تک تعاقب کیا اور لاکھوں کو تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ دشمن بدحواسی میں اسقدر سامان چھوڑ گیا تھا کہ اس کا سلجھانا مشکل ہو گیا۔ خیمے۔ ڈیرے، شامیانے، سراپردے۔ دیبائے رومی، اطلس فرنگی، فرش و فروش کے علاوہ سپاہیوں نے زخمیوں کی کمروں اور مُردوں کی ہمیانیوں سے جو طلائی اور نقرئی مُہریں نکالیں ان کا تو کچھ حد و حساب نہ تھا۔ یہ "فتح عظیم" خداوند عالم نے قاضی صاحب کی جان نثاری کے طفیل مرحمت کی۔ ہمارے علما اور مشائخ کو اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے۔ کہ ان کا کام حجرے میں تسبیح و تہلیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اگر ضرورت پڑے تو انہیں عبا و قبا اور عمامہ و جریب کو پھینک ایمانی تلوار ہاتھ میں لے میدان کارزار میں داد شجاعت بھی دینی چاہئے۔ زمانے کا مؤرخ "سراج الحق" کی جانبازی کو اس طرح سراہتا ہے

جوانمرد قاضی چوں غرندہ شیر
سوئے رائے زادہ درآمد دلیر
ورا کشت و بر دیگراں حملہ کرد
دمار از ہنوداں برآورد گرد

قاضی صاحب کے اس تاریخی کارنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے ماضیہ نہ صرف دینیات کے ماہر تھے۔ بلکہ شعر و شاعری، فلسفہ، طب، ریاضی اور فنون لطیفہ میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنے کمالات سے موقعہ پر اس طرح استفادہ کرتے تھے۔ کہ بڑے بڑے

نظر حیدرآبادی

نیند

رات آدھی فضائیں ہیں خاموش　　حشر ساماں ہوائیں ہیں خاموش
کھوئی کھوئی سی ہے فضا ساری　　موت کی سی ہے خامشی طاری
ماہ پاروں کے کارواں ہیں اُداس　　یا مری طرح دو جہاں ہیں اُداس
دل پریشاں خیال آوارہ　　آرزوئے وصال آوارہ
بے بسی آزمائی جاتی ہے　　نیند کو نیند آئی جاتی ہے
جل رہا ہے ہجوم غم کا چراغ　　ٹمٹماتی ہے شمعِ قلب و دماغ
اُف یہ تاریکیاں یہ سناٹا　　ثرف ہے خاکہ ضمیرِ انساں کا
خامشی جانے کیا سناتی ہے　　بربطِ دل کو چھیڑے جاتی ہے
جیسے جیسے گھٹائیں چھاتی ہیں　　دھڑکنیں دل کی بڑھتی جاتی ہیں

اس طرح ہائے کھو گیا ہوں میں
جیسے بیہوش ہو گیا ہوں میں

اور ایسے میں ہوش آنے تک　　اپنے ماحول کے جگانے تک
دردِ بے وجہ کی دوا بن کر　　ناشنیدہ سی اک صدا بن کر
میری بدنام جستجو بن کر　　میری ناکام آرزو بن کر
بندشِ ناروا کو ٹھکراتا　　زندگی کی شراب برساتا
چپکے چپکے قدم بڑھائے ہوئے　　سُرخ آنچل میں منہ چھپائے ہوئے
دھیمے دھیمے سُروں میں گاتے ہوئے　　آگ کونین میں لگاتے ہوئے
بے پیے مست لڑکھڑاتے ہوئے　　ایک دنیا کو آزماتے ہوئے

میری آنکھوں میں آ گیا کوئی
نیند بن کر سما گیا کوئی

بہار کوٹی

آپ بیتی

وہ سر سے یک بیک ساڑھی کے آنچل کا ڈھلک جانا
وہ شیشے سے شرابِ ارغوانی کا چھلک جانا
وہ شرما کر کتابوں سے رخِ روشن کا ڈھک لینا
کبھی پنسل چبانا اور کبھی دامن جھٹک دینا
حیا گستر نگاہوں کی تلطف ریزیاں توبہ
نوازشہائے پنہاں کی جنوں انگیزیاں توبہ
وہ نازک نازنیں نازآفریں ہونٹوں کا تھرانا
برنگِ برگہائے گل حسیں ہونٹوں کا تھرانا
وہ ابھری ابھری سانسیں وہ عرق آلود پیشانی
وہ رعشہ ساتنِ نازک پہ وہ نظروں کی حیرانی
ہوا کے ساتھ زلفِ عنبریں کا کھیلتے جانا
گلِ عارض پہ نظروں کے تھپیڑے جھیلتے جانا

یہ تھی تمہید اک ناآشنا پر دل کے آنے کی
یہ تھی پہلی کڑی میری محبت کے فسانے کی

—— ۲ ——

وہ دریا کا کنارا، وہ ہوا وہ چاندنی راتیں
وہ بہکی بہکی مبہم بے سروپا کیف زا باتیں
وہ ہر آہٹ پہ دل میں سو طرح کے وسوسے آنا
وہ آنے والی گھڑیوں کے تصور ہی سے گھبرانا
وہ ہر کھٹکے پہ اک تازہ مصیبت کا گماں ہونا
وہ ہنستے بولتے یکبارگی ناشادماں ہونا
وہ سو سو ڈھنگ سے مہر و وفا کا امتحاں کرنا
مزے لے لیکے میری بیوفائی کا بیاں کرنا
وہ ہر دم کج ادائی چرخِ ناہنجار کے شکوے
عزیزانِ گرامی کے گلے اغیار کے شکوے
غرض ہر لمحہ کیف بیخودی سے چور رہتا تھا
بشانِ طمطراق احباب سے ہنس ہنس کے کہتا تھا

"مہ مصر است داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم"

—— ۳ ——

مگر اب میں ہوں اور اک روح فرسا شامِ تنہائی
دلِ حسرت زدہ ہے اور صد آلامِ تنہائی
وفا کا عہد لینے والے بے مہر و وفا نکلے
طریق و رسم و راہِ عشق سے ناآشنا نکلے

شریکِ زندگی ہیں اب وہ اک ڈپٹی کلکٹر کی
میں بیٹھا چاٹتا رہتا ہوں مسلیں جن کے دفتر کی

ے یہ نظم آل انڈیا مشاعرہ جے پور منعقدہ ۱۲، ۱۳ مارچ ۱۹۴۳ء کے مجوزہ عنوان پر کہی اور پڑھی گئی۔ بہار کوٹی

دواخانہ شفائے عالم کے تین مایہ ناز تحفے!!!



جریان جیسے تباہ کن مرض کے لئے جریانی ایک بہترین دوا ہے

فحش لٹریچر کے مطالعہ یا دیگر اسباب کی بنا پر جب اعضائے تناسل اور ان کے متعلقہ غدود ایسے ذکی الحس ہو جاتے ہیں کہ ذرا سی تحریک پر غدہ مذی۔ اوعیہ منی وغیرہ سے رطوبت منویہ کا اخراج شروع ہو جاتا ہے۔ جریانی کے استعمال سے حس اعتدال پر آجاتی ہے۔ اوعیہ منی (Seminiferous Tubules) غدہ مذی (Cowper Gland) اور غدہ ودی (Prostate Gland) کا احتقان جاتا رہتا ہے۔ سرعت انزال اور احتلام رفع ہو کر زندگی کی نفع بخش قوتیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ منی غلیظ اور گاڑھی ہو کر تمام کیفیات مرض دور ہو جاتی ہیں۔ قیمت فی شیشی ۱۵ یوم کی خوراک دو روپے عہ

دواخانہ شفائے عالم رجسٹرڈ لوہاری منڈی لاہور

QALBI

قلبی رجسٹرڈ

قلب دل اور اعضائے رئیسہ کو تقویت دینے والی لاثانی اور اکسیر صفت دوائی

اختلاج قلب ضعف قلب عام جسمانی کمزوری اور اعضائے رئیسہ کے ضعف کو دور کرنے میں حیرت انگیز دوائی ہے۔ بخاروں کے بعد مثلاً تپ محرقہ شدید ملیریا وغیرہ کے بعد ہونے والی کمزوریوں کو دور کرنے میں تیر بہدف ہے۔ قیمت ایک شیشی اعلیٰ

دواخانہ شفائے عالم رجسٹرڈ لوہاری منڈی لاہور

طاقت اور تندرستی کو قائم رکھنے کیلئے

جام صحت رجسٹرڈ استعمال کریں

خون پیدا کرنے والا تمام اعضا کو قوت بخشتا ہے اور تازہ خون بکثرت پیدا کر کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ ہر موسم کی کمزوری ناطاقتی کو دور کرنے میں اکسیر ہے۔

قوت حیات Vitality کو قائم رکھتا ہے۔ ہر عمر اور ہر موسم میں قابل استعمال ہے۔

دواخانہ شفائے عالم رجسٹرڈ

طفیل ملک

سیدھا راستہ

اُس نے اپنی تھکی سی بوڑھی آنکھیں جن میں حسرت اور بے چارگی جھلک رہی تھی جیل کے صدر دروازہ پہ گاڑ دیں۔ جیل کی عمارت دیگر پرانی وضع کی سرکاری عمارتوں کی طرح پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ دیواروں اور محرابوں پر گاڑھے زرد رنگ کا پلستر کیا ہوا تھا۔ وہ عمارت میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ چھوٹا بظاہر پُرسکون تھا۔ مگر زندگی کے مصائب اور غم کی تباہی نے اُس کے دل کو داغدار بنا دیا تھا۔ اُس کے قدم بھاری بھاری معلوم دیتے تھے۔ جیل کے احاطہ کا مختصر سا راستہ اُس کے لئے ایک دشوار گزار منزل سے کم نہ تھا۔ جیسے یہ راستہ کبھی طے ہی نہ ہوگا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ مجرموں کی آنکھیں جن میں اُمید کی دھیمی دھیمی روشنی جھلک رہی تھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر حسرت بھری نظروں سے الوداع کہہ رہے تھے۔ اور وہ ان سے اپنی گستاخیوں کی معذرت کے لئے سر جھکا جھکا کر بجھے ہوئے دل کے ساتھ بھاری بھاری قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔

باہر صحن میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ مختلف قسم کی آوازوں کے درمیان کبھی کبھی ایک ایسی آواز سنائی دے جاتی جیسے کوئی چیخ رہا ہو۔ دور جیل کے عقب میں ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں کہیں ایک اُلو بول رہا تھا۔ آسمان پر ابابیلیں اپنے پر پھیلائے تیر رہی تھیں۔ کپکپاتے ہوئے اُفق پر کالے کلوٹے کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ شاید انسانی آبادی دور نہیں۔

اس کے سامنے زندگی کے میدانوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ زمین و آسمان کے درمیان پھیلی ہوئی لامحدود وسعتیں جیسے وہ ان وسعتوں کی بیکراں پہنائیوں میں ایک پرندے کی مانند اپنے دونوں پر پھیلائے پرواز کرنے لگا ہو۔ پیپل کے بوڑھے درخت جس کی کتنی ہی داڑھیاں بل کھاتے سانپوں کی طرح لٹک رہی تھیں کے نیچے بیٹھ کر اُس نے کتنے ہی مسافروں کو راستہ بتایا ہے۔ سہانا پور کو یہ راستہ جاتا ہے۔ دان نگر اس راستے سے زیادہ قریب ہے۔ موڑ پر ایک سفید بنگلہ نظر آئے گا۔ وہیں سے ناک کی سیدھ دائیں ہاتھ کی طرف مڑ جانا۔ کالے باغ کے رستے سے ہرگز نہ گزرنا بھائی۔ وہاں ہر وقت وحشی اور آوارہ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔

مسافروں کے جسموں سے برستی ہوئی خوشبوئیں فضا میں بکھر جاتیں تو اس کے جسم میں ایک عجیب و غریب سی لرزش پھیل جاتی جیسے اس لرزش، اس کپکپی میں اس کی زندگی لہریں مار رہی ہو۔ مسافروں کو سہانا پور، دان نگر یا ڈاک بنگلہ شاید بہت جلد پہنچنا ہوتا وہ بغیر شکریہ ادا کئے روانہ ہو جاتے اور ہیولے ہیولے سایوں کی طرح کھیتوں سے گھری ہوئی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے ہوئے اُفق پر حرکت کرتے ہوئے ایک دھبے کی طرح نظروں سے غائب ہو جاتے۔

اگر کوئی مسافر شام کی بڑھتی ہوئی خاموش تاریکیوں اور ارد گرد پھیلتے ہوئے دھندلکوں میں رک جاتا اور اگلے روز علی الصبح جانے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ دھندلے اُفق پر پو پھٹنے سے قبل ہی مسافر کو راہ دکھانے کے لئے کھیتوں میں لیٹی ہوئی آڑی ترچھی پگڈنڈیاں اور مکانوں کے ارد گرد پھیلے ہوئے سنسان راستوں کو پھلانگتا ہوا پیپل کے درخت تلے اپنا فرض ادا کرنے کے لئے آ بیٹھتا۔ اندھیری ڈراؤنی راتیں ہوتیں۔ دور حد نگاہ تک لمبے تڑنگے درختوں کے سائے حیران و لرزاں نظر آتے آس پاس ایک ہیبتناک پُراسرار خاموشی چھائی ہوتی جسم کو شل کر دینے والی سرد ہوا کے جھکڑ چلتے اور بیڈھب سے ٹیلوں کے اونچے نیچے راستوں سے پھسلتا ہوا۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھ کر کسی راستہ بھولے ہوئے مسافر کو ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی دکھا کر اونچی آواز سے تان لگاتا "کون ہے۔ . . . او" اور جواب میں مسافر

کی ایک ہلکی پھلکی سی گونجتی ہوئی آواز سُن کر اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگتا جیسے اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کر رہا ہو۔ اُس جنگل کی گہرائیوں سے آواز نکلتی اور آس پاس کے خاموش جنگلوں اور سوئی ہوئی بستی میں پھیل جاتی "یہی سیدھا راستہ ہے۔ روشنی کی سیدھ میں چلے جاؤ بھائی"۔

اس وقت گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی مسافر کو دور سے تاریکی میں روشنی کی جھلک دکھائی دیتی اور ایک متحرک سا سایہ نظر آتا۔ ہولناک راتوں اور سنسان دوپہروں میں بے ڈھب چبوترے پر بیٹھ کر وہ مسافروں کا انتظار کیا کرتا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی وہ نہایت محبت بھرے انداز میں اپنی بیوی کو آواز دیتا "رجو" چارپائی پر لیٹی ہوئی رجو اچانک بیدار ہو جاتی اور آنکھیں ملتی ہوئی اُس کے سامنے کھڑی مسکرانے لگتی۔ وہ اُس کے گال تھپکتے ہوئے کہتا "کیا سچ مچ تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے؟" رجو کے لب کانپنے لگتے اور وہ خاموشی سے اُس کا منہ تکنے لگتی۔ اس کے چہرے پر معصومیت اور شرم و حیا کی ایک سرخی سی دوڑ جاتی۔ وہ اُسے گدگدانے لگتا اور رجو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

"کون مہینہ جا رہا ہے، پانچواں یا چھٹا؟ بولو بھی"۔ رجو کے سارے جسم میں ایک عجیب سی زردی دوڑ جاتی۔ اُسے اپنا سانس پھولتا ہوا معلوم ہوتا۔ زمین پاؤں تلے سے کھسکنے لگتی۔ دوپٹے کا پلو منہ میں ٹھونس لیتی اور اپنی خمار آگیں آنکھیں زمین پر گاڑ کر پاؤں کے داہنے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگتی۔ "ہٹو بھی! تمہیں تو شرم ہی نہیں آتی" اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر اُس کے سامنے سے ایک ناچتی ہوئی ممیری کی طرح گھوم جاتی۔ اُس کی شادی کو چند مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصہ کا ہر آنے والا دن یوم گزشتہ سے زیادہ پُر سرور اور مسرت خیز ہوتا۔

کبھی کبھی مسافروں کو راہ دکھاتے دکھاتے اُسے دیر ہو جاتی۔ ہر طرف نیلی نیلی سی دھند اور مٹیالا مٹیالا اندھیرا بڑھنے لگتا۔ کھیتوں پر خاموشیاں سی برسنے لگتیں اور وہاں کیا کیا گل کھلتے۔ آدھی رات کے قریب جب چاند آسمان پر ناچتے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں مسکرا رہا ہوتا۔ ہوا کے زور سے درختوں کی ٹہنیاں شور مچانے لگتیں۔ کالے باغ میں وحشی اور آوارہ کتے بھونکتے۔ چڑیا ہوں کے گیت سوئی ہوئی فضا میں ارتعاش سا پیدا کرتے۔ رہٹ کی کیف پرور تانیں گونجتیں اور دور دیس کو جانے والی سڑک پر بیلوں کی گھنٹیوں اور گاڑی کے پہیوں کی طویل جھنکاریں فضا میں تیرنے لگتیں تو گورے گورے بازو، سرکتے ہوئے پلے، اور نہ جانے کیا کچھ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے بچاتے ہوئے گھنے درختوں کے سایوں میں تیزی سے گزرتے ہوئے آڑے ترچھے کھیتوں میں کبھی متحرک ہو جاتے تو اُس کے ہونٹ بھینچ جاتے۔ پٹھے اکڑ جاتے۔ آنکھیں دہکتے انگاروں کی طرح جلنے لگتیں، بدن لرز جاتا۔ وہ اپنا منہ بسور کر رہ جاتا جیسے اُس کے جسم کی کوئی دُکھتی ہوئی رگ کسی اجنبی کے ہاتھ آ گئی ہو۔

راتوں کو کھیتوں کی اوٹ میں اُس نے گاؤں کی کتنی ہی نوجوان لڑکیوں کو تعیش پسند مسافروں کی آغوش میں آہیں بھرتے دیکھا تھا۔ اُن کی خوشگوار سی باتیں سُن کر اُن کے دھڑکتے ہوئے دلوں میں مسرتوں کا سمندر موجزن ہو جاتا۔ وہ اُن کی باتوں میں اسقدر کھو جاتیں کہ انہیں گرد و پیش کا احساس تک باقی نہ رہتا۔ وہ ان پر بُری طرح ریجھ جاتیں۔ اپنے ضعیف والدین۔ بلکتے ہوئے معصوم بہن بھائیوں اور اپنے ہونے والے جوان گبروؤں کو اُن کے لئے چھوڑ دینے پر آمادہ نظر آتیں۔ رامو کی لڑکی شانتا ایک مسافر پر مر مٹی تھی۔ رتن ایک پرجان دیتی ہے۔ للو کی جوان بیٹی شامی کو کوئی روگ لگ گیا ہے۔ ماں اندر ہی اندر گھلی جا رہی ہے۔ اور شامو چوکیدار کی بیوی کو اگر کسی اجنبی نے جھوٹوں ہی اشارہ کر دیا ہوتا تو وہ اپنے آدھی درجن کے قریب منہ بسورتے ہوئے بچوں اور ایک عدد چاہنے والے جوان کو چھوڑ کر کب کی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوتی۔ یہ بیوقوف لڑکیاں پاگل ہو رہی ہیں۔ ان چھوکریوں کے دماغ بگڑ گئے ہیں۔ یہ خوبصورت چیزوں اور شہری اطوار پر بہت مرتی ہیں۔

مسافر جاتے جاتے انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دے جاتے۔

کانچ کی نقلی چوڑیاں۔ ملمع شدہ سنہری کانٹے۔ چاندی کے بُندے خوشبودار تیل کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں اور سرخ و سفید پاؤڈر کی ڈبیاں اور ان کا ہنس ہنس کر کہنا "میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آتے تھے اور بلکتے ہوئے لبوں سے جب وہ انہیں الوداع کہنے لگتیں "اگر تمہیں مجھ سے رتی بھر بھی محبت ہے"۔ ۔ ۔ تو سر جھکا کر رونے لگتیں۔ ان کی ہچکیاں اور سسکیاں سنکر مسافر اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ نرم لہجے میں کہتا "میں تم سے ملنے کے لئے ضرور آؤں گا مجھے سب یاد ہے، کانچ کی چوڑیاں، سنہری کانٹے اور سفید بُندے۔ زور زور کر ہلکان کیوں ہو رہی ہو! میں ضرور آؤں گا۔" یہ کہیں کھیتوں میں اِدھر اُدھر بھٹک جاتیں اور وہ لمبے تڑنگے درختوں کے ٹیڑھے میڑھے سایوں اور سحر و شام کے اُڑتے ہوئے دھندلکوں میں نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ شانتا۔ رتنی۔ مانی۔ اور شامو چوکیدار کی بیوی کے لئے ایک دلنشین سی یادگار چھوڑ جاتے۔ ان کے لئے جیسے یہ بستی سونی ہو جاتی۔ ان کے ذہن میں اس وقت کچھ بیتی ہوئی راتیں تیرنے لگتیں جو انہوں نے مسافروں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر گزاری تھیں۔ وہ سانولی پور دان نگر اور ڈاک بنگلہ کی طرف جانے والی راہوں کو پُر امید نظروں سے دیکھتیں جہاں اُن کے خواب منڈلا رہے ہوتے۔

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گاؤں کے مکان دھندلی دھندلی پرچھائیوں کی طرح لرز رہے تھے۔ ہر طرف ایک گہرا آزردہ سناٹا پھیلا ہوا تھا کھیتوں میں لیٹی ہوئیں آڑھی ترچھی پگڈنڈیاں ویران ہو گئیں اور مکانوں کے ارد گرد پھیلے ہوئے راستے سنسان ہو گئے تو اس نے گھر کی راہ لی۔

"رجو" نہایت ہی محبت بھرے انداز میں اُس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ لیٹی ہوئی رجو نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُس کے سامنے آکر مسکرائی۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اُس نے دیکھا رجو چارپائی پر کستودہ بیہوش پڑی تھی۔ دیئے کی لو میلی کچیلی دیواروں پر سیاہ دھاریاں بنا رہی تھی ایسی کی ٹمٹماتی ہوئی اُداس روشنی میں رجو کی آبنوسی پنڈلیاں کتنی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کا ریشم سا گداز جسم، اس کے جسم میں گدگدیاں سی دوڑ گئیں۔ جی چاہا کہ رجو کے چہرے پر پھیلے ہوئے بالوں کو ہٹا کر اس کے رخساروں کو چوم لے۔ اسے اپنی آغوش میں لے کر خوب زور سے بھینچے اور پیار بھرے لہجے میں کہے "رجو" رجو بیدار ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔ اس کی آنکھوں میں جب خمار ہوتا ہے تو وہ قدرتی طور پر بہت حسین دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور رجو سے تو اسے بہت محبت ہے وہ اس پر جان دیتا ہے۔ بیاہ سے پہلے گھنے درختوں کی اوٹ میں سے کنوئیں کی طرف جاتی ہوئی رجو کو وہ دیکھا کرتا تھا۔ اُس کے بتانے جھوٹے کھیتوں کے کنارے بیٹھ کر سیٹیاں بجایا کرتا تھا۔ جب وہ چودھری کی دکان پر سے کوئی چیز لینے جاتی تو وہ اکثر اسے راستے میں ہی مل جاتا اور اُس کا کام کر دیتا۔ ایک دن وہ کنوئیں سے پانی نکال رہی تھی تو اُس نے کہا "تھوڑا سا پانی تو پلا دو۔"

رجو نے منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے اُس کی بات سُنی ہی نہیں۔ وہ خاموش رہا، بولی "بس ناراض ہو گئے؟"

"میں ناراض کیوں ہونے لگا۔"

"مجھ سے پھر بات کیوں نہیں کرتے؟"

"یہ۔ ۔ ۔ پیاس تم سے بات کرنے کا بہانہ نہیں۔"

"اچھا! تو کبھی کبھی ایسے بہانے بنا لیا کرو۔"

"میں تو یہی چاہتا ہوں کہ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن میری اتنی قسمت کہاں جو آپ مجھ سے ہر روز پانی مانگا کریں اور اسی بہانے۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں نہیں خدا کی قسم، تم سے باتیں کرنے کو میرا جی بہت چاہتا ہے، میں تو تمہارا غلام ہوں۔"

"چھوڑو بھی ایسی باتیں، مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہو۔"

سارے گاؤں میں یہی مشہور ہے وہ رجو سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ، وہ آگے بڑھ کر سوئی ہوئی رجو کے رخساروں کو چومنے لگا تو اس کی نظریں اُس کے بالوں پر جم گئیں۔ لمبے لمبے بالوں سے خوشبو کی لپٹیں اُمنڈ رہی تھیں ان کی مہک میں اُس کا دل جیسے دب کر رہ گیا ہو۔ ایک جھٹکے کے ساتھ وہ پیچھے ہٹ گیا جیسے بجلی کے تار کو چھو دیا ہو۔ رجو کے کانوں میں چاندی کے بُندے ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ گوری گوری گداز بانہوں میں کانچ کی چوڑیاں لرز رہی تھیں۔ اس کے انگارے کی طرح تپتے ہوئے دماغ میں رگیں اُبھر آئیں۔ اُمیدیں جیسے مٹ گئیں اور ولولے ٹھنڈے

پڑگئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ زبان خشک ہو کر تالو سے چمٹ گئی۔ چہرے پر زردی پھیل گئی جسم پھنکنے لگا۔ کنپٹیاں جلنے لگیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا کلیجہ مسل دیا گیا ہو۔ گویا اس کی زندگی، زندگی کا سکھ، اور زندگی کی اُمنگیں، خوشبو کی لپٹوں، چاندی کے بندوں اور کانچ کی چوڑیوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہوں۔ وہ چیزیں، مکروہ و ملعون چیزیں، جنہیں پہلی ہی نظر میں پہچانا جا سکتا ہے۔ کسی انجان مسافر کا تحفہ۔

بجلی کی ایک رَو سی اُس کے دماغ کی تاریکیوں کو مٹاتی ہوئی اُس کے دل میں اُتر گئی۔ ایک لمحے کے لئے آنکھ تک نہ جھپکی۔ ہاتھ پاؤں یک لخت تھرتھرا اٹھے اور ہزار ہا طوفانی جذبات ذخیرہ لپک کر چہرے پر چھا گئے۔ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھوڑی ہی دیر میں وہ سنبھل گیا اور ان جذبات کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ وہ بیوی کی طرف جھکا تو اُس کے تھوڑے سے بال اُسکی آنکھوں پر آگرے۔ وہ ذرا اور بھی قریب سرک کر تن کے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمبا سانس کھینچ کر چھاتی پھیلائی۔ چہرے پر کئی مختلف جذبات ایک ساتھ جھلک رہے تھے۔ ہونٹ جیسے ناتوانی کے انداز میں اوپر کو اُٹھے ہوئے اور دانت جیسے باہر کو جھانک رہے تھے۔

اچانک ہی اُس کے دل میں تیر کی طرح خیال پیدا ہوا۔ کہ ایک ہی جست میں اپنی بیوی کا، اپنی رجو کا، اپنی عزت کا، اپنی محبت کا، اپنی زندگی کا ـــ وہ چارپائی کی طرف جائیگا اور ـــ خیالات کی اُلجھنوں میں کھویا ہوا وہ اپنے مکان سے باہر آکر ایک وحشی درندے کی طرح چکر لگانے لگا۔ جو پنجرے کے آہنی سلاخوں سے زور آزمائی کے بعد ادھر اُدھر گھوم کر انہیں توڑ دینے کا تہیہ کر رہا ہو۔

"ڈاک بنگلہ کو کونسا راستہ جاتا ہے؟" اُس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ ایک نوجوان مسافر جس کے جسم سے خوشبو اُمنڈ رہی تھی نہایت عاجزی سے پوچھ رہا تھا۔ "دان نگر کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

بہت ہی تھوڑے عرصہ کے لئے اُس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ وہ اس مسافر کو کالے باغ کا غلط راستہ بتا دے اور تھوڑی ہی دیر میں آس پاس کی بستیوں میں شور سا مچ جائے کہ وحشی اور آوارہ کتوں نے ایک مسافر کو چیر پھاڑ کھایا ہے۔ "انہیں نہیں" اُس کے دل میں اپنے فرض کا احساس ہوا اور اس احساس نے اُسے بیتاب و مضطرب سا کر دیا۔ دم بھر کے لئے چین نہ لینے دیا۔

"یہ" اُس نے مری ہوئی آواز میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دائیں طرف موڑ پر ڈاک بنگلہ ہے۔"

اُس کا خون تیزی کے ساتھ جسم میں کھولنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال رہا ہو۔ جیسے اُس کے ذہن میں کسی مہلک زہر کے اثرات پیدا ہو رہے ہوں۔ بدن میں آگ سی لگ گئی اور دل میں شعلے اُٹھنے لگے۔ ناقابلِ برداشت درد کی ایک تیز لہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ عجیب و غریب صدائیں سُنائی دینے لگیں۔ سر چکرانے لگا۔ پیپل کا بوڑھا تناور درخت جس کی کتنی ہی داڑھیاں بل کھاتے سانپوں کی طرح لٹک رہی تھیں جیسے گر پڑا۔ دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ زمین و آسمان اس کے گرد گھومنے لگے۔

آدھی رات کے قریب گھر میں داخل ہوا۔ دیئے کی مدھم دُھندلی دُھندلی روشنی میں رجو کا چہرہ اسی طرح جھلملا رہا تھا۔ وہ چند لمحات تک نہایت غور سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی مست آنکھیں۔ اُس کے دل میں کبھی یہ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ اس حسین و جمیل جسم کی تہ میں ایک مکار اور پُرفریب دل چھپا ہوا ہے اور یہ مسکراتی ہوئی آنکھیں کبھی رُلا بھی سکتی ہیں۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ مٹھیاں بھینچ گئیں بھرے بھرے بازوؤں کی اُبھری ہوئی رگیں تن سی گئیں۔

وہ ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ جنون دیوانگی کے تمام اثرات اُس کے دل و دماغ پر چھا گئے تھے۔ "اب مجھے اس خوبصورت چہرے کی معصومیت پر اعتبار نہیں!" اُسکا دل رجو کے خلاف غیظ و غضب سے بھر گیا۔ خاموشی سے چارپائی کی طرف بڑھ کر رجو کی گردن پکڑ کر اپنی ساری قوت سے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ چند ساعتوں کے لئے رجو نے اپنی خوبصورت آنکھیں جن میں شباب کی مستی اور نیند کا خمار بھر رہا تھا، کھولیں جیسے رحم کی ملتجی ہوں اور آہستہ آہستہ اپنی شرمیلی نگاہیں سمیٹ لیں۔ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ آنکھیں باہر اُبل پڑیں۔ زبان لٹک پڑی۔ پیشانی پر موٹی موٹی نیلی رگیں اُبھر آئیں۔ لمبے

لمبے سانس لینے لگی تو اس کے لکڑی کی طرح سخت اور مضبوط ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ باہر بھاری بھاری قدموں کی عجیب غریب آوازوں کے ساتھ رات کی کئی بیچ در بیچ ملی ہوئی چھوٹی چھوٹی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ باہر جیسے کوئی مسافر گو رہا اور اُس کے پاؤں کی آہٹ نے ان آوازوں کے تسلسل کو برہم کر دیا۔ وہ چونکا اور اُسے یکلخت اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ ہیبت خوردہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دیا جل رہا تھا اور لَو ہوا سے ہولے ہولے جھوم رہی تھی۔ پانی کے عکس کی مانند لرزاں اور متغیر اس کا لمبا اوٹ پٹانگ سا سایہ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی کے مہیب دھبے پھیلتے تھے اور سکڑ جاتے تھے جیسے ہانپ رہے ہوں۔ اندر کا دروازہ ذرا کھلا تھا اور اس میں سے چاندکی چھنکتی ہوئی چاندنی کی ایک ہلکی سی لکیر یوں جھانک رہی تھی جیسے کوئی اُنگلی اشارہ کر رہی ہو۔

اس کی سہمی ہوئی نظریں موم کی طرح بے رنگ لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ جو فرش پر کچھ کبڑی اور کچھ چت پڑی تھی۔ زندگی میں جسقدر پیاری معلوم ہوتی تھی اس سے بھی زیادہ حقیر اور بدنما معلوم ہو رہی تھی۔

یہ وہ طویل برسوں سے ریفارمٹری جیل میں وہ ایک مجرم کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔

صبح کے وقت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری کے دائیں نکڑ پر چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی سے سورج کی پہلی پھیکی روشنی جھانکتی تو وہ اداس اداس نظروں سے اپنے ساتھیوں کی کال کوٹھریوں کی طرف دیکھنے لگتا اور جب سائے ڈھل جاتے تو صحن میں نئے نئے مجرم جمع ہوتے وہ اپنے شہروں، قصبوں کا حال ایک دوسرے سے دریافت کرتے۔ وہ کہاں سے آئے ہیں؟ اُنہیں کس جرم کی پاداش میں سزا ملی ہے۔ وہ اُن کی گفتگو کو کان لگا کر سنتا۔ اثنائے گفتگو میں اگر جیل کا وارڈر آجاتا تو وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیکر کرخت آواز میں کہتا " میں نے اپنی نوکری کے عرصہ میں کئی مشہور قیدی دیکھے ہیں۔ میں بیس سال سے جیل کی نوکری کر رہا ہوں۔ میں وارڈر ہوں۔ میرا باپ بھی وارڈر تھا۔ میرا دادا بھی اور پردادا بھی۔ آج یہ وہ ایک مجرم کی حیثیت سے جیل میں آیا تھا۔ اور وہ گردن جھکائے اپنی پیشانی

اگر ہتھیلی کا سہارا دیکر پیپل کے درخت کو دیکھنے لگتا جس کی لمبی سی ٹہنیاں اُس کی کوٹھری پر جھکی رہتیں۔

رات کو چاروں طرف بھیانک تاریکی اور زبردست خاموشی چھائی ہوتی۔ ایک ایسی خاموشی جو کبھی کبھی وارڈر کی کڑکتی ہوئی آواز۔ کتے کے بھونکنے اور اُلو کے چیخنے کی صدا سے چند لمحوں کے لئے ٹوٹ جاتی اور آسمان پر کوئی بہت روشن تارہ ٹوٹ کر ایک سنہری محراب بنا کر فضا میں تحلیل ہو جاتا تو وہ کانپ جاتا۔ جسم میں پھیلی ہوئی رگیں جیسے تن جاتیں۔ کوٹھری کی اُبھری ہوئی دیواریں اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتیں۔ وارڈر کے جوتوں کی آواز کھٹ کھٹ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اُس کے کانوں سے ہوتی ہوئی حلق تک جا پہنچتی۔ کتا زور زور سے بھونکنے لگتا۔ شکستہ کھنڈروں میں چھپا ہوا اُلو شور کرنے لگتا اور اس کی کوٹھری کے آگے سے گزرتے ہوئے وارڈر کے قدم یکایک رُک جاتے۔ چابی کھڑکھڑ کے ساتھ قفل میں گھومتی اور ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے پچکے ہوئے گالوں پر رسید ہوتا۔ وارڈر اپنی مونچھوں پر تاؤ دیکر کہتا "بیس سال سے جیل کی نوکری کر رہا ہوں حرامزادے —— اگر بھاگنے کی ذرا کوشش کی —— تو میں وارڈر ہوں، میرا باپ بھی وارڈر تھا اور میرا دادا بھی اور پردادا بھی۔"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ جیل کے صحن میں شور و غل کی آوازیں بلند ہوتیں جن میں کبھی کبھی چیخ پکار اور گریہ و زاری بھی شامل ہوتی اور وہ چھت میں لٹکے ہوئے مکڑی کے جالے میں بھنبھناتی ہوئی مکھی کی طرف دیکھنے لگتا جو رہائی کے لئے کشمکش کر رہی ہوتی۔

جیل میں اسے کبھی یہ خیال بھی نہ گزرا تھا کہ چودہ برس یعنی ایک سو اڑسٹھ مہینے، پانچ ہزار سے مصیبت بھرے نکلنے والے دن اور اتنی ہی کالی اُداس راتیں گندی اندھیری کوٹھڑی میں کاٹنے کے بعد اُس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے وارڈر کے قدم اچانک رُک جائینگے اور وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیکر فخریہ انداز میں اُسے رہائی کا حکم سُنا کر کہیگا "میں نے اپنی نوکری کے عرصے میں کئی مشہور عادی مجرم دیکھے ہیں اور کئی بہت ہی شریف مثلاً تم۔ بیس سال سے جیل کی نوکری کر رہا ہوں۔ میں وارڈر ہوں، میرا باپ وارڈر تھا۔ میرا دادا بھی

اور پر وا او اشاید وہ ایک نہایت شریف مجرم تھا"

جیل تک اطلاع کا مختصر سا راستہ اس کے لئے ایک دشوار گزار منزل سے کم نہ تھا جیسے یہ راستہ کبھی طے ہی نہ ہوگا۔ اس کے قدم بھاری بھاری معلوم دیتے تھے۔ وہ تفکرات میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ جھریاں دار چہرہ بظاہر پرسکون تھا۔ مگر زندگی کے مصائب اور گھر کی تباہی نے اس کے دل کو داغدار بنا دیا تھا۔

پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی جیل کی زرد رنگ کی عمارت کی ایک کال کوٹھری میں چودہ برس گزارنے کے بعد آج پھر وہ جنگل سے اٹی ہوئی سنسان اور ویران راہوں پر عجیب وغریب خیالات میں اُلجھا ہوا ہولے ہولے قدم اُٹھا رہا تھا۔

"وان نگر کا بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" ایک مسافر نے نہایت تپاک سے اُس سے پوچھا۔

اُس نے اپنی تھکی تھکی آنکھیں جن میں حسرت اور بیچارگی جھلک رہی تھی۔ اُٹھا کر دیکھا۔ مسافر نہایت عاجزی سے اُس کا مُنہ تک رہا تھا۔ جیسے اُس کا دل کسی نے مٹھی میں دبا دیا ہو، جیسے اُسے ماضی کے گرد و غبار میں اٹی ہوئی کوئی پھینکا شنائی دے گئی ہو۔

ایک لمحے کے لئے اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس ناواقف مسافر کو کالے باغ کا غلط راستہ بتا دے اور تھوڑی دیر میں ارد گرد کی آباد بستیوں میں خبر پہنچ جائے کہ وحشی اور آوارہ کتوں نے ایک مسافر کو چیر پھاڑ کھایا ہے۔

"نہیں نہیں" ایک آواز سی اُس کی اُمنگوں اور آرزوؤں سے جھلسے ہوئے دل میں کلبلانے لگی۔ اسے دماغ کی ہر سلوٹ میں اپنے خلاف ایک ہلکا ہلکا سا غصہ پھیلتا معلوم ہوا۔ میں کتنا احمق ہوں۔ بیوقوف ہوں، گدھا ہوں۔ تعصبی ہوں۔ ایک ناواقف مسافر کو غلط راستے پر ڈالنا انسانیت کے خلاف ہے۔ شرافت سے بعید ہے۔ ایک نہایت ہی بزدلانہ فعل ہے" اس کی ساکن آنکھیں سمٹی ہوئی بھویں اور مُرجھایا ہوا چہرہ جیسے اُس کے دل کی کیفیت ظاہر کر رہے ہوں۔

مد یہ سیدھا راستہ دان نگر کو جاتا ہے۔ جہاں ان نگر ختم ہوجاتا ہے وہاں جنگل کے عین وسط میں ایک اجلا سفید رنگ کی عمارت اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے کھڑی ہے۔ لیکن اگر سانا پور کے دائیں طرف سے جائیں تو صرف دو گھنٹہ کا راستہ ہے۔" اس نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے مری ہوئی آواز میں مسافر کو انگلی سے راستہ بتاتے ہوئے کہا۔

مسافر لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا اور وہ اس کے پاؤں کے ہلکے ہلکے نقوش کو دیکھنے لگا۔ آسمان پر ابابیلیں اپنے پر پھیلائے تیر رہی تھیں۔ کپکپاتے ہوئے افق پر کالے کلوٹے کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ انسانی آبادی شاید دور نہیں۔

وہ زور زور سے کھانس رہا تھا جیسے اس کے مرطل بے جسم میں چند ... کو کھلی کھانسیوں، چند نہایت ہی بھدی کھوں کھوں کی گنجائش باقی ہو۔

نوشتہ: ہیارن

ترجمہ: علی احمد بی اے

بید کا درخت

بومیوں کے دورِ حکومت میں سمورائی قبیلے کا ایک نوجوان تموتادا نامی تھا۔ تموتادا اچیازن کا باشندہ تھا۔ لیکن کم سنی ہی سے نوٹو کے حکمران کی خدمت میں رہا۔ اور پھر شہزادے کی سرپرستی میں فوج کی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ بڑا ہو کر جوان ہوا تو ایک زبردست اسکالر اور ایک کامیاب سپاہی ثابت ہوا ــــ بادشاہ کی عنایتیں اب بھی اس کے شاملِ حال تھیں۔ وہ اپنے ہر دلعزیز اخلاق اور خوبصورتی کی وجہ سے سمورائی برادری میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

جب وہ بیس سال کا ہوا تو اُسے ایک خانگی کمیشن کے سلسلہ میں ماساموتو۔ کیوٹو کے بڑے حکمران کے پاس بھیجا گیا۔ اچیازن کے راستے سے سفر کرنے کا حکم پا کر اس نے یہ بھی اجازت حاصل کر لی کہ وہ اپنی بیوہ ماں سے ملنے کے لئے کچھ دن قیام کرے گا۔

سردی کے شباب کا زمانہ تھا۔ سارا شہر برف سے ڈھکا تھا۔ گھوڑا قوی اور تنومند ہونے کے باوجود تیز نہ چل سکتا تھا۔ جس راستے سے وہ جا رہا تھا ایک پہاڑی علاقہ سے گزرتا تھا جہاں کے رہنے والے چند لوگ دور دور بستے تھے۔ سفر کے دوسرے روز دن بھر مسلسل چلنے کے بعد اسے یہ معلوم کر کے پریشانی ہوئی کہ وہ اپنے ٹھہرنے کی منزل پر زیادہ رات گئے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی پریشانی بجا تھی کیونکہ شام ہوتے ہوتے تند آندھی کے ساتھ برف کا ایک شدید طوفان آیا۔ تھکے ہوئے گھوڑے کے قدم اب بمشکل اٹھ رہے تھے۔ عین اُس وقت تموتادا کی نظر ایک جھونپڑی پر پڑی جو قریب کی پہاڑی پر بید کے درختوں کے درمیان دکھائی دے رہی تھی۔ تھکا ہوا گھوڑا بدقت تمام جھونپڑی تک پہنچا تموتادا دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگا جو آندھی کے خوف سے اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور ایک خوبصورت اجنبی مسافر کو کھڑا دیکھ کر رحم آمیز لہجہ میں کہا:۔

"اُف! ایک نوجوان اور ایسے طوفان میں سفر ــــ خوبصورت مسافر اندر آ جاؤ۔"

تموتادا گھوڑے سے اتر پڑا اور جھونپڑی کے پیچھے ایک چھپر تلے اسے باندھ کر جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اندر اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا اور ایک نوجوان لڑکی بانسوں کی کھپچیوں سے سلگتی ہوئی آگ کے گرد بیٹھے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ انہوں نے بڑے تپاک اور خندہ پیشانی سے اُسے آگ کے پاس آنے اور بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ بوڑھے دیہاتی مسافر کے لئے چاولوں کی شراب اور کھانا پکانے کا انتظام کرنے لگے۔ اسی عرصہ میں وہ پہاڑی دوشیزہ ایک پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تموتادا نے دیکھا وہ بیحد خوبصورت تھی۔ اگرچہ اس کا لباس نہایت بھدا اور اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اُسے تعجب ہوا کہ ایسی حسین لڑکی اور ایسے ذلت و افلاس میں بسر کرے یہ حسن کی توہین تھی۔ بوڑھے آدمی نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:۔

"معزز مہمان یہاں سے آبادی ابھی بہت دور ہے اور گھنی برف مسلسل گر رہی ہے۔ ہوا کافی سرد ہے اور راستہ بہت خراب ہے۔ اس لئے ایسی رات میں سفر کو جاری رکھنا بہت خطرناک ہے۔ اگرچہ یہ غریب خانہ آپ کے شایانِ شان نہیں، اور ہم آپکو خاطر خواہ آرام نہیں پہنچا سکتے۔ پھر بھی اس ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے ایک رات اطمینان سے بسر کی جا سکتی ہے۔ ہم آپکے گھوڑے کی ممکنہ حفاظت کرینگے۔"

تموتادا نے اس کی التجا منظور کر لی۔ وہ خوش تھا کہ اس حسین لڑکی کو خوب جی کے دیکھنے کا موقعہ قسمت سے ملا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد دسترخوان اس کے سامنے چن دیا گیا ــــ کھانا معمولی لیکن مقدار میں زیادہ تھا۔ وہ کھا ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی لوٹ سے شراب لے کر آئی۔ اس نے لباس تبدیل کر دیا تھا اور وہ ہاتھوں سے بنائے ہوئے ایک بھونڈے لیکن صاف

لباس میں ملبوس تھی۔ سر کے منتشر بال بھی کنگھی کرکے خوبصورتی سے جما دئے تھے۔ جب وہ پیالے میں شراب انڈیل رہی تھی تمو تادا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی نظر سے آج تک جتنی خوبصورت عورتیں گزری تھیں وہ سب سے زیادہ حسین تھی۔ اُس کی ہر حرکت میں ایک کشش اور جاذبیت تھی ـــــ جو دیکھنے والے کو بیخود بنا دیتی تھی۔ لیکن بوڑھے ماں باپ اُس کے لئے یہ کہہ کر معذرت کرنے لگے۔

"ہماری لڑکی ادیاگی (ہری بید) یہاں پہاڑوں کی چٹانوں اور وادیوں میں تنہا پلی ہے۔ یہ مہمان داری کے آداب وغیرہ کچھ نہیں جانتی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اس کی گستاخیوں اور نادانیوں کا کوئی خیال نہ فرمائیں گے۔"

تموتادا نے جواب دیا کہ وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے کہ ان کی اچھی لڑکی اُس کی خدمت کر رہی ہے۔ وہ مسلسل اُسے گھورتا رہا۔ اگرچہ وہ یہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی محبت بھری بیباک نظریں اُس بھولی لڑکی کو شرم سے پسینہ پسینہ کئے دے رہی ہیں۔ اُس نے نہ تو شراب ہی پی اور نہ کچھ کھا سکا۔ لڑکی کی ماں نے کہا:-

"مہربان مسافر! ہماری دلی آرزو ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ کھانے کی ضرور کوشش کریں۔ اگرچہ ہماری دیہاتی غذا بہت ہی معمولی اور خراب ہے لیکن سردی کے اس طویل سفر کے بعد آپ یقیناً بھوکے ہوں گے۔"

تموتادا نے بوڑھے دیہاتیوں کو خوش کرنے کے لئے کھانا کھایا اور جسقدر شراب پی سکتا تھا پی۔ لیکن شرمائی ہوئی دوشیزہ کا جادو اُس کے دل و دماغ پر چھایا جا رہا تھا۔ اُس نے اس سے بات کی اور اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی گفتگو بھی اُس کے چہرے کی طرح شیریں تھی ـــــ ممکن ہو وہ پہاڑوں ہی کی گود میں پلی ہو۔ لیکن اُس کے ماں باپ نے ضرور کسی زمانے میں معزز زندگی بسر کی تھی۔ کیونکہ لڑکی کے برتاؤ اور اُس کی گفتگو سے وہ ایک تعلیم یافتہ عورت معلوم ہوتی تھی ـــــ اچانک اُس نے اُس سے مخاطب ہو کر چند شعر پڑھے۔ یہ اشعار گویا سوال تھے جو اُس کے دل کی آواز تھی۔

تدرزوئی نسواد

یاشا کاٹوئی کوسو

ہی دوکوراسی

اکیبونی اٹورد

اکانی ساسورن

(میں اپنی ماں سے ملنے جا رہا تھا۔ لیکن مجھے ایک ایسی خوبصورت ہستی نظر آئی جو پھولوں کی طرح حسین تھی اور اُس کی خاطر میں آج کی رات یہاں بسر کر رہا ہوں ـــــ لیکن اسے خوبصورت حسینہ صبح کی سپیدی ظاہر ہونے سے پہلے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کیوں ظہور پذیر ہو رہی ہے)

پہاڑی ہرنی نے ایک منٹ کی دیر کئے بغیر ان اشعار میں جواب دیا۔

ازورد ہی تو

ہونومی کواردوہ

داکا سودی یانی

موتاسومایاسوبو

کیمی یا تھارن

(اگر میں اپنی آستین سے طلوع ہونے والے سورج کی کمزور خوبصورت کرن کو چھپا لوں ـــــ تو مجھے یقین ہے کہ صبح ہونے پر بھی میرا محبوب یہیں رہیگا)

تموتادا سمجھ گیا کہ وہ اُس کی محبت کا جواب دے رہی ہے اُس کو اس بات پر زیادہ تعجب نہ تھا کہ اُس نے برجستہ اشعار میں اپنے خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ بلکہ وہ اس کی اُس "خود اعتمادی" سے بہت خوش تھا جس کی جھلک اشعار میں نمایاں تھی ـــــ اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ چاہے بھی تو بھی ساری دنیا میں اُسے اس دیہاتی دوشیزہ سے زیادہ خوبصورت باتمیز عورت نہیں مل سکتی ـــــ اُس کے دل کی ہر دھڑکن سے یہی آواز آ رہی تھی "اپنی قسمت کے اس سنہرے موقع سے فائدہ اُٹھاؤ جو خدا نے تمہیں بخشا ہے"۔ غرض وہ جنون کے افسوں سے ایسا مغلوب ہوا کہ بغیر کسی مزید تمہید کے ان بوڑھوں سے درخواست کرنے لگا کہ وہ اپنی لڑکی کا رشتہ اُس کے ساتھ باندھ دیں۔ پھر اُس نے اپنا نام اور حسب و نسب بتایا اور نوتو کے حکمران سے جو خاص تعلقات تھے اُن کا بھی ذکر کیا۔

بوڑھے ماں باپ اُس کے اس اچانک سوال پر حیرت زدہ ہوئے۔ پھر کچھ دیر کی پس و پیش کے بعد جواب دیا:-

"معزز نوجوان! آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ ابھی اور ترقی کریں گے۔ آپ جو احسانِ عظیم ہم پر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری حیثیت سے بہت زیادہ ہے سچ یہ ہے کہ ہماری شکرگزاری کی گہرائی تو بیان ہی کی جاسکتی ہے اور نہ بتائی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارے گاؤں میں پلی ہوئی دیہاتی جنگلی لڑکی بیوقوف اور آداب و تہذیب سے بالکل ناآشنا ہے۔ ان باتوں کے مدنظر یہ ایک نامناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ اسے آپ جیسے معزز سمورائی کے ساتھ بیاہ دیا جائے ــــ ایسے معاملہ کے متعلق کوئی حرف زبان پر لانا بھی ناواجب ہے۔ لیکن چونکہ آپ لڑکی کو اپنی پسند کے مطابق پاتے ہیں اور اس کے ناشائستہ اخلاق، دیہاتی بدتمیزیوں کو نظرانداز کرنے پر راضی ہیں تو ہم بخوشی اپنی لڑکی کو آپ کی نذر کرتے ہیں۔ آپ اسے اپنی داسی بنالیں اس لئے اب آپ اس کے متعلق جیسا چاہیں برتاؤ کرسکتے ہیں۔

صبح ہوتے ہوتے طوفان ختم ہوچکا تھا۔ دھلے ہوئے چمکدار آسمان کے ساتھ دن طلوع ہوا۔ اس کی گلابی چمک کو اگر داسی کی آستین اپنے محبوب کی آنکھوں سے چھپا دیتی تب بھی وہ اپنا سفر ملتوی کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوتا ــــ اور نہ ہی لڑکی کو چھوڑ کر تنہا جانا پسند کرتا۔ اور جب اس کے سفر کی تیاری مکمل ہوگئی تو وہ اس کے ماں باپ سے مخاطب ہوکر بولا۔

"اگرچہ یہ ناشکرگزاری ہوگی کہ آپ کی اتنی مہربانیاں حاصل کرنے کے بعد پھر یہ کہنے کی جرأت کررہا ہوں کہ آپ اپنی لڑکی میرے ساتھ کردیں۔ اب میرے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ اس سے الگ ہوجاؤں۔ اور جبکہ وہ خود آپ کی اجازت سے میرے ساتھ جانے کو تیار ہے تو میں اسی حالت میں جیسی کہ وہ اب ہے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند ہوں۔ اگر آپ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیں گے تو میں ہمیشہ اپنے والدین کی طرح آپ کی خدمت کرونگا۔ اور اس سے قبل کہ میں پھر آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں براہِ مہربانی یہ حقیر تحفہ اپنی مہمانداری کے صلہ میں قبول فرمائیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے مہربان میزبانوں کے سونے کے ٹکڑوں کی ایک تھیلی رکھدی۔ لیکن بوڑھے شخص نے متعدد شکریوں کے ساتھ تھیلی کو آہستہ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:۔

"مہربان سردار، یہ سونا ہمارے کسی کام نہ آئیگا اور شاید آپ کو اس طویل دشوار سفر میں اس کا کام پڑے۔ یہاں ہم کوئی چیز نہیں خریدتے۔ ہم چاہیں بھی تو اپنی ضروریات پر اتنی بڑی رقم صرف نہیں کرسکتے۔ جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے۔ اس کو ہم بغیر کسی قیمت کے آپ کی نذر کرچکے ہیں۔ وہ آپ کی ہے۔ اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آپ کو ہم سے اجازت مانگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہم سے کہہ چکی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ جانا پسند کرتی ہے۔ اور آپ جبتک اس کی موجودگی اپنے پاس مناسب سمجھیں گے وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔ ہماری خوشی کے لئے یہی بہت کافی ہے۔ آپ اسے اپنی داسی بنانے کے لئے قبول کررہے ہیں۔ اور اب ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے متعلق کوئی فکر نہ کریں۔ ایسے مقام پر نہ تو ہم اس کے لئے اچھے کپڑوں کا انتظام کرسکتے ہیں اور نہ جہیز دے سکتے ہیں علاوہ اس کے اب ہم بہت بوڑھے ہوچکے ہیں اور خدا جانے کس دن اس کو تنہا چھوڑ کر مرجائیں۔ اس لئے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے ہماری لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانا قبول کیا ہے۔

توموتادا پیہم اصرار کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا کہ وہ اس کی نذر کو قبول کریں۔ اس نے محسوس کیا کہ انہیں روپے کی کوئی پروا نہیں۔ بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ لڑکی خوش رہے۔ اس طرح انہیں راضی پاکر اس نے محبوب دوشیزہ کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا۔ پھر رخصت ہوتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

"معزز مہمان!" لڑکی کے ماں باپ نے جواب دیا۔ "شکریہ تو ہم کو ادا کرنا چاہتے۔ تمہیں نہیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری لڑکی پر مہربان رہیں گے۔ ہم اس کی طرف سے مطمئن ہیں۔"

ملک کے دستور کے مطابق کوئی سمورائی بغیر اپنے مالک کی رضامندی حاصل کئے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن توموتادا کو ابھی اس کے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ وہ واپس پلٹ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً اس پہاڑی حسینہ کے ساتھ کیوتو پہنچا۔ ایسی صورت میں یہ بات ضروری تھی کہ وہ اپنی ہونے والی داسی کے حسن کو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا۔ اسے خوف

تھا کہ کہیں وہ اُس سے [illegible] چھین نہ لی جائے کیوتو کی سڑکوں پر وہ گھورنے والی نظروں سے اُسے بچاتا رہا۔ لیکن وہاں کے بادشاہ ہوشوکرا کے ایک درباری نے اوپاگی کو دیکھ پایا اور توتادا سے اُس کا تعلق معلوم کر کے وہاں کے حکمران تک یہ بات پہنچا دی۔ کیوتو کا حکمران جو نوجوان اور ساتھ ہی حسن پرست بھی تھا حکم دیا کہ اُس لڑکی کو محل میں لایا جائے اور لڑکی محل میں پہنچا دی گئی۔

توتادا کو بہت رنج ہوا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا وہ ایک معمولی تاجر تھا جو ایک دور رہنے والے بادشاہ کے پاس سے آیا تھا۔ علاوہ اس کے وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ایسی زبردست طاقت کے قبضہ میں ہے جس کی آرزو ناکام ہونا نہیں جانتی۔ توتادا نے محسوس کیا کہ اُس نے بڑی نادانی کی وہ اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوا۔ ایک سپاہی کے لئے یہ بڑی بدنامی کی بات تھی۔ اب صرف ایک صورت باقی تھی کہ وہ کسی طرح اُس کو لے کر فرار ہو جائے۔ بہت غور کرنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اُسے ایک خط لکھے گا۔ اس میں شک نہیں یہ کام بڑے خطرے کا تھا لیکن اُس نے جان پر کھیل کر چینی زبان میں ایک منظوم خط لکھا اور کسی طرح اُس تک پہنچا دیا۔ اس نظم میں صرف اٹھائیس لفظ تھے۔ لیکن اِن میں اُس نے اپنے جذبات کی ترجمانی اور فراق کی ساری داستان دُہرا دی تھی۔

کوشی رو سن گوجن دو دو
ریوکوجو نا سیدا وہ تار بتی راکن وامتھا تارد
کوموں ہتو تو بی ایتی نوکاکی کیو ترای لوگو تو شی
کوری یوری شور وکوری روجن

(جواہروں سے لدی ہوئی دوشیزہ کے پہلو بہ پہلو نوجوان بادشاہ چل رہا ہے۔

خوبصورت حسینہ کے آنکھ کے لگاتار آنسو بہہ کر اُس کے لباس کو تر کر رہے ہیں۔ لیکن نوجوان ۔ ۔ ۔ بادشاہ ایک ہی نظر میں اُس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اور اُس کی محبت سمندر کی تہ کی طرح گہری ہے۔

اس لئے صرف میں ہی ایک ایسا ہوں جس کو ٹھکرا دیا گیا ہے۔ صرف میں ہی تنہا بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہوں۔"

جس دن یہ خط بھیجا گیا اُسی شام کو بادشاہ ہوشوکرا کی طرف سے توتادا طلب کیا گیا۔ اُسے فوراً یہ گمان ہوا کہ راز فاش ہو گیا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ خط کہیں بادشاہ نے دیکھ لیا ہے تو اب وہ سخت ترین سزا سے نہیں بچ سکتا۔

"اب وہ میری موت کا حکم دیگا" توتادا نے دل میں کہا۔ لیکن جب اوپاگی ہی نہیں تو مجھے اپنی زندگی کی بھی پروا نہیں۔ علاوہ اس کے اگر ایسا ہوا بھی تو میں کم از کم ہوشوکرا کو مار ڈالنے کی ضرور کوشش کرونگا۔ پھر تلوار کو کمر سے باندھ کر وہ جلدی سے مکان سے نکل گیا۔ جب ملاقاتی کمرہ میں پہنچا تو دیکھا کہ شرار ہوشوکرا ایک اونچے تخت پہ بیٹھا ہے اور بڑے بڑے معزز سمورائی شاہی لباس پہنے اُس کے اردگرد کھڑے ہیں۔ سب کے سب مورتوں کی طرح خاموش تھے۔ جب وہ ایک آداب بجا لانے کے لئے آگے بڑھا تو اُس وقت درباریوں کی خاموشی اُس سکوت کی طرح معلوم ہو رہی تھی جو طوفان آنے سے پہلے ہوتی ہے۔ لیکن ہوشوکرا اچانک تخت سے اُتر کر نوجوان مجرم کی طرف بڑھا اور اُس کو اپنے سینے سے لپٹا کر اُس کے لکھے ہوئے منظوم خط کے اشعار دہرانے لگا۔ ۔ ۔ کوشی او من گوجن دو دو۔

توتادا نے ڈرتے ڈرتے گردن اُٹھائی اور دیکھا اُسکی آنکھوں میں محبت کے آنسو جھلک رہے تھے۔ تب ہوشوکرا نے کہا:۔

"چونکہ تم دونوں ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہو۔ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میرے رشتہ دار نوتو کے بادشاہ کے بجائے میرے ہاتھ سے یہ شادی انجام پائے۔ شادی کی تیاری مکمل ہو گئی ہے۔ مہمان آ گئے ہیں تحفے تیار ہیں"

بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی ایک طرف سے پردے اُٹھے توتادا نے دیکھا بہت سی شاہی عورتیں شادی کی تقریب کے لئے جمع ہیں اور اوپاگی عروسانہ لباس میں اُسکا انتظار کر رہی ہے۔ اس طرح وہ اُسے واپس دے دی گئی۔ توتادا اور اُسکی خوبصورت بیوی کو بادشاہ کی طرف سے بڑے بڑے قیمتی تحفے دیئے گئے۔

شادی کے بعد پانچ سال تک توتادا اور اوپاگی عیش سے زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن ایک صبح اپنے شوہر سے گفتگو کرتے کرتے اوپاگی نے یکایک ایک درد انگیز چیخ ماری۔ اُس کے چہرے

کا درخت، شدید پڑ گیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اُس نے
کمزور سی آواز میں کہا:۔

"میں شرمندہ ہوں کہ اپنی چیخ سے آپ کو چونکا دیا۔
لیکن کیا کروں درد شدید اور اچانک تھا۔ میرے سرتاج پیارے
... شاید ہمارے اگلے جنموں کے اچھے کرتوتوں کا پھل ہے
میرے خیال میں ہمارا اگلا جنم اس سے زیادہ بہتر ہوگا۔ لیکن
ہماری موجودہ زندگی ختم ہو رہی ہے۔ ہم بہت جلد جدا ہو جائیں گے
میرے لئے دعا پڑھو۔ میں مر رہی ہوں"

"اُف تمہیں یہ کیسا وہم ہو گیا" حیران شوہر چلایا "میری
زندگی! تمہاری طبیعت زیادہ خراب تو نہیں معلوم ہوتی۔ کچھ دیر
لیٹ کر آرام کرو۔ تکلیف جاتی رہے گی"

"نہیں نہیں" وہ بولی "میں مر رہی ہوں۔ میں اسکا خیال
بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں جانتی ہوں! ۔ میرے مالک اب
سچ بات کو چھپانا بیکار ہے۔ میں انسان نہیں ہوں۔ ایک درخت
کی روح میری روح ہے۔ ایک درخت کا دل میرا دل ہے۔ بید
کے درخت کا رس میری زندگی ہے۔ اس منحوس گھڑی کوئی میرے
درخت کو کاٹ رہا ہے۔ اس لئے میں ضرور مر جاؤں گی ——
آہ اب رونا بھی میری طاقت سے باہر ہے۔ جلدی کرو جلدی
میرے لئے دعا پڑھو۔ جلدی آہ!"

درد کی ایک دوسری چیخ کے ساتھ۔ وہ آستینوں سے اپنا
چہرا چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی مرگئی۔ لیکن فوراً ہی اسکا سارا جسم
ایک عجیب طریقہ سے تحلیل ہونے لگا۔ اور نیچے نیچے ڈوبنے لگا۔
یہاں تک کہ فرش سے ہم سطح ہو گیا۔ تموتادا اُس کو تھامنے
کے لئے بڑھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بستر پر پیاری دوشیزہ
کا لباس اور زیور پڑا تھا جسم غائب تھا۔

تموتادا نے سر منڈوا ڈالا اور رہا تھا ... کا نام لے کر سیاح
جوگی بن گیا۔ وہ شہر کے تمام علاقوں میں گھومتا اور جس مقدس زیارت
گاہ پر جاتا آویاگی کی روح کو بخشتا۔ وہ اپنی سیاحت کے دوران
میں جب اچیزن پہنچا تو اپنی بیوی کے گھر کو تلاش کیا لیکن جب
پہاڑوں کے درمیان اس سنسان مقام پر پہنچا تو وہاں کچھ بھی نہ
تھا۔ نہ جھونپڑی تھی اور نہ اُس کا کوئی نشان تھا۔ ہاں تین بید
کے درخت کھڑے تھے جن میں دو تو اپنی عمر طبعی کو پہنچکر مرجھا
چکے تھے۔ لیکن ایک چھوٹا تھا جو بڑھنے سے پہلے ہی
کاٹ ڈالا گیا تھا۔ تموتادا نے ان بید کے درختوں
کے دامن میں بطور یادگار۔ ایک قبر بنائی۔ اور اپنی مقدس
کتاب سے کچھ عبارت اُس پر کندہ کی —— پھر
آویاگی اور اُس کے ماں باپ کی روحوں کے لئے بہت
سی پوجا کی رسمیں ادا کیں۔

Rs. 10,000/-

دس ہزار روپیہ

کی

گھڑیاں مُفت انعام

ہماری مشہور دوائی "اصلی جوہر حسن" کے لگانے سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر اس جگہ بال کبھی پیدا نہیں ہوتے جگہ ریشم کی طرح ملائم، نرم اور خوبصورت نکل آتی ہے۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی میوٹ رسٹ واچ اور ایک انگوٹھی سونا لندن نیو گولڈ مفت دی جاتی ہے۔

ضروری نوٹ

مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین شیشی کے خریدار کو محصول ڈاک بالکل معاف اور چار عدد گھڑیاں اور چار انگوٹھی مفت بطور انعام بھیجی جاتی ہیں۔ جلدی کریں ورنہ یہ موقع بار بار ہاتھ نہ آئیگا۔

ملنے کا پتہ

منیجر لندن کمرشل کمپنی (اے ایل) پوسٹ آفس اچھرہ لاہور

کاش میں عورت نہ ہوتی

ہر مہینہ تکلیف اُٹھاتی ہوں

وہ رو رہی تھی اور اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ بہن اگر میں عورت نہ ہوتی تو اچھا تھا یا اگر ہوتی تھی تو پھر مجھ میں شرم کرنے کی عادت نہ ہوتی۔ آج سات سال ہو گئے۔ میری زندگی تمام ہوئی جاتی ہے اور تمہارے بھائی کو کچھ خبر نہیں، کہ میں مر رہی ہوں۔ وہ یہ دریافت کر کے چپ ہو رہتے ہیں کہ آپ زیادہ تر لیٹی کیوں رہتی ہیں؛ پیاری بہن! تم ہی بتاؤ میں کس منہ سے کہوں کہ میں کیا بیمار ہوں مجھے تو اپنی زبان سے کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میں ماہواری ایام کی بیماری ہوں۔ اور مجھے ان زمانہ میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ خدا تم کسی ذریعہ "اُن" تک یہ بات پہنچا دو۔ شاید وہ میرا علاج کرا دیں۔

سہیلی نے جواب دیا۔ پیاری بہن! اب ہمیں اپنے مردوں تک ایسی بات پہنچانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے بہت سے اخباروں میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی تمام خفیہ بیماریوں کی بہترین دوائیاں دہلی کے "زنانہ دواخانہ" میں ملتی ہیں۔ اور مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ اس دواخانہ کی ہر دوا نہایت عجیب اثر کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتوں کی بیماریوں کو عورتیں ہی بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ سب جانتے ہیں معلوم ہے کہ اس دواخانہ کی دوا "کورس" بہت عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی عورت ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہو ایام کم آتے ہوں یا رک رک کر اور تکلیف کے ساتھ آتے ہوں۔ یا زیادہ آتے ہوں۔ یا مہینہ میں دو تین دفعہ آ جاتے ہوں۔ یا بالکل نہ آتے ہوں یا ایام کی اور کوئی خرابی ہو بہر صورت یہ دوا اپنا اثر کرتی ہے۔ اور خواہ کیسی ہی کمی زیادتی ہو اس دوا کو استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بالکل صحیح وقت پر اپنی مقررہ مقدار میں بغیر کسی درد اور تکلیف کے ایام ماہواری آنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب دوائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس دوا کو سینکڑوں بہنوں نے استعمال کر کے اپنی صحت ٹھیک کر لی ہے۔ اسی طرح تم بھی

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ نمبر ۳۴ اے بی دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر "کورس" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کرا تندرست ہو جاؤ گی۔ اور ہاں! دوا کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ایک شیشی "کورس" دو روپے آٹھ آنے کو ملتی ہے اور نو آنے محصول کے خرچ ہوں۔ چنانچہ اس بیچاری نے کورس کی شیشی منگا کر استعمال کر لی۔ اب وہ بالکل تندرست ہے۔ ہر ماہ اپنے مقررہ وقت پر وہ ایام سے بغیر کسی درد کے اور بغیر کسی تکلیف کے فارغ ہو جاتی ہے۔ پس جو عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہیں وہ بھی اس کے استعمال سے تندرستی ٹھیک کریں۔ ماہواری بغیر تکلیف کے آنے لگے گی۔

ٹیلیفون نمبر ۱۲۲۶۱

نوشتہ:- رادھیکا رنجن
ترجمہ:- محمد یونس احمر

چلمن

جینت ایک روزنامچہ کا نامہ نگار تھا۔ صبح کو تین گھنٹے آفس میں حاضری دیکر واپس آجاتا اور واپسی پر ایک گھنٹہ ریوشن میں صرف کرتا۔ یہی اُس کا روزانہ کا معمول تھا اور اسی کے گرد اُس کی زندگی چکر کاٹ رہی تھی۔

شام کی سُنہری فضاؤں سے جب ذہن و فکر کو تقویت دے کر جینت گھر کی طرف رُخ کرتا۔ اُس وقت کیا مجال کہ راستے میں کہیں رُک جائے یا دوست احباب کے ساتھ سلسلۂ کلام شروع کرے۔ اگر خدانخواستہ چلتے چلتے کوئی منچلا دوست نظر بھی آجاتا تو بغل سے اس طرح کترا کر نکل جاتا کہ اُسے مطلق خبر بھی نہ ہوتی۔ بعض مواقع ایسے بھی پیش آتے کہ لاکھ بچنے پر بھی کسی سے آنکھیں چار ہو جاتیں تو مجبوراً دو ایک باتیں کر کے فوراً نجات حاصل کر لیتا۔ لیکن چند ماہ سے اس کی زندگی کا یہ اصول بن چکا تھا کہ شام کی تفریح کے بعد بڑی سرعت سے اپنی قیامگاہ پر پہنچ جاتا۔

مکان میں پہنچکر وہ فوراً کھڑکیاں کھول دیتا اور اندھیرے گھُپ میں نہ جانے کس خیال کے اُدھیڑ بُن میں بیٹھا رہتا۔ چلمن پُرانی تھی۔ اسی لئے جب وہ کھولتا اُس سے شدید آواز پیدا ہوتی۔ اس آواز سے جینت کو سخت غصہ آتا تاہم وہ نہایت ہی ہوشیاری سے اُسے کھولنے کی کوشش کرتا۔ چلمن کھولنے کے بعد اُسے چھوٹی لکڑی سے اٹکا دیتا تاکہ ہوا کے جھونکے سے پھر بند نہ ہو جائے۔

جب وہ ان چیزوں سے فراغت پالیتا تو تھکے ماندے بچھونے پر بیٹھ جاتا اور خیالات کی عمیق وادیوں میں گم ہو جاتا ۔۔۔ چند لمحے کے بعد وہ اسی کھلی ہوئی چلمن کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ سامنے والی عمارت کی چلمن بھی باندازِ مستانہ کھل کر اس کے احساسات کی وسعت کی چادر کو بقعۂ نور بنا دیتی۔ اس سامنے والی عمارت میں ایک بائی جی رہتی تھی۔ جب سے جینت اس مکان میں آیا تھا اُس کی فلسفیانہ نگاہیں برابر اُس کے حسین خد و خال کا طواف کرتیں۔ ۔۔ اور وہ سوچتا ۔۔ "کاش میں اس کی شیریں گفتگو اور شبنمی آنکھوں سے لطفِ زیست حاصل کر سکوں"۔

اس بائی جی کو جینت بیشمار مرتبہ دیکھ چکا تھا ۔۔۔ کبھی بجلی کے قمقموں کی جھلملاتی روشنی میں کبھی شام کی شفقی شعاعوں میں اور کبھی صبح کی دلفریب سُہانی فضاؤں میں! بائی جی کا شباب بس ایسا ہی تھا جیسے بلّوریں شیشے میں انگوری شراب کی تلچھٹ! اس کی شیریں اور رسیلی موسیقیاں فطرت کے رومانی مرغزاروں میں آگ بن کر داخل ہوتی تھیں اس کی آواز میں غضب کا لوچ تھا! جب کبھی جینت کے بھوکے کانوں میں بائی جی کی موسیقی کا زیر و بم سُنائی دیتا اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی خلدِ زار کی حسین روش پر آسمانی گیت کے مزے لے رہا ہے۔ جینت کے ہر نظامِ عصبی میں بائی جی کی کشش انگیز اداکاری سما چکی تھی۔ ہر لمحہ زبان پر اسی کا نام تھا۔ کبھی کبھی اس کشش کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فون گائڈ میں اس کا فون نمبر تلاش کرتا اور کوشش کرتا کہ فون کے ذریعے اس کے ساتھ محبت کی باتیں کرے۔ اس کے حسن و جمال کی تعریف کے پل باندھ دے۔ لیکن اس کا یہ جمالیاتی ذوق تحتِ الشعور کے دائرے سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتا۔

اندھیرے گھُپ کمرے میں جینت تنہا بیٹھ کر بائی جی کے مکان کو دیکھتا۔ وہ دیکھتا کہ اُس کا کمرہ خوشنما رنگ کے گلدستوں سے آراستہ ہے۔ شراب کی رنگین بوتلیں ۔۔۔

دلآویز پیالیاں قرینے سے رکھی ہیں اور بائی جی گھنگھرو کی
دلفریب تال پہ اپنے ایک ایک عضو کو شرابی بنا رہی ہے
وہ دیکھتا اور ایک ٹک دیکھتا ہی رہ جاتا۔ یہاں تک کہ
اُس کی آنکھوں کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں۔
کبھی کبھی جینت بائی جی کے متعلق خیال آرائیاں کرتا
—"اُس کے روپ میں کتنا رس ہے۔ اُس کی آنکھیں کتنی
نشیلی ہیں — آہ! اُس کی ملاحتیں اور رعنائیاں! میری
پلکیں شب و روز اُسی کے لئے فرش راہ ہیں۔ میرے دل
میں اُسی کا فرشتۂ شباب جاگ رہا ہے۔ کتنی چنچل ہے
وہ جیسے سمندر کی موجیں! کتنا میٹھا ہے اُس کا بول جیسے
پازیب کی جھنکار!

خیالات کے ان منتشر زاویے سے نہ جانے وہ کیوں
پریشان سا ہو جاتا۔ جیسے اُس کے دماغ سے قوت برداشت
بخارات بن کر اُڑ گئی ہے۔ جیسے اُس کے سہانے احساسا
ت غمی بن گئے ہیں۔ جیسے اُس کا جمالیاتی ذوق خاک آلودہ ہو
گیا ہے — اور پھر رات کی گہری خاموشی میں جینت
سوچتا —" ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس دنیائے آب و گل
میں بائی جی کا وجود گوناگوں خوبیوں کا ضامن ہے۔ میں اسے
کبھی جدا نہیں کرسکتا۔ فطرت کی ساری رنگینیاں مٹ
جائیں لیکن میں بائی جی کو ہمیشہ اپنی بیقرار پلکوں میں جگہ دونگا"
نہ جانے کتنی راتیں اسی حسین تصور میں بیت گئیں
نہ جانے اُس نے سینکڑوں تمناؤں کے کتنے گھروندے بنائے
اور بگاڑے۔ اب اس کا جسم برابر لاغر ہوتا جا رہا تھا اور دنیا
کا ذرہ ذرہ اُس کی آنکھوں میں لٹو کی مانند گھومتا نظر آرہا
تھا!

تمام رات جینت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار
دی۔ اس کا ہر فعل اب زبردست انقلاب کا ردِ عمل ہوتا
تھا — اُس کے دماغ میں خلا تھا اور جسم کی ساری قوتیں
زائل ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی تو منہ کے سامنے آرسی رکھ کر
گھنٹوں تخیل کی لامحدود وسعتوں میں کھویا رہتا۔ خود اُسے
اپنے وجود سے کراہت سی محسوس ہونے لگتی۔ اور وہ سوچتا
شاید ایک دن اُس کی زندگی کی ساری حلاوتیں خودکشی
کی نذر ہو جائینگی۔

خیالات کی ان اُلجھنوں سے جب وہ جھنجھلا اُٹھتا تو اس
کے تحت الشعور میں موجودہ یورپ کی خون آلود فضائیں ناچنے
لگتیں — وہ یورپ جہاں کا ایک انسان دوسرے انسان
سے دست بگریباں ہے۔ جہاں حرب و ضرب کی ہولناک
ایجادیں زندگی کو موت سے بدل رہی ہیں۔ اور جہاں کی نئی
تاریخ آگ کی چنگاریوں سے مرقوم ہو رہی ہے۔
یورپ کی ان تمام آلائشوں کو سوچتے سوچتے وہ مکان
کے نچلے ہوٹل میں آیا۔ اس وقت کافی بھیڑ ہو گئی تھی۔ ایک
پیالی چائے کا آرڈر دیکر جینت کی آنکھیں میز پر رکھے ہوئے
اخبار کو گھورنے لگیں۔ چائے ختم کرتے ہی اُس کے دماغ
میں یکایک بائی جی کا تصور ایک ہیجانی کیفیت کے ساتھ
رینگنے لگا۔ اسی اثنا میں ہوٹل کے ایک کونے سے گرجدار
آواز سنائی دی ..."دیکھو دیکھو اب یونان کا بھی خاتمہ
یقینی ہے!"
اور جینت نے سوچا —" ہاں ٹھیک تو ہے۔ خاتمہ
یکے بعد دیگرے دنیا کا۔ مشرق کی سنہری تہذیب و تمدن
کا۔ یورپ کی ترقی یافتہ عظیم الشان سلطنتوں کا۔ دنیا کے
محیر العقول سائنس اور آرٹ کا۔ اس تباہی و بربادی کو روکنے
کے لئے نہ کوئی قانون ہے نہ کوئی بندھن"
جینت کا دماغ اس سے آگے نہ بڑھ سکا خیالات
کی تاریں ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کا عضو عضو بوجھل ہو رہا تھا
"ہماری زندگی کی قیمت کیا ہے۔ اس زندگی کی جس کی نشوو
نما کے لئے ہم دست بگریباں ہیں۔ جس کی رعنائیوں کی
خود نمائی کے لئے ہم پیش پیش ہیں۔ اس کی قیمت؟ احمق!
اس کی قیمت بس اتنی ہی ہے کہ موت کا زبردست ہاتھ دونوں
کی رستخیزیوں کے ساتھ ہماری تاک میں بیٹھی ہے۔ ممکن
ہے کل ہی ہماری زندگی کی سنہری تمنائیں نذر اجل ہو جائیں
ممکن ہے کل ہی ہماری آنکھوں کی روشنیاں اندھی ہو
جائیں!"
جینت کی رگیں اینٹھ چکی تھیں۔ وہ کمرہ میں واپس آگیا
مغربی چلمن کھلی تھی — اور اُس کی پلکیں حسب معمول بائی جی
کی چلمن سے جھانکنے لگیں۔ اُس نے دیکھا روپ کی رانی

بائی جی قدآدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر ریشمی ساڑی کا پلّو دانت سے پکڑے ہوئے ہے اور بانداز مستانہ ابرو کی شکنیں درست کر رہی ہے۔

اس منظر سے جنیت کی دونوں آنکھیں جیسے کسی سُرخ چنگاری کی لپک سے جل اُٹھیں پھر نہ جانے کیوں اُس کے مقابل ساری فضائیں خشمی بن گئیں۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ اس فردوسی منظر سے اپنے ذہن و فکر کی تاریکیوں کو دھو ڈالے لیکن ہر بار وہ کانپ اُٹھتا! پھر سوچتا کاش میں اُس کے حسین بچے کو پالوں۔ اُس سپنے کو جس کی آغوش میں ہر روز نئی زندگی کروٹیں لیتی ہے!

چند ماہ بعد ایک دن ایتل جنیت کے پاس آیا۔ کمرہ کا ایک پٹ بند تھا۔ ایتل اُسے دبی انگلیوں سے کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ جنیت کو اُس کی آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ اُس وقت وہ فلسفۂ حیات کے تار و پود سلجھانے میں بالکل محو تھا۔ ایتل نے یکایک اُس کے شانے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "یوں چپ چاپ کیا کر رہے ہو جنیت؟ جی گھبراتا نہیں ہے کیا اس تنہائی سے؟ اچھا یہ بات ہے بائی جی کے امر روپ کا نظارہ کر رہے ہو؟" چند سکنڈ بعد جنیت ایتل سے مخاطب ہو کر اس طرح گویا ہوا۔ "ہوں! یہ بھی کہنے کی بات ہے ایتل! یہ دنیا مجھ ایسے بیکس اور علیل کے لئے نہیں بنائی گئی ہے کہ دنیا کی رنگینیوں سے دل بہلاؤں میں تو گزرا وقات کے طریقے سوچ رہا تھا! اچھا بتاؤ تو بھی اتنے دن کہاں رہے؟ آنکھیں دیکھنے کے لئے ترس گئیں۔ آخر کیا سمجھ کر تم پھر کلکتہ واپس آ گئے سنوں تو ذرا"

ایتل جنیت کے بچھونے پر بیٹھتے ہوئے بولا "بمبئی شہر مجھے راس نہیں آیا بھائی۔ اس لئے پھر کلکتہ چلا آیا"

اور جنیت نے کہا۔ "اب کس کے ساتھ کنٹریکٹ ہوا تمہارا؟"

اس سوال سے ایتل ہنس پڑا۔ پھر مخاطب ہوا۔ "ہاں کنٹریکٹ تو ہو چکا ہے۔ مگر فلم کمپنی کے ساتھ نہیں"

"پھر؟"

"یہی تو تمہیں سنانے آیا ہوں۔ سنو میں نے ایک شباب سے کنٹریکٹ کیا ہے۔ اور شاید اُسی سے شادی بھی کر لوں بہت جلد"

"یہ کیا؟ شادی؟ کیا تم سچ مچ شادی کرو گے؟ کون ہے وہ معصوم جو تمہارے جال میں اسیر ہو گئی؟ اس کا نام کیا ہے؟"

ایتل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو جنیت تم سے ساری داستان تو کہنے ہی آیا ہوں۔ بغیر سنائے مجھے چین بھی تو نہیں۔ اس کا نام شاید ہر کس و ناکس کو معلوم ہے اور تم ٹھیرے ایک نامہ نگار۔ تم سے پوشیدہ رہنا بالکل ناممکن ہے۔ نہ جانے کتنی بار تمہارے روزنامچہ میں اس کی تصویر شائع ہو چکی ہے"

"گریٹا گاربو تو نہیں؟"

ایتل نے اُس کے اضطراب کا مشاہدہ کر کے ایک قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "کچھ کچھ نکتے تک پہنچ گئے ہو۔ گریٹا نہیں بلکہ گیتا"

"فلم اسٹار گیتا! مگر وہ تو عمر میں تم سے بڑی ہے!"

"ہو سکتی ہے لیکن She is a graceful! Hymn (اُس کا حسن آسمانی ہے)۔"

یہ سُن کر جنیت غیر ارادی طور پر ہنس پڑا اور سوچنے لگا ایتل کو ہو کیا گیا ہے۔ ایسی فاش غلطی! فلم اسٹار لاکھ حسین ہوا کرے بھلا اس کے ساتھ شادی کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ درست ہے کہ سونے اور چاندی کی گود میں اُس کی پرورش ہوئی ہے۔ کلکتہ میں اُس کی متعدد عالیشان عمارتیں ہیں، کئی موٹریں ہیں۔ دولت کا انبار ہے لیکن اُس نے ان سب کو چھوڑ کر فلم کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اور اب فلم اسٹار کی گندی زندگی کو اپنی زندگی کے ساتھ کیسے ملا رہا ہے ــــ کیا راز ہے اس کے اندر؟ ایتل مذاق تو نہیں کر رہا ہے؟ اگر ایسا ہو تو بغاوت کروں گا۔ ایتل کی شادی ایک ایکٹریس کے ساتھ۔ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا! دنیا تباہ کیوں نہیں ہو جاتی۔ اس تہذیب و تمدن کی نئی روشنی میں آگ کیوں نہیں لگ جاتی۔ دنیا پُرانی ہو چکی ہے۔ اس کی تہذیب کا گلا گھونٹ ڈالو۔ پھر سے نئی

دنیا کی داغ بیل ڈالو۔۔۔۔"

دیگر احباب کی مانند اینل نے جنیت کو بھی دعوتی کارڈ بھیجا۔ لیکن اگر اینل اسے دعوت نامہ نہیں بھیجتا تو کیا جنیت کے دل کو دھچکا پہنچتا۔ نہیں اُسے ایسی تقریب کی مطلق پروا نہیں۔ کیونکہ وہ سماج کا باغی ہے اُس سماج کا جس کے اندر غلط اداکاروں کی اخلاق سے گری ہوئی زندگی سانس لیتی ہے۔ جہاں نفس پرستی کی خیرہ کن روشنیاں انسانی ہوش وحواس کھو دیتی ہیں۔ جہاں غلاظت کے کیڑے اور گناہ کے سانپ رینگتے ہیں، جہاں محبت اور پیار کا غلط استعمال ہوتا ہے! یہ سماج درحقیقت اپنی ناشائستہ زندگی اور بداخلاقیوں سے ہندوستان کی پشت پر بار گراں ہے۔ جنیت جس سماج کا باغی ہے اُسی سماج میں اُسکا حقیقی دوست اینل شامل ہے۔ اور ایک فلم ایکٹریس کے ساتھ اپنا سلسلۂ ازدواج منسلک کر رہا ہے۔ یہ وہی اینل ہے جو ایک دن جنیت کا دست راست تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں اسکول کے اندر اینل کی خوش گپیاں اُس کا سنجیدہ مذاق اور بات بات میں مسکراہٹ۔ غرض ہر طالب علم کے دل میں وہ ہر دل عزیز تھا۔ اُس کا مقصد حیات تھا صرف موجودہ سماج سے بغاوت! وہ ہندوستانی سوسائٹی کی جڑیں اکھیڑ دینا چاہتا تھا۔ لیکن آج وہی اینل ہے جو اپنے بلند مقاصد بھول کر سماج کی برائیوں کی ہمت افزائی کرنے پر تُل گیا ہے۔ جو اپنی زندگی کو ایک بدکردار ایکٹریس کی عشوہ طرازیوں سے جوڑ رہا ہے۔ کیا انسان اتنی جلد اپنی کینچلی بدل سکتا ہے؟ کیا تبدیلی اسی کا نام ہے؟ کیا وہ اینل کی شادی میں شریک دعوت ہوگا؟ جنیت کا دماغ ان باتوں کو سوچنے سے قاصر تھا۔

لیکن اینل کے حد سے زیادہ اصرار پر جنیت کو محفل شادی میں شریک ہونا ہی پڑا۔ اینل نے اُسے خوش کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اُس نے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ جنیت کا سارے مہمانوں سے پہلے بڑی گرمجوشی سے تعارف کرایا۔ اور جنیت کی نگاہوں میں اس ماہ پارہ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چلمن میں کھڑے ہوکر بائی جی کے گرتے ہوئے شباب سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ جیسے وہ چاند بنکر زہرہ کے رباب چھیڑنے والی مخروطی انگلیوں کو بوسہ دے رہا ہے! جیسے بائی جی خود اسکی چلمن کے سامنے آکر اپنے انوار محبت کی بارش کر رہی ہے۔۔۔!

جنیت گھر آکر سوچنے لگا۔ میں بھی کیوں نہ ایک دن بائی جی کو دعوت دے کر اپنے کاشانۂ محبت میں بلاؤں لیکن کیا وہ میرے دُکھی تحفے کو قبول کریگی؟ کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اُسے دعوت نامہ بھیجوں۔ کاش میں ایسا کر سکتا! کاش میں ایسا کر سکتا!!

کئی گھنٹے سے جنیت چلمن کے قریب کھڑا ہو کر بائی جی کے کمرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لیکن کمرہ اب تک تاریک اور اُداس ہے۔۔۔ جنیت کے دل میں فسوباریاں ہو رہی ہیں۔ اچانک بجلی کا قمقمہ روشن ہو گیا۔ کمرہ میں چاندنی پھیل گئی اور بائی جی کے شیدائی یکے بعد دیگرے آنا شروع ہوئے۔ آج شمار کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ عمارت کے نیچے موٹروں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔

کچھ دیر بعد بائی جی کے گلے کو جنبش ہوئی اور طبلے پر تھاپ پڑنا شروع ہوئی۔ پھر ناچ کی باری آئی۔ اُف کیا راگ تھا اُس کا! جیسے زہرہ زمین پر اُتر آئی ہو! رات دو بجے کے قریب حسن پرستوں کی جماعت ختم ہوئی اور بائی جی دیوار پر آویزاں آئینہ کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اپنا لباس درست کرنا شروع کیا۔ جنیت کی آنکھیں ابتک جاگ رہی تھیں۔ بائی جی کے کمرہ کی بجلی بھی اپنا شباب دکھا رہی تھی۔ پھر بائی جی نے شب خوابی کا لباس پہنا اور پلنگ پر ایک انگڑائی لے کر دھنس گئی۔ لیکن کمرہ ابتک روشنی سے ہنس رہا تھا۔ یہ دیکھ کر جنیت کا دل دھڑکنے لگا۔ "اُف! چند ساعت قبل بیوقوفوں کی کتنی بھیڑ تھی اور اب وہ تنہا جذبات کی دنیا بسا رہی ہے۔ کیا میں اُس کے پاس جاؤں؟ اپنا برسوں کا مدعا بیان کر دوں؟

جنیت کمرہ کا دروازہ کھول کر چھت کے اوپر چڑھ گیا دودھ جیسے سفید آسمان میں تارے چشمک زنی کر رہے تھے اور فطرت اپنی ساری ترنگوں کے ساتھ بائی جی کے سونے روپ میں سمٹ آئی تھی۔

ذہن کا ورق اُلٹ رہا تھا اور اُنہیں کی کتاب زندگی کے صفحے بڑی سرعت سے دوش فضا پر اُڑ رہے تھے۔۔ لیکن جنیت؟ وہ اپنے زندگی کے پُرانے دیمک چشیدہ اوراق کے اوپر نئے اوراق ترتیب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیالات کے مدوجزر میں ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں بیت گئی اور صبح اُٹھ کر جنیت سوچنے لگا — آج وہ بائی جی کے پاس ضرور جائے گا۔ راگ سنانے کے لئے وہ کتنا روپیہ طلب کریگی — پچیس، پچاس، ایک سو، خواہ جتنی رقم کی فرمائش کرے، وہ دے گا اور راگ ضرور سنیگا۔ ابھی اُس کے پاس تقریباً ڈیڑھ سو روپے ہیں۔ بڑی مشکل سے اتنا پس انداز ہوا ہے۔ ہاں وہ ایک ایک رات کے لئے پوری رقم ضرور خرچ کریگا۔

دوپہر کے وقت جنیت نوٹ کا بنڈل لے کر بائی جی کے دروازے کے قریب گیا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسکا دل دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کی پُتلیاں کانپنے لگیں اور چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ چہرہ میں دلکشی لانے کیلئے مصنوعی تبسم سے کام لینے لگا۔ کیا وہ واپس چلا جائے۔ مگر وہ واپس جائے کہاں؟ آج اُسے بہرصورت بائی جی کے حسن کا طواف کرنا ہے۔ آج اُس کے خیالات باغی ہو گئے ہیں!

"کسے تلاش کرتے ہیں آپ؟" ایک خادمہ نے جنیت سے دریافت کیا۔

یہ سُنکر پھر جنیت کا دل دھڑکنے لگا لیکن ہمت کر کے اُس نے جواب دیا۔ "موہنی بائی ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

جنیت پریشان سا ہو گیا "کہو ریڈیو آفس سے ایک صاحب آئے ہیں"

خادمہ کچھ دیر بعد واپس آکر جنیت کو دوسرے کمرہ میں لے گئی۔ اُس وقت موہنی ایک صوفہ میں بیٹھکر اپنی سیاہ لٹوں سے کھیل رہی تھی، خادمہ نے جنیت کو سامنے والے صوفہ میں بٹھا کر موہنی سے کہا "صاحب آگئے!" اور موہنی نے زیر لب تبسم کے ساتھ پوچھا۔ "اچھا تو آپ آگئے!"

"بہت دنوں سے ملاقات کی خواہش کر رہا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے تم برابر مصروف رہتی تھیں۔ جنیت کی مشتاق نگاہیں موہنی کی شعلہ بدوش پلکوں کو گھور رہی تھیں!

"شاید آپ ریڈیو آفس سے تشریف لائے ہیں" موہنی کے رخسار گلزار ہو گئے۔

جنیت نے کہا "نہیں یہ غلط ہے۔ میں ریڈیو آفس سے نہیں آیا ہوں۔ میں تو تمہاری سامنے والی عمارت میں رہتا ہوں تم مجھے برابر اس چلمن سے دیکھ سکتی ہو۔ موہنی نہ جانے کتنی راتیں میں نے تمہارے حسین خیالات میں بسر کر ڈالی ہیں شاید تمہیں یقین نہ آئے! کاش ایک بار بھی تم اپنی شرابی آنکھوں سے دیکھتیں اور میرے جذبات و تصورات کا مشاہدہ کرتیں"

یہ سنکر موہنی ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے بولی "کاش میں کسی کو دیکھ سکتی! دیکھنا تو میری قسمت میں کب کا ختم ہو گیا۔ بارہ سال کا طویل عرصہ ہو رہا ہے کہ میری بصارت گم ہو گئی۔ میں اندھی ہوں!"

جنیت کے دل و دماغ میں جیسے بجلی کوند گئیں! وہ ٹکٹکی باندھ کر موہنی کی کھلی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ اُن آنکھوں کی سحر آلود کشش نے جنیت کی دنیا ویران کر رکھی تھی۔ اُسے ان آنکھوں میں کوئی نقص نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بس ایسی ہی تھیں جیسے تمام انسانوں کی ہوتی ہیں۔ وہ سوچنے لگا — آخر یہ ظلم کب تک روا رکھا جائے گا۔ کب تک مظلوم انسانوں پر خدا کی قہاریت کارفرما رہیگی! موہنی اندھی ہے بصارت سے محروم! فطرت دل ہی دل میں مسکرا رہی ہوگی کہ اُس نے ایک جوان عورت کی ساری تمناؤں کو کچل ڈالا ہے۔ اس کے مستقبل کی دنیا ویران کر ڈالی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ موہنی اندھی نہیں ہے۔ بلکہ خود فطرت اندھی ہے جو ہر کس و ناکس پر اپنا وار کرتی رہتی ہے! میں کتنی تمناؤں اور آرزوؤں کی رومان پرور دُنیا لے کر آیا تھا کہ آج موہنی کے سامنے اپنے دل کے دہکتے ہوئے شعلے بجھاؤنگا اور کہونگا "موہنی میری دُنیا تم ہو۔ تمہیں لوگ بائی جی کہتے ہیں۔ لیکن میرے دل سے پوچھو کہ اس کے اندر تمہاری کیا وقعت ہے۔ میں تمہیں ملکہ بنانا چاہتا ہوں اپنے بیقرار پلکوں کی!"

جنیت موہنی کے لباس کو بنظر غائر دیکھ رہا تھا۔ اُس کا رنگین ریشمی پاجامہ، فیروزی دوپٹہ اور شفقی رنگ کا ملبوز جنیت کے سیمابی رنگ میں برچھی کی انی چبھو رہے تھے! چند منٹ

م گزرنے کے بعد وہ صوفہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور موہنی سے

لئے کتنے روپے دینے ہونگے؟"

سے



الحمرا کی آخری شمع!

بقیہ صفحہ ۱۲۰

"معاف کیجئے"۔ ابن حمید نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ انسان کو رونا نہیں چاہئے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ لیکن مجھے بہت سی باتوں کا نوحہ کرنا ہے۔ سنو بلانکا! میری محبت بادِ سموم کی طرح ہے۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ میں تیرے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ کل میں نے اس فرانسیسی نوجوان کو قبرستان کے کلیسا میں دعائیں کہتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تجھ سے ملاقات ہوئی۔ تیری باتیں سن کر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ عیسائیت قبول کر لوں گا۔"

بلانکا کے منہ سے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی۔ دان کارلو بھونچکا رہ گیا۔ لاترک نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مُور سمجھ گیا کہ اُسے کیا غم ہے۔ اُس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے ہمت شکن آواز میں کہا۔ "سردار بہادر! حوصلہ رکھو۔ لیکن بلانکا! تم آخری ابن سراج سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ الحمرا کی آخری شمع خاموش ہو رہی ہے۔"

بلانکا، دان کارلو، لاترک سب نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ اور حیرت سے پکار اٹھے۔ "آخری ابن سراج بلــــ الحمرا کی آخری شمع!"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ بیم و رجا، محبت و نفرت اور حسد و رشک کے ملے جلے جذبات نے سب کے دل میں ہلچل مچا دی تھی۔ بلانکا نیم بیہوش ہو کر گر پڑی۔ "اچھے خدا!" اس نے بیخودی کی حالت میں کہا۔ "تو نے میرے انتخاب کو برحق ثابت کیا ہے۔ میں بہادروں کی اولاد کے بغیر کس سے محبت کر سکتی تھی؟"

"بہن!" دان کارلو نے غصے میں کہا۔ "یاد رکھو، ابھی لاترک یہیں ہے۔"

"دان کارلو" ابن حمید نے کہا۔ "غصے کو تھوک دو۔ میں تمہارا اطمینان دے دیتا ہوں۔" اس کے بعد بلانکا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "حورِ آسمانی! حسن و جمال کی دیوی! ابن حمید آخری دم تک تیرا غلام رہے گا۔ لیکن اس کے مصائب کی پوری داستان تو سُن لے۔ جس بوڑھے کو تیرے جدِ امجد نے موت کے گھاٹ اُتارا وہ میرا دادا تھا۔ اس کے علاوہ ایک راز بھی سُن لے۔ جو ابھی تک میں نے افشا نہیں کیا۔ یا جس کو میں تیری وجہ سے بھول گیا۔ جب میں پہلے پہل اپنے بدنصیب ملک کو دیکھنے آیا تھا تو مجھے بیوار خاندان کے کسی فرد کی تلاش تھی تاکہ اپنے دادا کے خون کا بدلہ اُس کے خون سے لے سکوں۔"

"اور اب؟" بلانکا نے دردناک آواز سے پوچھا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میرا ارادہ تیرے درجے کے مطابق ہے۔" ابن حمید نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تیرے وعدے تجھے لوٹا دوں۔ اور غیر معین عرصے کے لئے غیر حاضر رہ کر یا اپنی موت کے ذریعہ سے اس قرض کو چکاؤں جو مجھے ادا کرنا ہے۔ میں نے اپنے وطن سے غداری کی ہے۔ خاندان کی عزت کا خیال نہیں رکھا۔ اور خدا سے بھی بغاوت کرتا رہا ہوں۔ مجھے اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اگر تیرے دل سے میری یاد محو ہو جائے یا زمانہ کی گردش سے ابن سراج ــــ اور اس فرانسیسی سردار کا تجھے خیال نہ آئے ــــ یہ قربانی تیرے بھائی کی طرف سے تجھ پر واجب ہے۔"

لاترک فوراً اُٹھ کر مُور سے بغل گیر ہو گیا۔ "ابن حمید!" وہ چلایا "یہ خیال نہ کرو کہ تم فیاضی میں مجھ سے سبقت لے جاؤ گے۔ میں فرانسیسی ہوں۔ بیارو نے مجھے "سردار" کا خطاب دیا تھا۔ میں نے اپنے بادشاہ کے لئے خون بہایا ہے۔ میں اپنے آقا اور شہزادے کی تقلید میں بے جھجک قربانی کرونگا۔ اگر تم ہمارے ساتھ رہو تو میں دان کارلو سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی بہن کا رشتہ تمہیں دے دے۔ اگر تم غرناطہ سے چلے جاؤ تو میں تمہاری محبوبہ سے اپنی محبت کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہوں گا۔ تم اپنے دل میں یہ خیال لے کر ہرگز نہ جانا کہ لاترک خود غرض ہے اور تمہاری خوبیوں کو نظر انداز کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔" اور اُس نے مُور کو پوری گرمجوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

"سردارو!" دان کارلو نے دونوں کے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے شریف خاندانوں کی اولاد سے یہی توقع تھی۔ لیکن ابن حمید تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ہی الحمرا کی آخری شمع اور بنو سراج کی آخری اولاد ہو؟"

"میرے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے۔" ابن حمید نے جواب دیا۔

"میں تمہارے طرزِ عمل کا مداح ہوں۔" ہسپانوی نے کہا۔ "لیکن آخر کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیئے۔"

مُور نے اپنے لبادے کے اندر سے ایک انگوٹھی نکالی۔ جو اُس نے سونے کی ایک زنجیر سے سینہ پر لٹکا رکھی تھی۔ یہ بنو سراج کا خاص نشان تھا۔ دان کارلو نے اسے دیکھتے ہی اپنا ہاتھ ابن حمید کی طرف

بڑھایا اور کہنے لگا۔ "تُو بہادر ہے تم یقیناً سردار ہو اور ایک بادشاہ کے بیٹے ہو۔ تم نے میرے خاندان سے دشمنی کا اظہار کرکے مجھے عزت بخشی ہے۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ اگر مجھے شکست ہوئی تو یہ محلات تمہارے ہوں گے۔ لیکن اگر تم جنگ نہ کرنا چاہو تو عیسائی ہو جاؤ اور میری بہن کا رشتہ قبول کرو۔"

لالچ بہت بڑا تھا۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ابن حمید کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنے مذہب کو کیونکر ترک کر سکتا تھا؟ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دادا کی روح قبر سے نکل کر اسے لعن طعن کر رہی ہے۔ وہ خوف زدہ ہو کر چلا اٹھا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" پھر اس نے بلانکا سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "تیری کیا مرضی ہے؟"

"صحرا کو واپس چلے جاؤ۔" اس نے فیصلہ کن آواز میں کہا اور پھر بیہوش ہو گئی۔

ابن حمید تعظیماً جھک گیا اور اُسی رات وہ ملاغہ چلا گیا۔ جہاں سے وہ جہاز پر سوار ہو کر اوران پہنچا۔ شہر سے باہر اس نے حاجیوں کا ایک قافلہ دیکھا جو ہر تیسرے سال مراکش سے روانہ ہو کر افریقہ، مصر اور یمن سے ہوتا ہوا مکّہ جاتا تھا۔ ابن حمید اسی قافلہ میں شامل ہو گیا۔

بلانکا کی زندگی پہلے تو خطرے میں تھی لیکن آہستہ آہستہ اُسے صحت ہو گئی۔ لاترک اپنے وعدے پر قائم رہا۔ اس نے ساتناتی کی بیٹی سے اپنی محبت کے باب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بلانکا ہر سال ملاغہ کی پہاڑیوں پر جا کر اپنے محبوب کا انتظار دیکھتی اور چٹانوں پر بیٹھ کر اپنی نظریں سمندر کی وسعتوں میں دوڑاتی رہتی کہ شاید کسی گوشے سے کوئی ایسا جہاز نمودار ہو جس پر ابن حمید سوار ہو کر آ رہا ہو لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔ بعض اوقات وہ الحمرا کے کھنڈروں میں اداس پھرتی رہتی لیکن نہ تو اسے کوئی شکایت تھی، نہ وہ روتی، نہ ابن حمید کا نام ہی زبان پر لاتی تھی۔ اگر کوئی اجنبی دیکھ پاتا تو اسے خوش و خرم خیال کرتا۔ اس کا باپ اسی غم میں گھل گھل کر مر گیا۔ دان کارلو اور لاترک ایک دست بدست جنگ میں ہلاک ہو گئے اور ابن حمید کے حشر کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔

تونس کے اس دروازے کے قریب جس میں سے قرطاجنہ کے کھنڈروں کی طرف جاتے ہیں ایک قبرستان ہے اس کے ایک گوشے میں کھجور کے درخت کے نیچے ایک مزار ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آخری ابن سراج کا ہے۔ اس مزار میں کوئی بھی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ بالکل معمولی سی قبر ہے۔ مُور ہی رسم و رواج کے مطابق اس مزار کی چھت پتھر کی ایک ہی سِل پر مشتمل ہے۔ امتداد زمانہ سے پتھر میں ایک نشیب سا پیدا ہو گیا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا ہے اور چلچلاتی دھوپ میں چڑیاں اس سے اپنی پیاس بجھاتی ہیں ——!!

"فیشن ۱۹۴۳ء کی بہترین فلم ہے" (فلم انڈیا بمبئی)

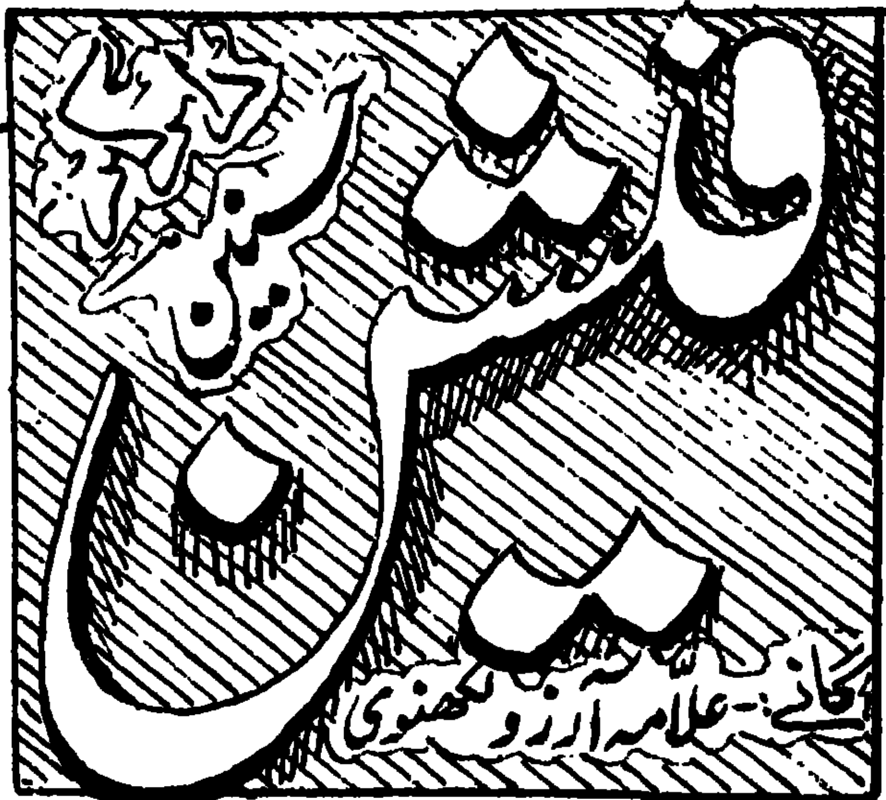
ڈائرکٹر حسنین کی جدت طرازیوں کا بیمثال کارنامہ

فضلی برادران لمیٹڈ کی وہ کامیاب ترین تصویر جس نے ہندوستان بھر سے خراج تحسین حاصل کیا ہے

شگفتہ مکالمے۔ دلفریب گانے۔ اسلامی کہانی۔ بلند پایہ اداکاری۔ بہترین ڈائرکشن

اداکاران

سردار اختر۔ چندر موہن۔ سیتا دیوی۔ بھوداڈوانی۔ کامتا پرشاد۔ نظیر کاشمیری



عصمت

سرعت کے ساتھ تیار ہو رہا ہے۔ اداکاران:- مہتاب۔ نرگس۔ نندریکھا۔ غوری۔ بھوداڈوانی۔ پرتما دیوی۔ ارشاد۔ عباس

فضلی برادران لمیٹڈ ونسنٹ اسکوائر۔ دادر۔ بمبئی

"گوری کی بے عزتی ....
بھگوان کا ایمان ہے"

پروڈیوسر آر سی تلواڑ

کا تازہ فلم

شکریہ

سندر — امر — منورما

ر م و ل ا

گیانی — روپ لیکھا

نیج — ظہور شاہ

پنجاب میں [illegible]

موسیقی:- چشتی - مکالمے:- حکیم احمد شجاع - ہدایات:- ریلی - گانے:- چشتی اور [illegible]

تقسیم:- ورلڈ پیراماؤنٹ پکچرز
فیمس پکچرز لمیٹڈ

...کی کوندیں شاہپارے

...کی بہترین رومان آفریں
...بیہ تصویر



ZAB...

...کرشلیا۔ ڈیکینٹ
...و تلا وغیرہ

بہترین سینما ہاں میں
...د دکھایا جائیگا۔

...یہ کی حسین ترین ساحرہ

ولا

...ڈکشنز کے آئیندہ شاہکار میں

جلد آرہی ہے

ڈائرکٹر جینت ڈیسائی

... بنرجی

آپ کے شہر میں بہت جلد دکھایا جائے گا

میسرز واڈیا پیرامونٹ پکچرز - لاہور - دہلی

~~1. Mr. E.H.T. ...ara.~~
1. S.S. Fateh Singh. 24/6
~~3. " K.D. Gupta.~~
~~4. " Gujendra Singh.~~
2. Mr. Gopala Ram. 12/7
~~6. " Ram ...ishnun.~~
3. " Pritam Singh.
4. " S. P. Luhna.
5. " ~~N... Garg.~~
6. Miss S. Meher. 16/7
~~11. Mr. ... Farooquian.~~
~~12. " S. ... Chatterji.~~
~~13. " N... Mukerji.~~
7. " Raman Ali. 29/6
~~15. " M.C.T. Chari.~~
~~16. " B.L. Sharma.~~
8. " Abdulla Jan. 8/7
~~17. " V... Rao.~~
~~19. " C. L. Suri.~~
~~20. " Y.A. Khan.~~

Allowed for days.

نامہ نگار کے قلم سے

پردۂ سیمیں

فلیش

فضلی برادرز کی مسلم سوشل فلم "فیشن" جسے جدت پسند ڈائرکٹر حسنین نے ڈائرکٹ کیا ہے ہر جگہ کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ لاہور کے جونت سنیما میں یہ فلم عرصہ ایک ماہ سے دکھائی جا رہی ہے۔ "فیشن" میں خورشید سردار اختر۔ ستیا دیوی۔ بدھوا ایڈوانی نے کام کیا ہے۔ لاہور میں بھی یہ فلم کافی کامیاب رہی ہے۔ حالانکہ اس کے ڈسٹری بیوٹر نے پبلک کو آگاہ کرنے کے لئے کوئی طریقہ بھی اختیار نہیں کیا۔ فضلی برادرز کے دوسرے ڈائرکٹر مسٹر فضلی آج کل "عصمت" نام فلم تیار کر رہے ہیں مسٹر قیصر عثمانی فضلی کی پکچروں کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں

نشاط

نشاط تھیٹرز کی معرفت "برنگیا" آج کل ہر جگہ کامیابی سے چل رہی ہے۔ چترا کی آنے والی پکچر "بھگانے" جس کو ڈائرکٹر نندہ تیار کر رہے ہیں نشاط کی معرفت ریلیز ہوگی۔

منروا مووی ٹون

منروا مووی ٹون ہندوستان کی کامیاب کمپنیوں میں سے ہے۔ مسٹر سہراب مودی اس کمپنی کے مالک بھی ہیں اور ہدایت کار بھی۔ منروا اس وقت تک ایک درجن کامیاب فلمیں مارکیٹ میں پیش کر چکی ہے۔ پرتھوی ولبھ آج کل رٹز میں کامیاب چل رہی ہے۔ اس کمپنی کے دو شاہکار "پتھروں کا سوداگر" اور "ڈاکٹر کمار" زیر تکمیل ہیں۔ ان دونوں میں کامیاب اداکاروں نے کام کیا ہے۔ ڈائرکٹر سہراب بہت جلد "غالب" کی تیاری میں مصروف ہو جائیں گے۔ مسٹر مودی نے اس فلم کے بنانے کیلئے کافی مصالحہ جمع کر لیا ہے

پنچولی آرٹ پکچر

پنچولی آرٹ پکچرز میں آج کل تین فلمیں تیار ہو رہی ہیں۔ "داسی" کو

ڈائرکٹر سپرن بوس مکمل کر چکے ہیں۔ "کیسے کہوں" کو ڈائرکٹر موتی گڈوانی شروع کرنے والے ہیں۔ تیسری فلم "شیریں فرہاد" ہے جس کی تیاری پر دس لاکھ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ اس فلم کو مشہور ہدایت کار پرہلاد دت تیار کر رہے ہیں۔ "شیریں فرہاد" تقریباً نصف مکمل ہو چکی ہے۔ جن لوگوں نے اس فلم کی شوٹنگ دیکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ "شیریں فرہاد" پنجاب کا سر بلند کرے گی۔ ڈائرکٹر پرہلاد دت اس فلم میں مشہور کیریکٹر ایکٹر غلام محمد کو نئے رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ مسٹر غلام محمد کے علاوہ راگنی۔ جینت۔ گیانی نفیس بیگم۔ ظہور شاہ بھی اس فلم میں شامل ہیں۔ آج کل ڈائرکٹر پرہلاد دت اس فلم کے لئے عالیشان محل کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ ہندوستان کے اس ہونہار نوجوان کو کامیابی نصیب ہو۔

کاردار پروڈکشن

کاردار پروڈکشن بمبئی کا ایک ترقی پسند فلمی ادارہ ہے جو اس سے پہلے "شاردا" اور "نمستے" نام کامیاب فلمیں پیش کر چکا ہے۔ آج کل اس کمپنی کے ڈائرکٹر اے آر کاردار تین بہت بڑی فلمیں بنانے والے ہیں۔ "شاہجہان"۔ "پہلے آپ"۔ "راجپوت" یہ تینوں فلمیں کاردار سٹوڈیو بمبئی میں تیار ہوں گی۔ ان تینوں فلموں کو ڈائرکٹر کاردار خود ڈائرکٹ کریں گے۔

سوال

ستارہ فلمز لاہور کا ایک بہت بڑا فلمی ادارہ ہے۔ اس کمپنی کی معرفت پربھات فلم کمپنی کے علاوہ راجہ مووی ٹون یونین پکچرز وغیرہ اداروں کی فلمیں تقسیم ہوتی ہیں۔ گیتا نجلی مووی ٹون کی سوشل پکچر "سوال" مقامی کراؤن میں ستارہ کی معرفت چل رہی ہے۔ "سوال" میں ممتاز شانتی اور الہاس شامل ہیں۔ اس فلم کے گیت ولی صاحب نے لکھے ہیں۔ اداکاروں میں ممتاز شانتی۔ الہاس

...کامیاب ہے — معاشرتی اور فلمی ہے - رزولا کا پارٹ علی الخصوص قابل توجہ ہے

گل بلوچ

ستارہ پروڈکشن لاہور کی اولین پیش کش "پاپی" ہر جگہ کامیابی سے چل رہی ہے - ستارہ اور زمان پروڈکشن دونوں ادارے مل کر "گل بلوچ" نام پنجابی فلم بنا رہے ہیں - اس فلم کو ڈائرکٹر گل زمان تیار کر رہے ہیں - اداکاروں کی صف میں گل زمان مجنوں - اجل - سلمیٰ - منورما سلطانہ شامل ہیں - یہ فلم بہت جلد ریلیز ہو جائے گی -

واڈیا پیرامونٹ

جینت ڈیسائی پروڈکشن کی مشہور فلم "بھگت راج" آج کل تمام اسٹیشنوں پر ریکارڈ توڑ بزنس کر رہی ہے - اس کے علاوہ جینت کی دوسری پیکش "زبان" بھی یوپی میں ریلیز ہو چکی ہے - "زبان" میں مشہور اداکاروں نے کام کیا ہے - اس کے علاوہ ڈائرکٹر جینت ڈیسائی کی آنے والی فلم منوما بھی اس کمپنی کی معرفت ریلیز ہو گی - جینت ڈیسائی ہندوستان کے کامیاب ہدایت کار ہیں - واڈیا پیرامونٹ ایک نیک نام ادارہ ہے دونوں کا اشتراک نیک فال ہے -

سنت رام پکچرز کا قیام

پنجاب کے مشہور بینکرز لالہ سنت رام نے سنت رام پکچرز کے نام سے ایک فلمی ادارہ قائم کیا ہے - اس کمپنی کی معرفت چلتی دنیا کلیانی "ایکٹرس کیوں بنی" کے علاوہ اور بڑے بڑے فلمی اداروں کی فلمیں تقسیم ہوں گی - مسٹر ہنسراج کیشپ اور مسٹر مہتہ آج کل بمبئی تشریف لے گئے ہیں - تاکہ بہترین فلمیں حاصل کی جائیں - یہ کمپنی بہت جلد ایک ہنگامہ خیز اعلان کرنے والی ہے - ہماری دلی دعا ہے کہ یہ کمپنی ترقی کرے - سنسکرہ پکچرز کی فلم چلتی دنیا کی پبلسٹی دفتر میں پہنچ چکی ہے - یہ فلم بہت جلد بڑے بڑے شہروں میں ریلیز ہو گی -

شکریہ

"آرسی" تلواڑ کی فلم "شکریہ" پیلس لاہور میں ہجوم آور ثابت ہو رہی ہے - "شکریہ" ایک روشن طربیہ ہے - جس کے جدید ترین میوزک کی تانیں شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہیں موضوع

پنچھی

این آئی سٹوڈیوز کے نغمہ بار شاہکار "پنچھی" کا فلمی دنیا میں جس اشتیاق کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے - ہندوستان کی فلمی تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں - لیکن ناظم مبنوں کو اب مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا - ایک دو دن میں پنچھی سنسر کے سپرد کر دیا جائے گا - اور اس کے بعد نشاط لاہور کے موجودہ پروگرام کے خاتمہ کا انتظار کرنا پڑے گا - ڈائرکٹ برکت مہرہ نے ڈراما - مزاح موسیقی اور جذبات نگاری میں اپنے کمال فن کے جوہر نہایت فراخدلی سے دکھائے ہیں - اداکاروں میں منورما - مسری شیودا سانی اجل سلمیٰ - سلیم رضا اور غلام قادر ہر ایک نے پنچھی کو اپنی فلمی زندگی کا بہترین کارنامہ بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے اور امید ہے کہ پنچھی صحیح معنوں میں توقعات کے مطابق ہوگا -

چمپا

چمپا کی شوٹنگ کے ساتھ ہی ڈائرکٹر برکت مہرہ اور ڈائرکٹر روپ شوری اس کے گانوں کی ریکارڈنگ میں دن رات ایک کر رہے ہیں - اور اس وقت تک نصف درجن گانے مکمل ہو چکے ہیں - جن میں سے ہر ایک سحر انگیز ہے - اداکاروں میں مجنوں - منورما - مسری شیودا سانی - آشا - سلیم رضا - سلمیٰ - غلام قادر - ظہور شاہ - نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - چمپا کے مکالمے مسٹر راما نند ساگر نے لکھے ہیں -

کومل

شوری پکچرز کی پنجابی فلم "کومل" نمائش کی منتظر ہے - انتظام کیا جا رہا ہے کہ لاہور - دہلی اور پشاور میں بیک وقت نمائش کے لیے پیش کیا جائے - "منگتی" کی طرح جہاں کومل میں ڈراما انتہائی عروج پر ہے - وہاں نور کے نغمے بھی منگتی کی مانند روح پرور ہیں اور نمائش پر یقیناً عوام کی زبانوں پر ہوں گے

نقاشِ فطرت حضرت ایم - اسلم کے پانچ غیر فانی تازہ شاہکار

بیتی باتیں ایک پاکدامن تعلیم یافتہ حسین دوشیزہ کے مصائب، عزائم اور پاکیزہ محبت کا بے حد دلچسپ رومان ہے۔ اردو ادب کے اس شاہکار میں حضرت ایم۔ اسلم کا جادو رقم قلم کبھی آپ کو مصائب کے سنگلاخ میدانوں میں لے جائے گا۔ کبھی امید کے چمن زاروں کی بہار دکھائے گا۔ کہیں نامہربان باپ کی سرد مہریاں آپ کے دل پر چرکے لگائیں گی۔ اور کہیں ساس کی تلخ زبانیاں آپ کا دل دکھائیں گی۔ کہیں سہیلیوں کے راز و نیاز کی باتیں آپ کے لئے تفنن کا سامان مہیا کریں گی اور کہیں دو پاکیزہ دلوں کی فریاد آپ کو تڑپا دے گی۔ حجم ۲۵۲ صفحات۔ مجلد معہ رنگا رنگ باصرہ نواز گردپوش قیمت ۳ روپے آٹھ آنے۔

رنگین نظارے دس تازہ بتازہ غیر مطبوعہ افسانوں کا دلفریب مجموعہ۔ یہ افسانے ہماری معاشرت کے مختلف مناظر پیش کرتے ہیں۔ بعض اتنے دلکش کہ سو بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہ ہو اور بعض اتنے گھناونے کہ پڑھنے کے ساتھ ہی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ مجموعہ حضرت ایم اسلم کے کمالات کا نچوڑ اور شاہکار ہے جس نے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دئے ہیں۔ حجم تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ مجلد معہ خوشرنگ گردپوش قیمت چار روپے۔

شام و سحر ایک امیر خاندان کے عروج و زوال کی دلپذیر داستان حسن و الفت کا دلچسپ رومان۔ جوانی کی بے راہ روی کا عبرتناک قصہ۔ ماں کی ممتا کی سبق آموز کہانی اور ایک پیشہ ور کی جفاکاریوں کا خوفناک افسانہ۔ بالکل تازہ شاہکار۔ حجم ۵۰۰ صفحات مجلد معہ مصور گردپوش جس کو دیکھ کر آپ کھو جائیں گے قیمت ۴ روپے آٹھ آنے۔

شمسہ مغربی تمدن اور تہذیب نو کی ایک فریب خوردہ تعلیم یافتہ حسینہ کی خود نوشت سوانح حیات۔ رنگین مناظر رنگین واقعات۔ رنگین ماحول اور جدید رنگین طرز بیان۔ حجم ۵۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد معہ خوشرنگ گردپوش پانچ روپے

رقصِ بہار حسن و شباب کا دلفریب رومان۔ محبت اور ایثار کی تعجب خیز داستان جسے نقاشِ فطرت جناب ایم اسلم کے کلکِ نوبہار نے جذبات۔ محبت اور ایثار کے حسین رنگوں میں رنگ دیا ہے حجم ۴۲۵ صفحات مجلد معہ رنگا رنگ باصرہ نواز گردپوش قیمت چار روپے

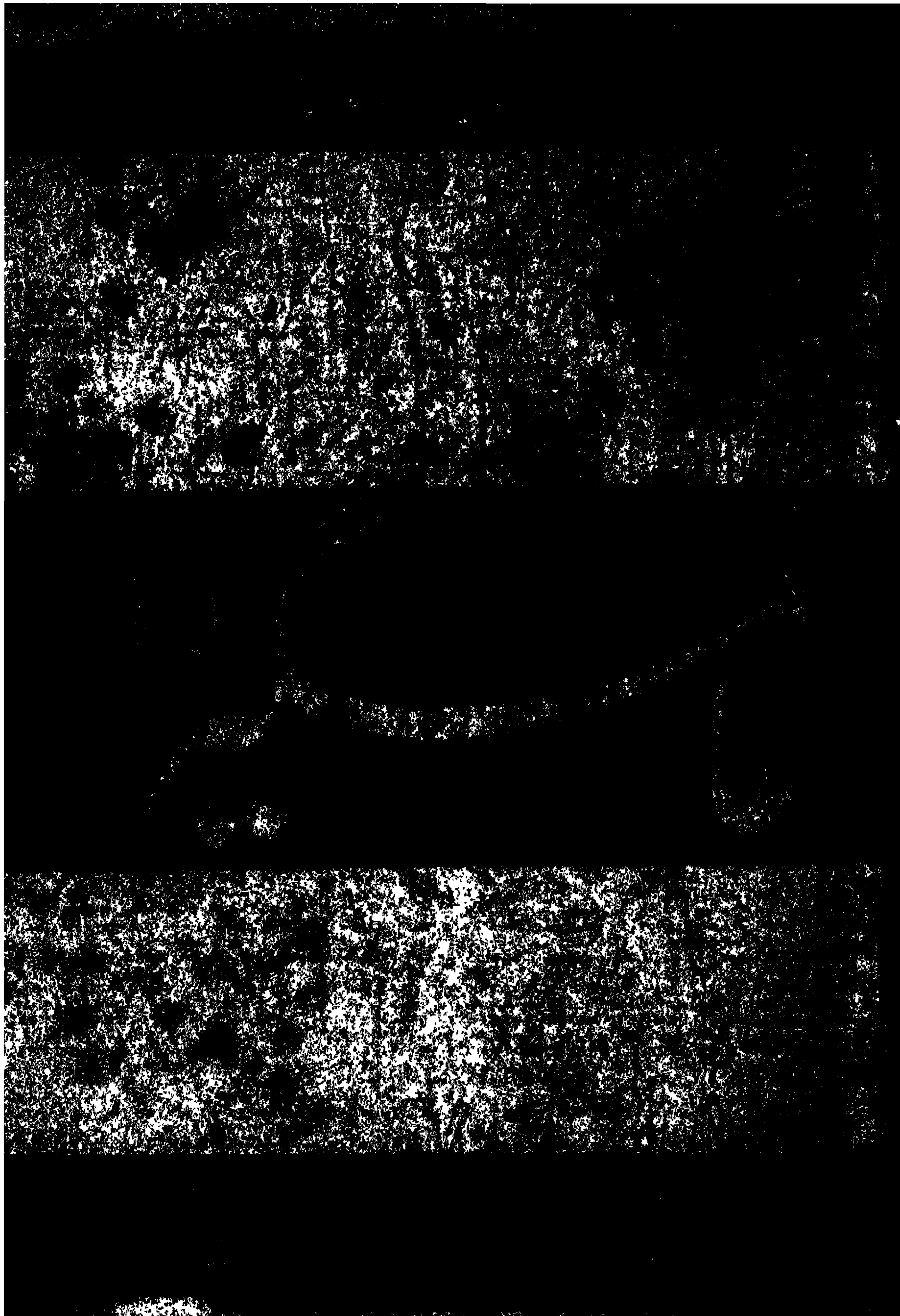
نوٹ:۔ "شمسہ" اور "رقص بہار" زیر طباعت ہیں۔ شائقین اپنی پہلی فرصت میں ان کی خریداری کے لئے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں۔

جناب ایم۔ اسلم کی دیگر تصانیف شرابی ۲ روپے آٹھ آنے آشرم ۲ روپے آٹھ آنے کوشلیا ایک روپیہ چار آنے

اشک و شرر جناب کوثر چاندپوری کے پرسوز و رقت انگیز اصلاحی افسانوں کا شاندار مجموعہ جس میں مظلوم، مقہور اور مغموم طبقہ کی زبردست نمائندگی کی گئی ہے۔ افسانے اس قدر دلچسپ ہیں کہ سو بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ حجم ۲۰۰ صفحات مجلد معہ باصرہ نواز گردپوش قیمت ۲ روپے ۱۲ آنے۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ

ناظم کتب خانہ دار البلاغ - محمد نگر - میو روڈ لاہور



اسلام کا ماضی و مستقبل

اسلامی دنیا کی ... ایک ... اور ... کتاب جس میں ... کی تاریخ ... سیاسی ... صفحات قیمت

نادر شاہ اور ستارا

نادر شاہ افشار کی ... ایک تاریخی ناول ... ایک ... تاریخ ... صفحات قیمت

ربیعہ

ترکی کی ماہ ناز ادیبہ خالدہ خانم کا ... انقلابی ناول جس کا ... صفحات قیمت

تاریخی رومان

ہندوستان کے چند مشہور ... تاریخی افسانے جس کا ہر افسانہ تاریخی شاہکار تسلیم کیا گیا ہے ... ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت

زرتشت اعظم

وہ بلند پایہ تاریخی ناول جس کی ہر سطر ... اور ... کس طرح ... صفحات قیمت

تاریخی افسانے

خونیں تحریک

... ضخامت ... صفحات قیمت

روسی کی سیہ کاریاں

... جان ... آپ بیتی ... داستان ... صفحات قیمت

کتاب التقدیر

علامہ ابن قیم ... کتاب کا اردو ترجمہ ... تقدیر کے مسئلے پر ... صفحات قیمت

موتیوں کا درخت

مصر کے مشہور ... تاریخی ناول ... دوسرا ایڈیشن ... صفحات قیمت

ماہ و انجم

... انسانی جذبات کی ... صفحات قیمت

سفرنامہ ...

کا مدیر رسالہ سلور جوبلی بے لاگ رائے

پرل کلوریم آئی ڈراپ (رجسٹرڈ)

ڈاکٹر این آر شرما کا نام نامی ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ آپ نے آنکھوں کی دوا پرل کلوریم آئی ڈراپ ایجاد کر کے ... احسان کیا ہے۔ پندرہ سولہ سترہ برس کے قلیل عرصہ میں لاکھوں مریضان چشم کو شفا بخش چکی ہے۔ ایسے ایسے ... رنگ رکھتی۔ جن آنکھوں کو بہترین اور ماہرین ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دیا تھا وہ اس کے چند روز ... کے ایک ہی دوا سوائے پیدائشی اندھوں کے آنکھوں کی تمام امراض مثلاً موتیا بند ہر قسم کا ... آنکھ کا دُھندلا یا ہو جانا۔ پتلی کا پھٹ جانا۔ آنکھ کا چوٹ سے ضائع ہو جانا۔ ناخونہ جالا ... دھند۔ ... عینک لگانے کی عادت۔ ڈھلکا۔ گُہیری۔ آنکھوں سے پانی بہنا ... کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور بوڑھے بچے تمام ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ... مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی ایجاد کر کے بنی نوع انسان کو مستفید کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ہر روز ... پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کے مفید ہونے کے متعلق بیحد تعریفیں لکھی ہوتی ہیں ... مریضوں کی آنکھیں ... ڈاکٹر صاحب باقی تمام امراض میں بھی پوری پوری دسترس رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پرل فارمیسی بھی جاری کر رکھی ہے جس کی ... پرل کمپاؤنڈ ... رجسٹرڈ ... رجسٹرڈ وغیرہ وغیرہ کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ... ڈاکٹر صاحب بہت مدت تک دکھی دنیا کو سکھ کا سانس دلاتے رہیں۔ (ریویو ...)

قیمت: ... شیشی بارہ روپے بارہ آنے۔ نارمل پوٹینسی بڑی شیشی پانچ روپے چار آنے چھوٹی شیشی ... بارہ آنے ... علاوہ محصول ڈاک و خرچ پیکنگ۔ پرچہ ترکیب استعمال ہر زبان میں ہمراہ ہوگا۔

... پوٹینسی کی دوا ... کے لئے نارمل پوٹینسی سے صرف ایک تہائی وقت لیتی ہے یعنی تین گنا زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے ... منگوانے کے لئے ... بذریعہ منی آرڈر آنے لازمی ہے۔

... قیمت ... آنکھوں کو دھو کر ... دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک و خرچ پیکنگ۔

... لوشن ... آنکھوں کو دھونے کے لئے دنیا بھر میں اس سے بڑھ کر کوئی لوشن نہیں ایک شیشی کئی مہینوں کے لئے کافی ہے۔ قیمت ... علاوہ محصول ڈاک و خرچ پیکنگ ہر جگہ ترکیب استعمال ...

پرل ... کمپنی رجسٹرڈ۔ کوٹھی نمبر ۹ ... ایل ...

آپ کی پسند کی کتابیں

آفتاب تازہ ——— احسان بی۔ اے

اسلامی تاریخ کے چار ایمان افروز اور روح پرور واقعات جدید افسانوی رنگ میں ——— مقدس مسافر، جادۂ نو، قیدی، اذان، ہر افسانہ اسلامی تاریخ کا ایک مکمل باب ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

رزم و بزم ——— شمس العلما تاجور نجیب آبادی

حریت افروز افسانے۔ ہر کہانی ایثار و قربانی اور آزادی و حریت کا سبق دیتی ہے قیمت بلا جلد دس آنے۔

قلوبطرہ کی ایک رات ——— شبلی، بی۔ کام

حضرت شبلی بی کام کی مترجمانہ صلاحیت کا اعتراف ہندوستان کے بڑے سے بڑے نقاد کو بھی ہے۔ ان کے تراجم کا یہ تازہ ترین مجموعہ اردو ادب میں امتیازی شان کا مستحق ہے۔ ہر افسانہ آپ کو کیف و رومان کی رنگین و نغمہ بار فضاؤں میں پہنچا دے گا۔ قیمت دو روپے چار آنے۔

کھیل ——— خدیجہ مستور

ایک عورت کے جذبات ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ خدیجہ مستور نے نسائی فطرت کے تمام گوشوں پر ماہرانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے ان کے افسانے آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔ قیمت دو روپے

چرکے ——— ہاجرہ مسرور

ہاجرہ مسرور کا شمار ترقی پسند افسانہ نویس خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کا آرٹ مکمل ہے ان کا ہر افسانہ نشتر بن کر آپ کے دل میں اتر جائے گا قیمت دو روپے چار آنے

نئی کروٹیں ——— مرتبہ: قمر تسکین

زمانہ کے ساتھ ساتھ اردو ادب نے بھی ایک نئی کروٹ بدلی ہے۔ اس مجموعہ میں مشہور ترین لکھنے والوں کے ایسے شاہکار شامل کئے گئے ہیں۔ جو نئے تقاضوں اور نئے رجحانات کے آئینہ دار ہیں قیمت ۲؎

معاشقے ——— قمر اجنالوی

محبت کرنا انسان کا فطری جذبہ ہے۔ محبت اندھی ہوتی ہے محبت حاکم و محکوم کے درمیان امتیاز نہیں کرتی۔ محبت تاج و تخت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اس قسم کی عاشقانہ داستانیں اس مجموعہ میں خود فراموشی کی کیفیت

داستانیں ——— قمر اجنالوی

قمر اجنالوی کی لکھی ہوئی معرکہ آرا داستانیں۔ جن کے ایک ایک لفظ میں تاریخی شان و شوکت اور حسن و عشق کی سرمستیاں کروٹیں لے رہی ہیں ہر داستان کو آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ قیمت ۲؎

دنیا کے تین بہترین ناول ——— احسان بی اے

ایک جلد میں تین بہترین ناول۔ لکھنے والوں میں سامرسٹ ماہم اور اینڈرے گائیڈ ایسے ماہرین فن شامل ہیں۔ ترجمہ آسان اور دلنشین ہے قیمت تین روپے۔

باندی ——— انتصار حسین نیومنی

سماج کے ظلم و ستم کے خلاف ایک باندی کی آواز۔ دلچسپ ناول جس کے ہر باب سے زندگی کے تلخ حقائق جھانک رہے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

راہی ——— انتصار حسین نیومنی

ایک راہی کی داستان جس کو قدرت نے امیر و غریب کی تفریق مٹانے کے لئے پیدا کیا تھا۔ ولولہ انگیز ناولٹ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

نئی فضائیں ——— مرتبہ۔ قمر تسکین

صف اول کے شہرت یافتہ افسانہ نویسوں کے شاہکار ہر افسانہ آپ کو زندگی کے نئے افق سے ہمکنار کرے گا ۲؎

پہلا گناہ۔ ٹالسٹائی کے دو موثر ترین ڈرامے۔ ۱۲؎

ملنے کا پتہ: —— عالمگیر بکڈپو۔ سید مٹھا بازار لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۔۔ نمبر ۵

فہرست مندرجات اکتوبر ۱۹۴۴ء

علمی و ادبی مضامین

افسانے اور ڈرامے

منظومات

حافظ محمد عالم ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ادارۂ تحریر

ملاحظات

زیرِ نظر شمارہ کا آغاز مجدد الف ثانی کے ایک اہم ترین مکتوب سے ہوتا ہے ۔ اس مراسلہ میں آپ نے اس عام غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے کہ "رحمٰن" اور "رام" در اصل ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں لیکن مجدد صاحب غالباً تفصیلات کا ذکر فرما رہے ہیں ورنہ اصل کے ایک ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟

"ندا و اکار ردِ عمل" مولانا سید اختر علی تلہری کا ایک فاضلانہ مقالہ ہے جس میں اصولِ ادب کی روشنی میں اُن دلائل کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے سہارے "ترقی پسندانہ ادب" کی عمارت ایستادہ کی گئی ہے ۔ مولانا کا طرزِ استدلال (دورِ بیان اور وسیع مطالعہ لائقِ داد ہے ۔ آپ نے "عالمگیر" کی مستقل قلمی معاونت کا وعدہ فرمایا ہے ۔ گزشتہ پرچے میں اعلان کیا گیا تھا کہ "امیر مینائی کے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں اب کچھ بھی شائع نہ کیا جائے گا ۔ لیکن مولانا حامد حسن قادری نے ایک نئے گوشے پر محققانہ روشنی ڈالی ہے اس لئے مجبوراً اپنے اعلان کی خلاف ورزی کرنا پڑی ۔ امید ہے محققین ادب اس نئے نکتہ پر غور فرمائیں گے ۔

شیر محمد اختر نئے لکھنے والوں میں امتیازی شان رکھتے ہیں ۔ اس ماہ سے وہ بھی محفلِ عالمگیر میں شامل ہو رہے ہیں ۔ "گلاب کا پھول" ان کا تازہ ترین شاہکار ہے جس میں ایک "نفسیاتی حقیقت" کو رنگین و دلآویز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے ۔ محمد امین شرقپوری نے غالباً کافی عرصے کے بعد ایک ایسا افسانہ لکھا ہے جو اردو ادب میں مستقل جگہ حاصل کر لے گا ۔ وہ خود ایک بیدار مغز فن کار ہیں ۔ اس لئے فن کار کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ان سے بہتر کوئی نہ کر سکتا تھا ۔ سید طالب علی نے بہت مدت کے بعد "عالمگیر" کو یاد فرمایا ہے ۔ ان کے ڈرامے (یا ناٹک) کی ٹکنیک اگرچہ پرانی ہے ۔ تاہم ماہرانہ انداز میں لکھا گیا ہے ۔ اس لئے ایک قابلِ قدر چیز ہے ۔ شفیق بانو نجیب آبادی نسائی زندگی کے مسائل پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالتی ہیں ۔ "دو چنگاریاں" ان کا ایک کامیاب افسانہ ہے ۔ مصطفیٰ المنفلوطی عہدِ جدید کے مصر کا ایک بہت بڑا افسانہ نویس ہے اور غالباً پہلا شخص ہے جو پابندِ شریعت ہونے کے باوجود ایک کامیاب ادیب ہے حافظ سید رشید احمد ارشد نے اس کے ایک ہیجان خیز افسانے کا ترجمہ پیش کیا ہے ۔ کمال احمد صدیقی ایک ہونہار لکھنے والے ہیں ۔ "کلرک" میں منشیانہ زندگی کا خاکہ کھینچا گیا ہے ۔

منظومات کا حصہ حسبِ معمول کامیاب ہے ۔ امید ہے مشاہیر شعرا کا تازہ کلام وجد آفریں ثابت ہوگا ۔

خاص نمبر ۱۹۴۵ء کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں ۔ کاغذ کی نایابی کے باوجود اسے ہر لحاظ سے کشش انگیز بنانے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ آئندہ اشاعت میں فہرست مندرجات کا اعلان کر دیا جائے گا ۔ جن حضرات نے ابھی تک اپنے مضامین ارسال نہیں فرمائے وہ بہت جلد توجہ فرمائیں ۔ نظمیں اور غزلیں کافی تعداد میں موصول ہو چکی ہیں ۔ اس لئے کوئی صاحب نظم یا غزل بھیجنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں ——

عالمگیر ماہِ نومبر ۱۹۴۴ء

۱ ۔ جنگ اور ادب	قیصی رامپوری
۲ ۔ سانحل ۔ ہندی کا ایک شاعر	حسن فراز
۳ ۔ ناک (افسانہ)	قمر اجنالوی
۴ ۔ احساس (فیچر)	طفیل ملک
۵ ۔ خوشبو (افسانہ)	سلطان داؤد
۶ ۔ بات ہی تو ہے (افسانہ)	ماجد حسن فریدی
۷ ۔ نطقِ ناطق	ناطق گلاوٹھوی
۸ ۔ غلامی	رونق دکنی
۹ ۔ نرگسِ مستانہ	شاہ عبدالمجید منظر

ان کے علاوہ مشاہیر شعرا کا تازہ کلام اور "عالمگیر" کی دوسری مستقل خصوصیات ۔

آج ہی سالانہ خریداری کے لئے فرمائش بھیجئے ۔ چندہ چھ روپے چار آنے (مع محصول ڈاک)

ادارۂ تحریر

اخبار و افکار

آل انڈیا ریڈیو کا بائیکاٹ

گزشتہ مہینے جے پور میں آل انڈیا ساہتیہ سمیلن کا ۳۲ واں اجلاس ہوا جس میں ہندی بولنے والے راشٹریوں نے دھوتیاں کس کس کر اور چوٹیاں لہرا لہرا کر حامیانِ اُردو کو کوسا اور اس مقدس زبان کے خلاف زہر اُگلا جو سر تیج بہادر سپرو کے الفاظ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک ترکہ ہے ہمیں اس اجلاس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنی بولی کے حق میں زبان کھولنے کی اجازت ہونی چاہئے لیکن ساہتیہ سمیلن نے ہندی کی حمایت میں صرف پروپیگنڈا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے دفاع کے لئے ایک ایسی زبان پر شرمناک حملے کئے ہیں جو اتحادِ ملّی کا واحد ذریعہ ہے۔ مثال کے طور پر اس قرارداد کو لیجئے جو آل انڈیا ریڈیو کے مقاطعہ سے متعلق ہے ہم آل انڈیا ریڈیو کی اُردو دشمنی کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں اور بسا اوقات ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جب اس محکمہ کی باگ ڈور سر سلطان احمد اور مسٹر احمد شاہ بخاری ایسے باذوق حضرات کے ہاتھ میں ہے تو اس محکمہ کی نشرگاہوں میں اُردو پر ہندی یا "ہندوستانی" کو مسلط کیوں کیا جا رہا ہے؟ لیکن ساہتیہ سمیلن کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ریڈیو کی نشریات میں جو تھوڑے بہت عام فہم الفاظ بولے جاتے ہیں انہیں بھی "اُردو زبان" سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایک اخباری اطلاع مظہر ہے کہ ساہتیہ سمیلن کے اجلاس میں دہلی کے ایک شخص امولک چند نے کہا: "اگر یہی ریڈیو کی زبان ہے تو ہمارے بچے اور استریاں اُردو سیکھ جائیں گی۔ آل انڈیا ریڈیو صبح آداب عرض سے شروع ہوتا ہے اور رات کو آداب عرض پر ختم ہوتا ہے"۔ مقرر غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ آداب عرض اسلامی طرزِ خطاب ہے حالانکہ مسلمانوں میں سلام علیک یا السلام علیکم مروّج ہے۔ آداب عرض تو خالص برادرانِ وطن کی اختراع ہے) اس کے بعد مقرر صاحب جلال میں آکر فرمانے لگے "ہندوؤ! انگاری تمہیں گنگا میں غسل کرانا چاہتا ہے اشنان نہیں! اُردو زبان میں امی جان، خالہ جان، آپا جان کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کسی شریف مسلم گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر تیج پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آپ رات دن ماحول کا لفظ سنتے ہیں یہ ہے کیا بلا؟ یہ عربی کے شبدوں سے بھارت ورش کی فضا کو بھرشٹ کر دیا گیا ہے"۔ امولک چند نے چند اُردو الفاظ کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا "یہ اعلان پھیلانے کی جگہ گھوشنا کا لفظ کیوں پیارا نہیں ہے؟" اس قسم کی واہی تباہی بکنے کے بعد یہ مشورہ پیش کیا گیا کہ آل انڈیا ریڈیو سے اس وقت تک کوئی معاہدہ نہ کیا جائے جب تک اسے خالص ہندی بولنے والا نہ بنا لیا جائے۔ ایک دیوی جی نے ستیہ گرہ کرنے اور ریڈیو کے بائیکاٹ کا مشورہ بھی دیا۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ساہتیہ سمیلن کی پیٹھ پر سر میرزا محمد اسماعیل (وزیراعظم جے پور) کا نرم و نازک ہاتھ ہے اور اسی وجہ سے یہ لنگوٹی میں پھانگ کھیلا جا رہا ہے لیکن ہم مسٹر احمد شاہ بخاری اور سر سلطان احمد سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ہم ہمیشہ آل انڈیا ریڈیو کے ارباب بست و کشاد کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اُردو چونکہ ہندوستان کی واحد مشترک زبان ہے اس لئے اسی کو ذریعۂ اظہار بنانا چاہئے لیکن وہ تو "رقیب" کی نازبرداری میں اس درجہ مصروف ہیں کہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ آخر انجام کیا ہوا؟ "گئے دونوں جہاں سے"۔ کاش وہ اب بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرثانی کریں اور "دورنگی" چھوڑ دیں کیونکہ اس کا نتیجہ بہت زیادہ عبرت انگیز ہوتا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مسٹر آمری جیسا وطن دشمن ہندوستانی فوجوں سے مخاطب ہونے کیلئے اُردو ہی کو ذریعۂ اظہار بناتا ہے اور جب امریکی و برطانی فوجیں ہندوستان آکر اسی زبان کو سیکھنا ضروری خیال کرتی ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر آل انڈیا ریڈیو ہی کو ایک علیحدہ زبان وضع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟

کاش وہ اس مسئلہ پر ہوش مندانہ تدبر کی روشنی میں غور کریں ورنہ اُن کو سوچ لینا چاہئے کہ جس طرح ساہتیہ سمیلن والے ریڈیو کے بائیکاٹ کی قرارداد منظور کر سکتے ہیں اسی طرح کل کلاں اُردو کے حامی بھی اس سے کہیں زیادہ مؤثر قدم اٹھانے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

غلام دستگیر نامی

مجدد الف ثانی کا ایک مکتوب

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح (متوفی ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ) کو اللہ تعالٰی نے احیاء دین حقہ کے لئے پیدا کیا اور آپ نے مسلمانوں میں غلبۂ مشرکین کی وجہ سے پیدا شدہ فتنوں کا استیصال فرمایا۔ آپ کے عقیدتمندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ جن میں بڑے بڑے امرا اور وزرا بھی شامل تھے۔ انہی کے ذریعہ آپ نے اکبر و جہانگیر کے عہد کے غیر اسلامی رسم و رواج کی بیخکنی کرائی۔ آپ کے مکتوبات پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کس خلوص اور دیانت سے اکابر سلطنت کو گرویدہ بنا کر شریعت اسلامیہ کی ترویج اور اسلام کو سربلند کرنے کی کوشش فرمائی۔ کئی سمجھدار ہندو بھی آپ کے معتقد تھے ان میں سے ایک ہردے رام تھا۔ اس کی طرف آپ نے جو مکتوب ارسال فرمایا وہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آپ کو ہندوؤں کے عقائد و اعمال کی اصلاح بھی کس قدر مرغوب تھی۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اسلام کی روشنی سے مستنیر نہ ہوں۔ ہردے رام کے خطوں کے جواب میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ کے دونوں خط پہنچے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آپ کو کس قدر فقرا کی محبت اور اس بزرگ گروہ سے کس قدر التفات ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ امابعد ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارا تمہارا بلکہ اہل جہاں کا یعنی آسمان و زمین اور اعلیٰ و اسفل والوں کا پروردگار صرف ایک ہی ہے۔ وہ بےچون و بےچگوں ہے۔ شبہ و مانند سے منزہ اور شکل و مثال سے مبرا ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ کوئی اس کا ہمسر و مثل نہیں۔ اتحاد و حلول کی آمیزش سے پاک ہے اور کمون و بروز یعنی پوشیدہ ہونے اور ظاہر ہونے کا گمان اس جناب پاک کے حق میں قبیح ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے بری ہے کیونکہ زمان و مکان اسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا سب قسم کا خیر و کمال اس کی ذات میں ثابت ہے اور وہ نقص و زوال سے مبرا ہے پس عبادت و پرستش کے لائق وہی حق سبحانہ تعالیٰ ہے۔

رام و کرشن وغیرہ جو ہندوؤں کے معبود ہیں اس کی ادنیٰ مخلوقات میں سے ہیں۔ وہ ماں باپ سے پیدا ہوئے۔ رام جسرتھ کا بیٹا، لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے جو اپنی بیوی کو نگاہ میں نہیں رکھ سکا وہ دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے عقل و اندیش سے کام لینا چاہیئے اور ان کی تقلید پر چلنا نہیں چاہیئے۔ بڑی شرم کی بات ہے کہ تمام جہانوں کے پروردگار کو رام یا کرشن کے نام سے یاد کریں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عظیم الشان بادشاہ کو کمین خاکروب کے نام سے پکارے۔ رام اور رحمٰن کو

ایک جاننا بڑی بیوقوفی ہے۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا اور بیچون بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا۔

رام اور کرشن کے پیدا ہونے سے پہلے پروردگار عالم کو رام اور کرشن کوئی نہیں کہتا تھا۔ ان کے پیدا ہونے کے بعد کیا ہو گیا کہ رام و کرشن کے نام کو حق تعالیٰ پر اطلاق کرنے لگے اور ان کی یاد کو پروردگار عالم کی یاد جاننے لگے۔ یہ بات بالکل فضول ہے۔

ہمارے پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام جو ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب گزرے ہیں سب نے خلقت کو خالق کی عبادت کرنے کی ترغیب دی ہے اور غیر کی عبادت سے منع فرمایا ہے اور اپنے آپ کو بندہ اور عاجز جان کر اس کی ہیبت و عظمت سے ڈراتے اور کانپتے رہے مگر ہندوؤں کے معبودوں نے خلقت کو اپنی عبادت کی ترغیب دی اور اپنے آپ کو معبود سمجھا۔ اگرچہ پروردگار کے قائل ہیں لیکن اپنے آپ میں اس کا حلول ثابت کیا اور اسی وجہ سے خلقت کو اپنی عبادت کی طرف بلاتے اور اپنے آپ کو معبود کہلاتے ہیں اور بے کھٹکے محرمات میں پڑے ہیں۔ اس خیال سے کہ معبود کسی چیز سے ممنوع نہیں اپنی خلقت میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ اس قسم کے فاسد اور بیہودہ خیالات بہت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہو گئے اور اوروں کو بھی گمراہ کر دیا۔ برخلاف پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کہ انہوں نے جن باتوں سے مخلوقات کو منع کیا ہے ان سے اپنے آپ کو بھی پورے اور کامل طور پر باز رکھا ہے۔

اور یہ پیغمبر ہمیشہ اپنے آپ کو انسانوں کی طرح انسان ہی کہتے رہے ہیں۔

۶ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا"

(مکتوبات جلد اوّل)

طالوت

کیا غرض؟

نام و نشاں جو مٹ گیا نام و نشاں سے کیا غرض
عشق ہے لامکاں پسند اس کو مکاں سے کیا غرض

لوثِ ریا سے پاک ہے میرا خلوصِ عشق جب
خلق کا اعتبار کیا ان کے گماں سے کیا غرض

ذوقِ نظر کے سامنے نقش و نگار بے اثر
طرحِ طلب کی کیا طلب نقش و نشاں سے کیا غرض

جاہ و حشم کا ذکر کیا محفلِ جسم کی فکر کیا
جوشِ جنوں میں ہمنشیں عیش و جہاں سے کیا غرض

میرا خدا ہے میرے ساتھ مجھ کو ہو خوفِ غیر کیا
مجھ کو جہاں سے واسطہ مجھ کو جہاں سے کیا غرض

صبح و مسا سفر ہو جب فرصتِ کشمکش کہاں
میں ہوں نسیم بے نشاں مجھ کو نشاں سے کیا غرض

ماہر القادری

قالِ رسولؐ

مری نگاہ میں ہیں سب مسائلِ نظری
یہ ذہن و فکر کی جدت ہے وہ طلسمِ قدیم

ہوا کے دوش پہ جاتے ہوئے پیام و سلام
یہ برق و باد کی قوت کا عالمِ تنظیم

یہ انکشاف کی دنیا یہ تجربات کا دور
کہ ذرہ ذرہ ہے محوِ تجزی و تقسیم

یہ نفسیات کی تحلیل فکر کی پرواز
محلِ غور ہے ترکیبِ احسنِ تقویم

فضا میں رقص کناں ہے دھواں مشینوں کا
الٹتی جاتی ہے سائنس پردہ ہائے حریم

نئے نئے یہ اصولِ سیاست و تہذیب
معاشرت کے مسائل کی جدتِ تقسیم

مگر یہ فلسفہ روحِ یقیں سے خالی ہے
نہ اس میں سوزِ کلیمی نہ جذبِ ابراہیم

سراب کو یہ سمجھتے ہیں موجۂ طوفاں
ہے ذرہ ان کی نظر میں متاعِ ہفت اقلیم

پیامِ ختمِ رسل کی خبر نہیں ان کو
کہ جو ہے رشد و ہدایت کی آخری تعلیم

نہیں ہے جس میں اضافہ کی کوئی گنجائش
نہ جس میں ایک بھی نقطے کی ہو سکے ترمیم

محمدِ عربی رحمتِ تمام و کمال
کہ شرق و غرب میں جاری ہے جن کا فیضِ عمیم

وہ بیکسوں کے طرفدار بے بسوں کے شفیق
خدائے پاک نے جن کو کہا رؤف و رحیم

ہیں اس زمانہ میں جن کے نیاز مند غلام
شہانِ بے کلہ و خسروانِ بے دیہیم

وہ رازدارِ عمل واقفِ رموزِ حیات
جھکا ہوا ہے خرد کا جدھر سرِ تسلیم

محمدِ عربی کا پیام کافی ہے
میں چھیڑتا ہی نہیں بحثِ جدید و قدیم

کہا خطیب نے جس وقت قالَ رسولؐ
"فتادِ سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم"

شبیر محمد اختر

گلاب کا پھول

کیکاؤس جی ابھی تک مجرّد تھا۔ عزیزوں اور دوستوں نے کئی بار کوشش کی کہ وہ سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جائے مگر وہ کسی کی نہ مانا۔ بھلا وہ مان بھی کیسے سکتا تھا۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ اسے شادی سے نفرت نہ تھی بلکہ خوف تھا ــــ اس کی چھوٹی بہن کی موت جن پر اسرار حالات میں ہوئی اس کے تاثرات اب تک اس کے ذہن میں باقی تھے۔ اس کی موت کے بعد اس کے لئے شادی کا لفظ محرمات میں سے ہو گیا تھا۔ ایک جنگلی انسان کے طرح جو بعض چیزوں کے نام اس لئے نہیں لیتا کہ کہیں اس کے دیوتا ناراض نہ ہو جائیں۔ اور اس پر اپنا عذاب نازل نہ کر دیں۔

امپیریل سروس کا نشہ۔ شباب اور حُسن' اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس کی فراغت کے اوقات کلب میں گزرتے۔ مگر ان چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ عورت سے ہمیشہ بچ کر رہتا ــــ وہ اسے شیشے کا ایک نہایت خوبصورت برتن سمجھتا اور ڈرتا کہ کہیں اس میں بال نہ آ جائے۔ جب کبھی وہ اس بارے میں سوچتا تو اُسے ہر لڑکی اپنی بہن معلوم ہوتی۔ اس کے دل میں جذبۂ احترام پیدا ہوتا اور پھر کبھی وہ اپنے تئیں اس اجنبی کے روپ میں دیکھتا جس نے اس کی بہن کو دھوکا دیا تھا ــــ اس کی سوچ اسے دور لے جاتی ــــ اسے بہن کے ہاں بچّہ ــــ بند کمرہ ــــ یاد آ جاتے۔ ماں رو رہی تھی اور باپ برآمدے میں غصہ میں دیوانہ وار ٹہل رہا تھا ــــ پھر اچانک اندر سے ڈاکٹر نکلا۔ اس نے سر ہلایا۔ نہ جانے اس کا کیا مطلب تھا؟ باپ تن گیا۔ ماں نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر راتوں رات میت کو دفن کر دیا گیا ــــ اس کی بہن کا قاتل روپوش ہو گیا تھا ــــ!

اگر اس سے بھی ایسی حرکت سرزد ہو گئی تو؟ ــــ تو کا تصوّر اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ اتنی بڑی عزت کا مالک ــــ اس کے ہم جولیوں کا خیال تھا کہ وہ بزدل ہے۔ گھریلو ذمہ داریوں سے ڈرتا ہے۔ عورتوں کی رائے تھی کہ وہ شرمیلا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے دل میں ڈر تھا اور ایک خوف ــــ اس نے ہمیشہ عورت کو بہن اور ماں کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ اس کے علاوہ وہ عورت کا کوئی مفہوم ہی نہ سمجھ سکا۔ اس کا پہلا تجربہ اتنا تلخ تھا کہ وہ دوسری بار اسے دہرا نہ سکا۔

کھیلوں میں اسے ٹینس سے والہانہ الفت تھی۔ وہ ہر دل ٹینس کھیلتا رہتا۔ اس کا روزمرہ کا پروگرام نہایت سادہ تھا۔ صبح کافی دور تک سیر کے لئے جانا۔ سارا دن دفتر میں مصروفیت اور شام کو ٹینس ــــ باقی وقت مطالعہ کے لئے وقف تھا۔

کلب میں کبھی کبھی اس کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ مگر وہ اپنی اس زندگی میں مطمئن تھا اور دوسروں سے زیادہ مطمئن ــــ پھر بھلا کسے ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ اس کے متعلق اُلجھتا رہے۔

کلب میں ایک نئی لڑکی کا اضافہ ہوا۔ ان کے محکمہ کے ایک افسر کے تبادلے میں نئے آنے والے صاحب کی یہ صاحبزادی تھیں اسے بھی ٹینس کا شوق تھا۔ پہلے دن وہ کیکاؤس کے مقابلے میں کھیلی اور خوب کھیلی۔ اس کی شوخی 'چنچلتا' اور ٹینس کی مشاقی سارے ممبروں کے لئے توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ مگر سفید سویٹر پر سرخ گلاب کا پھول اور بھی جاذب نظر تھا۔ اس کی صحت مند چھاتی پر چست سویٹر کھیلنے سے اور بھی چست ہو گیا۔ گلاب کا پھول اس میں بلا کا حُسن پیدا کر رہا تھا ــــ لڑکی کا چہرہ جب کھیلتے کھیلتے سرخ ہو جاتا تو پھول اور نمایاں ہو جاتا۔

کیکاؤس اس لڑکی کے کھیل سے بہت متاثر ہُوا۔ کھیلتے کھیلتے اسے وہ گیند دکھائی دینے لگتی جو اچھل اچھل کر "لان" میں محو رقص تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اس کی نگاہ باربار گلاب کے پھول پر جا کر رکتی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا اور کئی بار سروس ضائع کر دی۔

کھیل ختم ہوا۔ سارے کلب کے ممبر لان ہی میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خادم فوراً کولڈ ڈرنک لے آئے۔ لڑکی کا باپ بھی وہیں آ گیا۔ اور سب مل کر خوب باتیں کرتے رہے۔

کیکاؤس گفتگو میں مشغول تھا۔ مگر اس کی توجہ پھول کی طرف تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ یہ پھول حاصل کرلے ـــــ اس نے دل کو سمجھایا کہ یہ کیا بچپن ہے؟ مگر دل تھا کہ نہ مانا ـــــ اور اس کی خواہش بڑھتی گئی۔

وہ گھر پہنچا۔ اسے اپنی حماقت پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا ـــــ بھلا اس پھول میں کیا رکھا تھا ـــــ" یہ بڑی بات تھی۔ اسے مانگ لیتے" اندر ہی اندر کوئی کہتا۔

پھر جب بھی وہ اس لڑکی سے ملتا۔ اس کے پھول کی تعریف کرتا۔ وہ بھی ہمیشہ کلب میں گلاب کا سُرخ پھول لگا کر آتی۔ کیکاؤس کا دل بچے کی طرح مچلنے لگتا۔ وہ اپنے تئیں روکتا۔ مگر بچپن کا زمانہ پھر آگیا تھا۔ روکنے سے اس کی طبیعت اور زیادہ بھکتی۔

کیکاؤس اور وہ لڑکی ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک ہوتے گئے۔ کیکاؤس کو اس لڑکی سے مل کر خوشی ہوتی۔ وہ اسے اپنی کار میں لئے پھرتا۔ لیکن یہ سب اس صورت میں ہوتا جب اس لڑکی کے کوٹ کے کالر میں پھول ہوتا ـــــ وہ اپنا قیمتی وقت اس کے پاس گزارتا۔ وہ اس کی اس پسند کی داد دینے لگی۔ ایک دن اسے اپنے ہاں دعوت دی۔ میز پر جہاں چائے کے برتن سجے تھے ان کے درمیان سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ بھی رکھا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ پھولا نہ سماتا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ سارے پھول میزبان کے سینہ پر آویزاں کردے اور پھر وہاں سے اتارے جائے۔

چائے کی میز پر خوب باتیں ہوئیں اس نے بڑھ بڑھ کر دادِ سخن دی۔ اسے زندگی میں پہلی بار عورت کو عورت کے روپ میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی کھوئی ہوئی شے مل گئی ہے اسے اپنی زندگی کا خلا کم ہوتا محسوس ہوا۔

اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد بھی رہنے لگا۔ وہ لڑکی سے زیادہ دیر جدائی کو ناقابلِ برداشت پاتا۔ اس کی زندگی پرکیف ہونے لگی اسے سرور محسوس ہونے لگا۔ اب وہ رات کے تارے گننے میں ایک لطف لیتا۔ نغمہ اس کی گہرائیوں سے خواب نکال کر لاتا۔ وہ خواب کتنے حسین ہوتے اور انھیں خوابوں میں وہ راتیں بسر کردیتا۔

پھر ایک دن اس کی طبیعت مچلی۔ اس نے اس سے وہ پھول مانگ ہی لیا۔ جو اس کے سینے پر آویزاں تھا۔ اور اس نے ہنستے ہنستے دے دیا کیکاؤس کو تو گویا ساری کائنات مل گئی۔ وہ بچوں کی طرح خوش تھا۔ اور جب گھر واپس آیا تو وہ ناچ رہا تھا اس نے پھول اپنے پلنگ پر گرا لیا اور اس کے گرد پروانہ وار ناچنے لگا۔ پھر اس نے وہ پھول اپنے ہونٹوں سے لگایا ـــــ اسے نشہ سا آگیا ـــــ وہ خوشی کے مارے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

اس نے پھول کو بار بار دیکھا ـــــ اس کی تمنا پوری ہوگئی تھی ـــــ وہ اسے رات گئے تک دیکھتا رہا ـــــ پھول مرجھاتا گیا۔ اور وہ اسے تکتا رہا ـــــ یکایک اس کے سامنے وہی لڑکی نمودار ہوئی وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا ـــــ پھر آہستہ آہستہ اس کے خدوخال تحلیل ہو کر اس کے سامنے نیا چہرہ لے آئے ـــــ اس کی بہن کا چہرہ ـــــ پژمردہ اور زرد ـــــ! وہ کانپ گیا اس کے ذہن میں سرسراہٹ ہونے لگی ـــــ گویا کسی نے اسے جھنجھوڑا۔ اس کی طبیعت میں تبدیلی آگئی ـــــ اب وہ اس لڑکی سے ملتا مگر بے دلی سے ـــــ اور پھر جدا ہو جاتا ـــــ وہ پھول کو دیکھتا مگر اب اس دیکھنے میں التجا کی جگہ تقدیس نے لے لی تھی۔

پھر واقعات بدلنے لگے ـــــ اس لڑکی سے ملنا کم ہوتا ہوتا معدوم ہوگیا۔ کیکاؤس کی توجہ گلاب کے پھولوں کی طرف ہونے لگی ـــــ اس نے خادموں کو حکم دے دیا کہ اس کے سارے گلدان گلاب کے پھولوں سے مزین رہیں۔

کلب کا آنا جانا بھی کم ہوتا گیا ـــــ وہ تنہائی کے اوقات پھولوں کو تکنے میں گزار دیتا ـــــ پھولوں کی پتیاں اس کے سامنے مختلف چہرے لے آتیں۔ بہن، ماں اور کلب کے کئی مانوس چہرے ـــــ پھر اس لڑکی کا چہرہ ـــــ اس کے خیالات کا سلسلہ رک جاتا اسے دھچکا سا لگتا ـــــ وہ آنکھیں بند کرلیتا۔

جب کبھی وہ پھول ہاتھ میں لیکر کھیلنے لگتا ـــــ تو اسے دلی راحت میسر آتی ـــــ پہلے گھر کے اندر پھول تھے۔ اب باغیچہ میں بھی گلاب ہی گلاب نظر آنے لگا۔ وہ کمروں میں گھبراتا تو باغیچہ میں چلا جاتا ـــــ اسے اپنے چاروں طرف پھول ہی پھول دیکھ کر ایک لطف آتا۔

اور پھر ـــــ یہ پھول اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئے۔ جب وہ ان میں ہوتا تو اسے کسی اور کی یاد نہ ستاتی۔ اکثر اس پر ایک وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی اور وہ پہروں کسی ایک پھول کو دیکھنے میں محو ہو جاتا ـــــ پتیوں میں اس ٹینس والی کا چہرہ نمودار ہوتا ـــــ پھر اس کا توانا اور ابھرا ہوا سینہ سامنے آجاتا ـــــ سینے پر سفید پھول ـــــ اس کا ہاتھ یکایک

اس پھول کو توڑنے کے لئے اٹھتا ــــ مگر خیال ہی خیال میں ہاتھ رک جاتا۔ چہرہ کسی اور کا تھا ــ زرد ــ بے جان چہرہ ــــ اس کی بہن ــــ تاریک کمرہ ــــ مردہ بچہ ــــ باپ کی جھکی ہوئی کمر ــ اور ماں کی ہچکیاں ــــ وہ پریشان ہو جاتا۔ اس پر دیوانگی سی چھانے لگتی ــــ اور اسے پھر ایسا بھی محسوس ہوتا گویا اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سُرخ انگارہ رکھا ہے ــــ جس سے اس کی روح جل رہی ہے۔

وہ گھبرا کر اکثر پھول پھینک دیتا ــــ اور باہر نکل جاتا ــــ نہ جانے کیوں؟

(خان بہادر) رضا علی وحشت

کلام وحشت

کون احسان ہے اس میں نگہِ ناز ترا
آ لگے دل میں جو تیرِ غلط انداز ترا

خود نما جلوہ ترا داد طلب ناز ترا
کون ہے تیرے سوا پردہ درِ راز ترا

بزم کی خیر نظر آتی نہیں اے مطرب
آفت انگیز ہوا سوز مرا ساز ترا

ہے ترے طرزِ تغافل ہی پہ سارا الزام
میری آنکھوں نے تو ظاہر نہ کیا راز ترا

عشق ناکام کو میرے ہے ابھی تک اُمید
واہ رے شعبدۂ حسن فسوں ساز ترا

تیری تانوں کا تقاضا ہے کہ اے مستِ طرب
چوم لوں بڑھ کے لبِ زمزمہ پرداز ترا

یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے تُو وحشت
جب مری جان نہیں کوئی ہم آواز ترا

فن کار

محمد امین شرقپوری

لوگوں کا خیال تھا کہ وہ صفحۂ قرطاس پر گوہر بکھیر رہا ہے۔ اپنے بارے میں اس نوع کے خیال پر وہ پاگلوں کی طرح ہنس پڑتا۔ اپنی تحریروں کے حروف اسے خون میں ڈوبے نظر آتے جو پریس سے نکل کر الفاظ کی صورت میں کاغذوں پر منجمد ہو گئے تھے۔ کڑکتی ہوئی سردی میں کس طرح اس نے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں سے انہیں قلمبند کیا تھا۔ جھلسی ہوئی گرمیوں میں کس طرح اس نے خون پسینہ ایک کر کے انھیں دماغ سے اگلا تھا۔ اور اس کی محنت کا معاوضہ تھا چند ٹکے۔ اس کی دن بھر کی اوسط آمدنی چند اکنیوں سے کبھی متجاوز نہ ہوئی۔ مہینے کے بعد گنتی کے چند روپے اس کے پورے مہینے کے کفیل تھے۔ اس کے رشحاتِ قلم دوسرے کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ کبھی کسی مختصر مرد کے نام سے کبھی کوئی دلکش نسوانی نام عنوان کے ساتھ چسپاں ہوتا۔ چند سائل کے ایڈیٹر اور ایک دو پبلشروں کے علاوہ کوئی اس کی شخصیت سے واقف نہ تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اس کی گاڑھی کمائی تیس دن سے پہلے ہی ساتھ چھوڑ دیتی۔ اُسے فاقوں میں ڈال کر! اس کا فاقہ کش قلم جب بھی چلتا کاغذ پر فرفر موتی بکھیرتا ہوا چلا جاتا۔ دنیا کی وسعتوں کو چیرتا ہوا۔ وہ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی دونوں میں سے کسی ایک کا بھی قائل نہ تھا۔ اس کی تحریر کا انداز جداگانہ تھا۔ جو چیز سامنے آجاتی اس کا قلم چل پڑتا۔ ہر پھر کر ملوکیت کی چکی پر رک جاتا جس کے چلتے ہوئے پاٹ میں سے ہر چیز سُرمہ بن کر نکلتی ہے ایسا سرمہ جو نہ بینائی کو روشن کر سکتا ہے اور نہ کسی اور ہی مصرف میں آسکتا ہے۔ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ مٹی پھر کارآمد ہے۔ وہ کس مصرف میں آئے گا؟ سوچتے سوچتے اُس کا دماغ گھوم جاتا۔ مزدور بن جاؤں؟ چونک پڑتا۔ اس نے اکثر مزدوروں کو سرمایہ داروں کے ہاتھوں نالاں دیکھا تھا۔ شام کے وقت جب نفری ٹپتی ہے وہ مالک کی کیسی کیسی مغلظات سنتے ہیں۔ اس کی خودداری یہ کب گوارا کر سکتی تھی۔ بعض اوقات اسے کسی دفتر میں کلرکی کا شوق چرّاتا۔ دفتر سے نکلتے ہوئے بابوؤں کے مُرجھائے ہوئے پیلے پیلے چہرے اس کی آنکھوں کے آگے گھوم جاتے۔ کثرتِ کار کی شکایت تنخواہ کی کمی کا شکوہ، افسروں کی جھڑکیاں ــــ! اس کی خودداری بیدار ہو جاتی۔ پھر.... پھر.... وہ کیا کرے؟ خوشامد کو وہ لعنت سمجھتا تھا ایک پبلشر جو ایک بک سیلر کے یہاں ملازم تھا خوشامد سے کس طرح اس نے پوری دکان پر قبضہ جما لیا تھا۔ مالک کے جوتے اٹھاتے ہوئے اُسے دیکھا تھا ــــ جھک کر سجدہ کرتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا۔ اُس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ وہ جھوٹ اور بے ایمانی سے کیوں نہ پیٹ بھرے؟ آخر دنیا کا بڑا حصہ آنند کے تار بجا رہا ہے انہی بل بوتوں پر۔ مظلوم تڑپتی ہوئی لاشیں اس کے سامنے آجاتیں ــــ عیاری کا شکار اور وہ روپیہ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ انسانوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا ہو۔ اسے اُبکائیاں آنے لگتیں۔ جھٹک مار کر قلم کو پھر تھام لیتا۔ کاغذی پیرہن میں تصویریں اترتی جاتیں۔ انہی لوگوں کے قصے انہی لوگوں کی کہانیاں بنتی چلی جاتیں۔ اس کا قلم خود بخود چل نکلتا ــــ کاغذ کے لق و دق میدان میں ــــ!

"سوزِ دروں" اس کی تازہ تصنیف ہاتھوں ہاتھ بک رہی تھی۔ نہایت تھوڑے عرصہ میں اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔ ہر صاحب ذوق کے ہاتھ میں "سوزِ دروں" دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت جلد پر کونے میں چھوٹا سا نام کندہ تھا۔ خوب لکھی ہے دلسوز نے کتاب ــــ! وہ چونک پڑتا۔ پبلک پارک میں سرنگوں بیٹھا تھا۔ شاید کسی پلاٹ کی تخلیق میں ــــ! سامنے دو خوبصورت ہاتھوں میں سرخ جلد چمک رہی تھی! نازک ہونٹ آپ ہی آپ کھل جاتے۔ "خوب! ــــ واہ ــــ" اسے پھریریاں سی آنے لگیں۔ وہ اس خوبصورت لڑکی سے کیوں نہ کہہ دے کہ وہی "سوزِ دروں" کا مصنف ہے۔ مگر وہ لڑکی ــــ! وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا ــــ کس قدر باوضع لباس میں ملبوس ہے اس کی نظریں اپنے پھٹے کپڑوں پر پڑیں۔ قمیص کے اڑے ہوئے کالر، کھلا گریبان۔ کف ندارد۔ پاجامہ پائنچے تک پھٹا ہوا۔ ٹوٹا

ہوا چپل گھردرے پیروں میں ——— اُترا اُترا چہرہ، سُرخ آنکھیں، میل میں اٹے ہوئے اُلجھے اُلجھے بال۔ کیا وہ باور کرلے گی کہ حضرت دلسوز یہی ذات شریف ہیں۔ گورے ہاتھوں میں انہی کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ کس قدر انہاک سے پڑھ رہی ہے؟ کاش وہ الفاظ کے پردے میں اس کی صورت کو دیکھ سکتی۔ اس کے سینے کے مدوجزر میں اس کے دل کی دھڑکنیں جذب ہو سکتیں۔ یہ وہم ہے۔ تصور ——— محض تصور ——— اور شاید دھوکا بھی ——— ناک زور سے مسل رہا تھا۔ یہ خوشبو اس کی زلفِ عنبریں کی ایک ہلکی سی مہک ہے جس سے پارک مہک اٹھا ہے۔ مگر یہ خوشبو اس ناک کے لائق نہیں۔ زندگی کی کتنی بوئیں یہ سونگھتی ہے۔ شاید اب وہ قوت کھو بیٹھی ہے۔ اچھی اور بُری بُو میں اس کے لئے امتیاز مشکل ہو گیا تھا۔ کان جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کا مطلب یہ کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ماجرائے دل کہہ رہی ہو۔ دبی دبی آواز میں ——— ہونٹوں کی خفیف جنبش سے وہ داستان دہرا رہی ہو جسے صرف فرشتے ہی سن سکتے ہیں۔ اسے اپنی بینائی پر بھی شبہ ہونے لگا۔ آنکھوں کے آگے تارے سے اُڑنے لگے! اس کا چہرہ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اس کا تصور بنا اور بگاڑ رہا تھا۔ قدرت کا یہ معصوم صحیفہ۔ کاش وہ اس کا مطالعہ کر سکتا ہر ہر نقش یقیناً رازہائے سرمدی کا مظہر ہوگا۔ وہ بے جان ہاتھوں سے اسے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساکت و جامد ہاتھ کیا حرکت کر سکتے ہیں۔ اسے اپنی کوشش پہ ہنسی آگئی۔ مُردہ سی ہنسی اس کے ہونٹوں سے نکل کر زردی مائل چہرے پر بکھر گئی۔ بالکل ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح ——— جو آخری کرنیں چھوڑ کر چھپ جاتا ہے ——— زرد زرد کرنیں!

بازاروں میں آراستہ الماریوں میں جب وہ اپنی تصنیفات سجی ہوئی دیکھتا۔ اس کا منجمد خون رگوں میں آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگتا۔ کس قدر احتیاط سے دھری ہیں۔ کاش اسے سر چھپانے کے لئے ایک کھاٹ کی جگہ ہی میسر ہوتی۔ یہ بھڑکیلے گرد پوش اس کے تن کو ڈھانپ سکتے۔ یہ گدیوں پر لوٹنے والے پبلشر اس کی حالت کا اندازہ کر سکتے۔ ان کی امارت میں اس کا کتنا ہاتھ ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بازار سے نکل گیا ——— خالی ہاتھ!

اسے خالی ہاتھ دیکھ کر اس کی بچی کس شدت سے رو رہی تھی۔

"میری بچی ——— !" سینہ سے لگاتے ہوئے اس کی چھاتی پھٹ گئی۔ بن ماں کی بچی، بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بچی کا تصور آپ ہی آپ اس کے دماغ میں اُبھر آتا۔ اسے بہلانے کے لئے کچھ بھی تو نہ لا سکا تھا اس روز، وہ کتنا منحوس دن تھا ——— تصور ہی سے اسے چھاتی پھٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔ بچی تھک کر خاموش ہو گئی۔

"بس رک گئیں،" اسے پیار کرتے ہوئے بولا ——— "آنکھوں میں شاید آنسو نہیں رہے۔ میری بچی! تو نے سارے موتی لُٹا دیئے صرف ایک معمولی سی چیز کے لئے۔ تیرا باپ وہ معمولی کھلونا بھی تو نہ لا سکا تیرے لئے۔ بولو ننھی! چپ کیوں ہو گئیں؟ تیری کھلی ہوئی آنکھیں اب بھی مجھ سے مانگ رہی ہیں۔ میں انھیں خوبصورت لفظوں سے بھر سکتا ہوں۔ میرے پاس الفاظ کی کمی نہیں۔ میرے الفاظ سنگدل انسان کے دل کو پگھلا سکتے ہیں۔ مظلوم کی زبان بن سکتے ہیں۔ کاش میں تجھے خوش کر سکتا۔ خالی لفظوں سے ——— تیرا جسم ٹھنڈا کیوں رہا ہے؟ آج تو بہت روئی ہے۔ شاید اس لئے۔ تیرا ننھا سا دل کس شدت سے دھڑک رہا ہے، اری چھاتی پھٹ جائے گی۔ تو اس دھڑکن کو میرے دل میں جذب کر دے۔ وہ تمام رات اسے ہاتھوں میں لے کر بیٹھا رہا۔ شل ہاتھ یہ بھی محسوس نہ کر سکے کہ وہ مُردہ ہو چکی ہے۔ اس نے کہا تھا نا کہ اپنی دھڑکنوں کو میرے اندر سمو دے۔

وہ اپنے جسم میں ایک حرارت محسوس کر رہا تھا ——— تیز حرارت!

وہ کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے لکھ رہا تھا۔ پبلک اس کی نئی تصنیف کا بےچینی سے انتظار کر رہی تھی۔ ہنڈے کے گرد منڈلاتے ہوئے پروانے کاغذ پر گر رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا سرد جھونکا اس کے بدن میں کپکپی پیدا کر دیتا۔ وہ ٹانگیں سکیڑ لیتا۔ اس کی رگوں میں خون اسی تیزی سے کھولنے لگتا اور قلم صفحۂ قرطاس پر گلکاریاں کر رہا تھا۔ دنیا کے چلتے پھرتے کردار خیالات کے بند صندوں میں کچھ کراہتے چلے آرہے تھے۔ وہی چشم دید واقعات۔ بیتی ہوئی گھڑیاں افسردہ فضا میں دم توڑتا ہوا معصوم حسن۔ سرِ راہ لٹتی ہوئی جوانیاں زمین پر رینگتے ہوئے بے جان مجسمے۔ ہوس کے کارنامے!

"کیا لے گی ——— ؟"

"دس روپے!"

"یہ صورت تو دمڑی کی بھی مہنگی ہے۔"

حسن کی اس تذلیل پر اس کا قلم دانت پھاڑ کر ہنسنے لگا۔

"کیوں مارتے ہو اسے؟"

"یہ چور ہے۔ اس نے مال چرایا ہے۔"

"یہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ میں مظلوم ہوں مظلوم۔"

"پھر زبان کھولی تو نے۔" تڑ سے طمانچہ پڑا۔ وہ بلبلا اٹھا۔

اس کا قلم تمتماتے ہوئے گالوں پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ انگلیوں کے نشان جو سفاکی کا نقش چھوڑ گئے تھے۔

ایک گول مٹول توند اس کے سامنے آگئی اور ایک بلا پلا چہرہ۔

"مالک گزر نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تنخواہ بڑھا دو۔"

"میں تمہارے بچوں کا ذمہ دار ہوں؟ کم پیدا کرو۔ چادر کے مطابق پاؤں پسارو۔ نالائق۔ پاجی۔ بدمعاش!"

قلم مُہریں ثبت کر رہا تھا۔ ظلم کے مُنہ پر مظلومیت کی مہریں۔

اُس کی پیٹھ دکھ رہی تھی ―― پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اور ہاتھ جیسے ابھی رک جائیگا۔ کون جانتا ہے کہ مرنے کے بعد اسے کفن بھی نصیب ہوگا یا نہیں؟

نثار اٹاوی

آگ

سینے میں سوز، دل میں جلن ہے، جگر میں آگ
ہم نے خود اپنے ہاتھ لگائی ہے گھر میں آگ

جس دن چلے تھے اُڑ کے نشیمن سے سوئے دام
اُس دن ہی لگ گئی نہ مرے بال و پر میں آگ

آیا جب ان کا نام تو آنسو نہ تھم سکے
بدنام کر دیا ہے لگے چشمِ تر میں آگ

بڑھتا ہی جا رہا ہے زمانہ فراق کا
لگ جائے کاش دامنِ شام و سحر میں آگ

راہِ وفا عذابِ جہنم سے کم نہیں
ہر ہر قدم پہ پھوٹ پڑی رہگزر میں آگ

اب تک کسی پہ رازِ محبت نہ کھل سکا
ان کی نظر میں پھول، ہماری نظر میں آگ

وہ اور مضطرب سے پھریں کو بکو نثار
لعنت مری دعا پہ دعا کے اثر میں آگ

ناطق گلاوٹھوی

تبرّکات

صیّاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں
میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

ہمّت فزا ہیں شوق کی ناکامیاں ہنوز
اے غم مجھے تو فرصتِ آہ و فغاں نہیں

ہے اضطرابِ زیست پئے راحتِ اجل
تو آشنائے لذّتِ خوابِ گراں نہیں

وہ جاں نثارِ دوست کہاں وہ کہاں عزیز
دھوکا نہ دے وطن یہ ہمارا مکاں نہیں

رہتے ہیں دُور زندگیِ مستعار سے
ہے کس کی جستجو میں فنا ہم یہاں نہیں

اے سانس آہِ گرم غلط شعلہ بار ہو
میں تجھ سے آگ مانگ رہا ہوں دھواں نہیں

دنیائے نامراد کی راحت سے باز آئے
ہم عیش چاہتے ہیں مگر اب یہاں نہیں

اے صبر ہے قرار کی صورت یہاں کہاں
کس کی تلاش ہے مرے گھر میں اماں نہیں

ہے طول و عرض ملک پہ چھائی ہوئی یہی
ناطق کسی کی خاص اب اردو زباں نہیں

افسر احمد نگری

بدرگاہِ ساقی

تری آنکھوں میں اک جامِ شرر آمیز ہے ساقی
وہ جس کا قطرہ قطرہ برقِ آتش خیز ہے ساقی

کہاں یہ سرد مہری اور کہاں وہ گرم گفتاری
شکایت میگساروں کو ہی کم آمیز ہے ساقی

ترے شیشے سے عریاں ہے عروسِ صبحِ گلخانہ!
ترا خُمِ بادۂ تسنیم سے لبریز ہے ساقی

جو ہر لحظہ مجھے دیتی ہے درسِ خود نگہداری
وہ تیری اک نگاہِ التفات آمیز ہی ساقی

تری زلفوں میں پوشیدہ ہے شامِ لالۂ صحرا
ترے لب پر پیامِ صبحِ رستاخیز ہی ساقی

چلا ہوں ناقۂ لیلائے مستی کے تعاقب میں
مری رفتار بجلی سے زیادہ تیز ہے ساقی

ہر اک ذرّے کو میں خورشیدِ تاباں کر کے چھوڑوں گا
یہ سیلِ عشق ہے اس سیل کی رَو تیز ہی ساقی

جہاں میں بندۂ مومن نظر آتا نہیں مجھ کو
کوئی پرویز ہے ساقی کوئی چنگیز ہے ساقی

پلائے جا مئے خمخانۂ افکار کے ساغر
یہ دل پہ بارشِ الہام ابھی نو خیز ہی ساقی

میرزا اختر علی تلہری

نئے ادیبوں پر "مداوا" کا ردِ عمل

نیا [illegible] کا کوئی [illegible] شائع کیا [illegible] نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی [illegible] بنوچا[illegible] آگیا۔ اس کے پڑھنے سے خلقے ہی نئے ادیبوں اور ترقی پسند ادیبوں کے داغوں کے طبقات میں وہ الٹ پلٹ پیدا ہوئی کہ ان کے پاس عقلی توازن کی جو کچھ کائنات تھی وہ بھی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ اس کے نتیجہ میں ان تحریکوں کے حامیوں کی طرف سے "مداوا" کا اثر زائل کرنے کے لئے "طامات و ترہات" کا طومار ہر گوشہ میں پھیلایا جانے لگا۔ سب و شتم کے تیروں کی بوچھاڑ کی جانے لگی غالباً ان نئے ادیبوں نے اب یہ طے کر لیا ہے کہ "گالیاں دے کر منہ چڑا کر" ہی نئے ادب کا بھرم باقی رکھا جا سکتا ہے۔ نئے ادیبوں کے اس "تو اور تیرے" پر مشتمل اندازِ گفتگو سے ان کی اس جھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے جو بیشتر "استدلالی درماندگی" کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نئے ادیبوں کی اس سلسلے میں منہ چڑانے والی مختلف تحریریں نظر سے گزریں۔ مگر اس خصوص میں جناب محمد حسن عسکری صاحب کا مضمون جو اپریل اور مئی کے ساقی دہلی میں شائع ہوا ہے نئے ادیبوں کی مخصوص خصوصیتوں کا خالص الخالص ترقی پسندانہ مجموعہ ہے۔ ہمارے اس ادیب کی نگاہ میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر تنقید کرنے والوں میں کوئی بھی ہستی قابلِ اعتنا نہیں ہے اور کیونکر قابلِ اعتنا ہو جب کہ اس کے بنائے ہوئے ادبی چوکھٹے میں صرف وہی تصویریں سما سکتی ہوں جن کے ہر خال و خط سے "فنی لفنگاپن" ظاہر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نئے ادیبوں کی موجودہ تنقیدی تحریریں دیکھ کر اپنے اسی محترم مقالہ نگار کے اس فقرہ کو دہرا دینے کو جی چاہتا ہے۔

"ادب و شعر کے لئے مصیبت کی بات یہ ہوئی ہے کہ جنہیں اپنی توجہ صرف راشن یا بازار کے بھاؤ یا آج کی خبروں تک محدود رکھنی چاہیے وہ شاعری اور تنقید سے بھی الجھتے ہیں۔" اس مقالہ کی اشاعت کا یہ منشا قطعاً نہیں ہے کہ نئے ادیبوں کی سودائی پنے کی باتوں کا جواب دیا جائے۔ ان کا لہجہ اور ان کے بول انھیں کی عوامی تہذیب کے لئے شایاں ہیں ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اس مقام پر ان بعض امور کے متعلق کچھ معروضات پیش کرنا ہیں جو نئے اور ترقی پسند ادیبوں کی جدید کروٹوں کی وجہ سے ابھر کر سطح پر آگئے ہیں۔

۱۔ نیا ادب اور ترقی پسند ادب

اب سے کچھ پیشتر نیا ادب اور ترقی پسند ادب مرادف الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ اس حلقہ کے ادیب بلا تکلف یہ دونوں لفظ اپنے لئے بغیر کسی تفریق کے استعمال کرتے تھے۔ "نیا ادب" جو کبھی لکھنؤ سے نکلتا تھا اور اب بمبئی سے شائع ہو رہا ہے ترقی پسند جماعت کا خاص ترجمان تھا اور ہے۔ اس کی شہادت واضح الفاظ میں مکرمی احتشام حسین صاحب ایم اے لیکچرر لکھنؤ یونیورسٹی نے جو ترقی پسند جماعت کے ذمہ دار رکن ہیں ۱۵ اگست کے "آجکل دہلی" میں دی ہے۔ اسی ذمہ دار رسالہ کے جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۲ء کے خاص نمبر میں افتتاحی شذرات کے مصنف نے فرمایا ہے "رسالہ کی اس مخصوص اشاعت کا منشا یہ تھا کہ نئے ادب کے بارے میں بعض بنیادی باتوں کی تشریح ہو جائے اور بعض غلط فہمیاں دور ہو جائیں"۔ ان غلط فہمیوں کے دور کرنے کے لئے جہاں بہت سے مضمون دیئے گئے ہیں ان میں فیض صاحب کا وہ مضمون بھی ہے جسے ترقی پسند جماعت میں خاص طور سے پسند کیا جاتا رہا ہے اور جسے اسی نیا ادب میں دو مرتبہ اس کی اہمیت کے اعتراف کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں قریب قریب ہر جگہ "ترقی پسند ادب" کی توضیح کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس وقت کے ان ادیبوں میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے مفاہیم میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اس مضمون کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی ان لفظوں کے استعمال میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ ان باتوں سے پتا یہی چلتا ہے کہ اس وقت تک یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے تھے۔ مگر اس طرف جب اس جماعت کے ادبی سرمایہ کا تنقیدی جائزہ لیا جانے لگا اور ان میں سے بہتوں کی ادبی کائنات صرف "لفاعت مزجات" قرار پانے لگی بلکہ "اعلیٰ اخلاق اور تمدنی قدروں" کے لئے

تہا کن ثابت ہونے لگی اور اس طرح عام تھا ہیں اس ذخیرہ پر آڑی ترچھی پڑنے لگیں تو صورت حال بدلی۔ چونکہ اس جماعت کے نمایاں افراد کمیونسٹ ہیں جن کا ادبی مقصد بھی ان کے تمام سیاسی مقصد کا پابند ہے۔ انھیں نئے ادب کے خلاف یہ عام شورش دیکھ کر خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اس آباد دھڑیاں شعر و افسانہ سے اپنے کو الگ نہ کر لیا گیا تو ان کا اصل سیاسی و اقتصادی نصب العین اس طوفان میں نقصان اٹھا جائے گا۔ "انکار سے" سے چلے ہوئے ہاتھ ایسی صورت میں اس شعر و ادب سے علیٰحدہ ہٹ جانے پر مجبور تھے۔

غالباً سب سے پہلے ڈاکٹر علیم صاحب نے منزل لکھنؤ کے تین پرچوں میں نئے ادب سے اپنا اختلاف ظاہر کیا تھا اور اسی سلسلہ میں ن۔ م راشد کی نظم "انتقام" کی طرف اشارہ لطیف طنزیہ پیرایہ میں کیا تھا۔ "آجکل" کے اگست کے تازہ پرچہ میں احتشام حسین صاحب نے بھی جناب رشید احمد صدیقی کے مضمون سے بحث کرتے ہوئے نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے فرق پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ محمد حسن عسکری صاحب نے بھی اپنے زیر بحث مضمون میں لکھا ہے "نئے ادب اور ترقی پسندی کو مرادف سمجھنا تو ایک بڑی عام غلطی ہے" مگر اس طولانی مضمون میں انھوں نے کہیں یہ واضح فرمانے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ ترقی پسند ادب کی حدیں نئے ادب سے کس نقطہ پر علیٰحدہ ہوتی ہیں۔ نئے ادب کی تعریف کیا ہے اور ترقی پسند ادب کی تعریف کیا؟ ضمناً یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ اس عام غلطی کی حقیقتہً ذمہ داری کس جماعت پر عائد ہوتی ہے۔ دراصل اس کے ذمہ دار خود یہی نئے ادیب ہیں جنھیں اپنی منزل کا خود پتہ نہیں۔

محمد حسن عسکری صاحب کے مقالے سے واضح طور پر یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ اپنے کو کس ادب کا خدمت گزار قرار دیتے ہیں؟ نئے ادب کا یا ترقی پسند ادب کا؟ چونکہ انھوں نے میراجی کی "معمائی شاعری" اور "چیستانی جنسیات" کی خاص طور سے حمایت فرمائی ہے اور یہی وہ ہستی ہے جس سے ترقی پسند ادیب اب بیزار ہے اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ عسکری صاحب نئے ادیبوں کے حلقہ بگوشوں میں ہیں بہر حال وہ کچھ ہوں ان سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کے نزدیک "نئے ادب" اور "ترقی پسند" ادب کا مفہوم کیا ہے؟ کیا انھیں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے اس تجزیہ سے اتفاق ہے جو احتشام حسین صاحب نے اگست کے "آجکل" میں پیش کیا ہے؟

"ترقی پسند اگر اس خیال پر تنقید کرتا ہے تو صرف اس حد تک کہ ادب کا زندگی کا ساتھ دینا ترقی نہیں۔ اسے بہتر بنانے کی جد و جہد میں آنے کی حیثیت سے کام کرنا ترقی پسندی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ادب میں روح عصر کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے کیونکہ ادیب اور شاعر کا شعور مادی زندگی سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن اس طرح محض اثر لینا اور اس کی عکاسی کرنا فعلیت کی کمی کا پتہ دیتا ہے۔ سماج کے ایک مفکر کی حیثیت سے اس کا فرض یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ جد و جہد کی ترجمانی کرتے ہوئے واقعی ترقی پسند عناصر کے ساتھ ہو جانا ضروری ہے۔ یہی وہ خط فاصل ہے جو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے"

نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے اس تجزیہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ترقی پسند ادیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ جد و جہد کی ترجمانی کرتے ہوئے واقعی ترقی پسند عناصر کے ساتھ ہو جائے لیکن نئے ادیب کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ احتشام صاحب کے اس تجزیہ میں بظاہر یہ منطقی نقص معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لفظوں سے نئے ادب اور ترقی پسند ادب میں عام خاص مطلق کی نسبت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ترقی پسند ادب کی یہی خصوصیت تو بتائی گئی کہ اس کا واقعی ترقی پسند عناصر کے ساتھ ہو جانا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں نئے ادب کے لئے ترقی پسند عناصر کے ساتھ ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ساتھ ہو اور ہو سکتا ہے کہ ساتھ نہ ہو۔ اب اگر ساتھ ہو گیا تو پھر وہ ترقی پسند ادب خواہ مخواہ ہو جائے گا۔ یہی ان دونوں میں عام خاص مطلق کی نسبت متعین کرنے کی شہادت ہے۔ اس صورت میں "خط فاصل" بنانے کے لئے جتنا تضاد مطلوب ہے وہ نہیں پایا جا سکتا۔ شاید احتشام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ترقی پسند ادب وہ ہے جو واقعی ترقی پسند عناصر کے ساتھ ہو جائے اور نیا ادب وہ ہے جو واقعی ترقی پسند عناصر کے ساتھ نہ ہو۔ اب اگر اس کی حیثیت ترقی پسند عناصر کے ساتھ غیر جانبدارانہ ہے تو خیر لیکن اس نے اگر کہیں رجعت پسند عناصر کی ہمنوائی اختیار کر لی تو پھر ایسی حالت میں ترقی پسندوں کا جو نقطۂ نظر ہے اس کے لحاظ سے نئے ادب اور پرانے ادب میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ کیا نئے ادیب اس حیثیت کے اختیار کرنے پر آمادہ ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر نئے ادب اور پرانے ادب میں کوئی خاص فرق نہیں رہ جاتا۔

میراجی نے "نئی شاعری" کی توضیح کرتے ہوئے جیسے نئے ادب کے بارے میں بھی ان کے خیالات کا غماز جائز طور پر فرض کیا جا سکتا ہے

اپنے مقالہ "نئی شاعری کی بنیادیں" میں فرمایا ہے۔ "میرے خیال میں نئی شاعری ہر اس موزوں کلام کو کہا جا سکتا ہے جس میں ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا انداز نیا ہو یعنی کوئی شاعر روایتی بندھنوں سے الگ رہ کر کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت نمایاں کر سکتا ہے تو وہ نیا شاعر ہے ورنہ پرانا!"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نئی شاعری کی اس تعریف سے پرانی شاعری کیونکر خارج ہو سکتی ہے؟ پرانی شاعری میں بھی جو شاعر اہم مرتبہ کے مالک ہیں ان کا بھی کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا انداز نیا ہوتا ہے۔ وہ بھی کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت نمایاں کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور اس اجتہاد میں وہ روایتی بندھنوں سے بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ میر، غالب، انیس وغیرہ قطعی طور سے اس انفرادیت کے اعلیٰ پیمانہ پر مالک رہے ہیں۔ "نئے ادب" کی اس تعریف سے بھی موجودہ دشواری کا حل نہیں نکلتا۔ اب اگر اس انفرادیت میں واقعی ترقی پسند عناصر کا ساتھ دینے کی خصوصیت اور ضم کر لی جاتی ہے تو پھر احتشام صاحب نے جو ترقی پسند ادب کی تعریف کی ہے اس کے حدود میں نیا ادب داخل ہو جاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ حسن عسکری صاحب نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تعریفیں خود فرما دیتے تو ان سے مبادلہ خیال میں زیادہ سہولت ہوتی۔

اس ضمن میں ترقی پسند ادب کے ذمہ دار ترجمان احتشام حسین صاحب سے یہ اور دریافت طلب ہے کہ انھوں نے "ترقی پسند عناصر" میں "واقعی" کا ضمیمہ بڑھا کر کیا فائدہ اٹھانا چاہا ہے؟ "واقعی" کا ضمیمہ شک میں ڈال رہا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "ترقی پسند عناصر" میں "واقعی" کا ضمیمہ لگا کر لائق مقالہ نگار نے ترقی پسند عناصر کی تخصیص سوشلزم اور کمیونزم کے سیاسی اور اقتصادی عناصر میں کرنا چاہی ہے اور اس طرح ترقی پسند ادب اور اشتراکی ادب مرادف قرار پا جاتے ہیں لیکن مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے ڈاکٹر علیم وغیرہ نے منزل لکھنؤ کے کسی مضمون میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسند ادب اور اشتراکی ادب دونوں ایک نہیں ہیں۔ یہ نئے ادب اور ترقی پسند ادب میں فرق پیدا کرنے والی کروٹ جواب لی گئی ہے اس کا نتیجہ یہ سب الجھنیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ واضح طور پر الجھن دور کیا جائے تاکہ ایک معین بات سامنے رہے اور اس پر غور کا موقع مل سکے۔

نئے ادب کے بعض خاص مذموم پہلو

نئے ادیبوں کی طرف سے منظوم و منثور ادبی ذخیرہ جو اس قلیل مدت میں پیش کیا گیا ہے اس کی مذموم خصوصیتیں فحاشی و عریانی اور خدا سے استہزا وغیرہ ہے۔ "ماوا" نگار اور دوسرے محترم جرائد کے مقالہ نگاروں کی طرف سے جائز طور پر اس کا یہ پہلو بھی بحث میں لایا گیا۔ ان سنجیدہ تنقیدوں کے بعد بعض ان ادیبوں نے جو اپنے کو ترقی پسند کہلانا پسند کرتے ہیں اس ادب کے نئے ذخیرہ کے بیشتر حصہ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ یہ ترقی پسند ادب نہیں ہے۔ یہ غیر ترقی پسند ادیبوں کی ادبی کائنات ہے جسے ترقی پسندانہ ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ احتشام صاحب نے ادب لطیف کے سالنامہ ۴۲ء میں اپنے ایک مقالہ "ادب اور اخلاق" کے ذریعہ سے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان عریانیوں اور فحاشیوں کے حامی نہیں ہیں۔ ۱۵ راگست کے "آجکل" میں بھی اس پہلو پر انھوں نے زور دیا ہے۔ حیدر آباد میں جو اردو کانفرنس کچھ عرصہ پیشتر منعقد ہوئی تھی کامریڈ سجاد ظہیر وغیرہ نے بھی اس میں کچھ ایسی ہی باتیں کہی تھیں مگر میں اپنے ان محترم ادیبوں سے معافی مانگتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ان صاحبان کا یہ انکار مجھے کچھ تہ دار معلوم ہوتا ہے۔ عریانی اور فحاشی کی حد بندی جس نوعیت سے یہ حضرات کرتے ہیں اس کا منطقی نتیجہ خود ان کے انکار سے متصادم ہوتا ہے گویا ایک ہی سانس میں وہ ان عریانیوں کو پسند بھی کرتے ہیں اور ناپسند بھی۔ خود میرے محترم کرمفرما احتشام صاحب نے "ادب اور اخلاق" والے مقالے میں فرمایا ہے۔ "رسالوں میں مضامین اور نظمیں شائع ہو رہی ہیں "مذہب خطرہ میں ہے"۔ اخلاق تباہ ہو رہا ہے۔ راستوں پر یہی باتیں ہو رہی ہیں لیکن کہیں مخالفت کرنے والے کھل کر صاف صاف یہ نہیں بتاتے کہ واقعی ان چیزوں کا وجود کہاں ہے؟ ان سے کن لوگوں کو نقصان پہنچے؟ اس مزعومہ بداخلاقی نے تہذیب کے کتنے ستون ڈھائے وغیرہ وغیرہ" اس سے یہ صاف مترشح ہوتا ہے کہ نئے ادب پر بداخلاقی پھیلانے کا جو الزام لگایا جا رہا ہے اس کی بنیاد کچھ نہیں ہے۔

یہ متضاد باتیں دیکھ کر اگر ایسا محسوس کیا جائے کہ ہمارے ان دوستوں کے ہاتھ میں "انکار کا کھلا نشتر ہے اور واقعیت کی آستین

میں عریانی کی ترویج کا دشنۂ پنہاں ہے، تو جائے تعجب نہیں۔ اگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے تو وہ ما بعد الطبیعیاتی رنگ والے کلیاتی قسم کے اصول بیان کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ "جزئیاتی مادیت" کی طرف توجہ کریں۔ اور صاف لفظوں میں یہ بتائیں کہ ادبِ لطیف کے مذکورہ بالا سالنامے میں جو افسانوی ادب شائع ہوا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ فحاشی کے تحت میں آتا ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر "ٹیڑھی لکیر" "بو" "بدماش" وغیرہ افسانوں اور "مہترانی" نظم کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ "پسینہ" اور "لحاف" کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ آیا ان کے اخلاقی شامہ کو مذکورہ بالا لٹریچر میں فحاشی کی بدبو محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض کمیونسٹ "پسینہ" اور "لحاف" کی تعریف فرما چکے ہیں، جس سے عریانی و فحاشی کے متعلق کمیونسٹوں کے واقعی نقطۂ نظر کے بارے میں خواہ مخواہ شک ہوتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے موجودہ ہنگامے میں سیاسی و ہنگامی مصلحت کا کتنا حصہ ہے اور ان کی اخلاقی جبلت کا کتنا ــــ؟

محمد حسن عسکری صاحب نے نئے ادب کے ان عریاں پہلوؤں سے اختلاف رکھنے والوں سے یہ خواہش بھی کی ہے کہ "فحاشی کی تعریف کریں اور اس کی روشنی میں نئے ادیبوں اور شاعروں کی بے عنوانیاں گنائیں"۔ اس سلسلے میں مختصر طور سے یہ گزارش کی جائے گی کہ منظومات و منثورات کا وہ حصہ جس میں "جنسیاتی اعضا و جنسیاتی تعلقات" کا تہیج خیز استلذاذی یا تہییجی عنوان سے ذکر ہو فحاشی و عریانی کے تحت میں آتا ہے۔ اب خواہ اس کا ارتکاب پرانے شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہو یا نئے شاعروں اور ادیبوں نے ادب کا یہ حصہ مذموم ہے اور قابلِ نفرت!

سوال ہوگا کہ ادب کا یہ حصہ مذموم کیوں ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ایسا ادب ہماری اخلاقی زندگی گھنونی کرتا ہے۔ اس سے ہمارے معاشرتی و تمدنی رجحانات میں عفونتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یا شاید کہا جائے کہ "اخلاق و کردار کو کوئی اٹل اور معین مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اخلاق کا مفہوم ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا۔ ایسی صورت میں اخلاقی زندگی کا گھنونا ہونا یا نہ ہونا اعتباری چیز ہے" اصل یہ ہے کہ اس قسم کی موشگافی کرنے والے "اخلاق" کا رسمی مفہوم مراد لیتے ہیں لیکن اس کا "فلسفیانہ مفہوم" سامنے نہیں رکھتے۔

یہ بات شاید قابلِ بحث نہیں ہے کہ نوعِ انسانی کے پاس اگر ایک طرف عقل ہے تو دوسری طرف جذبات۔ اگر جذبات عقل کی رہنمائی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو پھر فردِ متعلق کی زندگی صحت اور خوشی دونوں سے محروم ہو جاتی ہے جذبات کی نوعیت نہایت طوفانی ہوتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ عقل کی پختگی سے پہلے اس میں شدت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر جذبات کے سیلاب کا بند مضبوطی سے نہیں باندھا جاتا تو پھر انفرادی و اجتماعی بہبود کے سارے انسانی میلانات خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں اور طوفان کی اس غارتگری کی حالت میں جسمانی صحت تک باقی نہیں رہ جاتی۔ حیوانات میں جبلت طاقتور ہوتی ہے وہ ایسے اوقات میں ان کی حفاظت کرتی ہے۔ انسان اپنی اس ارتقائی منزل میں اپنی جبلتیں حیوانات کے مقابلے میں بہت کمزور کر چکا ہے۔ لے دے کے اس کے پاس عقل ہے اسی کی رہنمائی میں جذبات کی حد بندی ہو سکتی ہے۔ اس حد بندی کے بعد یہ جذبات بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں۔ جنسی جذبات کی اہمیت اس معاملہ میں اور زیادہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنسی اشتہا انسان کی جذباتی دنیا میں اپنی تولیدی خصوصیت کی وجہ سے ایک ایسے محور کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جس کے ارد گرد حیوانی نفسیات گردش کرتے ہیں۔ یہ اشتہا اگر ٹھیک راستہ اختیار کر سکے تو بہت مفید ہو سکتی ہے اور اگر غلط راستہ اختیار کر لے تو پھر خطرناک نقصانات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس اشتہا کی اگر عقل کی ہدایت سے حد بندی نہیں کی جائے گی تو اس کے چند نقصانات تو واضح ہی ہیں جنسی قوتوں کا وقت سے پہلے اضمحلال، جنسی بیماریوں کی زیادتی، کثرتِ جرائم اور اس طرح کی دوسری بہت سی خرابیاں ہیں جنہیں موجودہ دنیا کی مادی نگاہیں دیکھ سکتی ہیں۔ ان نقصانات کے ماسوا بہت سی روحانی مضرتیں بھی ہیں جن کا احساس لطافتِ احساس پر موقوف ہے حیوانی جذبات کی عقل کی ہدایتوں کے ماتحت حد بندی ہی اخلاق ہے۔ اس حد بندی سے عام لطافت پیدا ہوتی ہے۔ صحتِ بدنی میں تازگی کا خون دوڑتا ہے۔ حق پرستی، بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کا نورِ انسانیت کی جبیں میں ظاہر ہوتا ہے۔ جذباتِ انسانی کی حد بندی کرنے والی عقل کی ہدایتوں کا مجموعہ ضابطۂ اخلاق کہلاتا ہے۔ یہ درحقیقت سالہا سال کے انسانی تجربوں کا نچوڑ ہے اس لئے بیک جنبشِ قلم اسے مسترد کر دینا ہمارے لئے مضر ہی ہوگا، مفید نہیں۔

اس ضابطۂ اخلاق کے اساسی اصول اقتصادی و معاشرتی و تمدنی نظامات کے بدلنے کی وجہ سے نہیں بدلتے۔ مصادیقی نوعیتوں میں تغیر ہو سکتا ہے مگر مصادیق کے بدلنے سے اخلاق کے اساسی اصول

و قوانین میں تغیر نہیں ہوتا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں جبکہ دولت ایک خاص طبقہ کا حصہ ہو جاتی ہے اور اس لئے انسانوں کی بڑی تعداد ان کے دست نگر ہونے پر مجبور ہوتی ہے تو بہت سی باتوں کا۔ سمی اخلاق کی دنیا میں رواج پذیر ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن جب یہ نظام مٹ جائے اور اس کی جگہ دوسرا اقتصادی نظام مثلاً اشتراکیت آ جائے تو سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیت کی وجہ سے جو اخلاقی باتیں رائج ہوئی تھیں ان کا بدل جانا ضروری ہے۔ جب معاشرت میں غریب و امیر کے طبقے باقی نہ رہے تو پھر غریبی و امیری کے باہمی اقتصادی ارتباط کی وجہ سے جو اخلاقی تعلقات پیدا ہوئے تھے وہ کیونکر باقی رہ سکتے ہیں؟ مگر یہ تغیر ویسا ہی تغیر ہے جیسے ایک کپڑے پر مختلف رنگ چڑھتے رہتے ہیں۔ ایک ململ کا دوپٹہ ہے آج وہ ہرا رنگ لیا گیا کل سُرخ رنگ۔ مگر ان تغیرات سے اس کے اصلی جوہر (ململ ہونے) میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ سیاسیات و اقتصادیات کے دباؤ کی وجہ سے دیانت و راستبازی کے مصادیق و محامل میں ایک حد تک تغیر ہو سکتا ہے مگر ان کا کلی جوہر محفوظ رہنا ضروری ہے۔ عفت و پاکبازی کے اخلاقی تعلقات تعیناتی شکل میں کتنے ہی بدل جائیں لیکن ان کی وہ جوہری خصوصیت جس سے انسان کی جسمانی و روحانی صحت محفوظ رہتی ہے باقی رہنا یا رکھنا ناگزیر ہے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی ایسا نظام ہے جو اس جوہر کو برباد کرنا اپنے پیش نظر رکھتا ہے تو وہ نظام شیطانی ہے اور اس کا مٹا دینا نوع انسانی کی انفرادی و جمہوری بہبود کے لئے ضروری ہے۔

مختصر لفظوں میں جنسیاتی اعضا و جنسیاتی تعلقات کا استلذاذی یا ہیجنی نقطۂ نظر سے ذکر کرنا اسی ضابطۂ اخلاق کو نقصان پہنچاتا ہے۔ مانا کہ آلودۂ مادیت دنیا کی مادی نگاہیں ان مضرتوں کا احساس نہیں کر سکتیں جو انسانی زندگی کے لطیف حصوں کو اس استلذاذی تذکرہ سے پہنچ سکتی ہیں لیکن اس کا احساس تو ان نگاہوں کو بھی ہو سکتا ہے کہ ان خواہ مخواہ کے جنسیاتی اذکار سے انسان ہر وقت اعصابی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور اس پیہم و مسلسل کشمکش سے جنسی قوتوں کا قبل از وقت اضمحلال ناگزیر ہے اور یہ نقصان نہایت وسیع الذیل ہے۔

اس مقام پر یہ عذر کہ "موجودہ دور میں جسے فحاشی کہا جاتا ہے وہ دراصل فحاشی نہیں ہے بلکہ انسان کے جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل ہے جس سے ناواقفیت خطرناک ہے" قابل قبول نہیں ہے جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل سے اختلاف نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں استلذاذی پہلو نہ پیدا ہونے پائے کہ اس سے اعصاب میں ہیجانی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل اگر علمی حیثیت سے ہو تو یہ قابل اعتراض نہیں بلکہ ضروری شے ہے۔ جنسیاتی اعضا و جنسیاتی تعلقات فقہ میں، ڈاکٹری میں، نفسیات میں موضوع بحث بنتے ہیں مگر ان کی حیثیت کچھ اور ہی ہوتی ہے ان کا عنوان نظر وہ نہیں ہوتا جو نئے ادب کا ہوتا ہے۔ "سپاہی" اور "لحاف" میں استلذاذی پہلو بہت زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ ایسی جنسیاتی تحلیل جو ان افسانوں میں ہے علمی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ استلذاذی کیفیت رکھتی ہے جو "خضخضہ اور سحق" کے غیر فطری جنسی بدعملیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح سالنامہ ادب لطیف میں ایک نئے ادیب کے قلم کا ٹپکا ہوا افسانہ ہے "بُو" اس کا پلاٹ کیا ہے کہ ایک نوجوان اپنی جنسی تسکین کے لئے ایک گندی میلی کچیلی لڑکی کو جس کے کپڑے بارش کے پانی سے تر بتر ہو رہے ہیں اپنی جنسی تسکین کے لئے منتخب کرتا ہے اور اس سے اس کی جنسی اشتہا آسودہ ہوتی ہے لیکن اسی نوجوان کو جب اپنی بیاہتا نئی بیوی سے جو تعلیم یافتہ بھی ہے جنسی یکجائی کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذوق آسودہ نہیں ہوتا — غرضکہ ایک بگڑے ہوئے نوجوان کی گندی زندگی کے گندے جزئیات کی گندی زبان میں تفصیل کی گئی ہے اور خوب مزے لے لے کر۔ اسی طرح ایک دوسرا افسانہ ہے "بدماش" اس کا پلاٹ یہ ہے کہ اچھے گھرانے کی ایک خاتون نے جنسی تسکین حاصل کرنے کے لئے ایک یوربن عورت کا لباس پہن کر ایک بدمعاش کے سامنے رات کے اندھیرے میں اپنے کو پیش کر دیا ہے۔ بدمعاش نے اسے یوربن سمجھ کر پکڑ لیا ہے اور اس سے اپنے کمرہ میں منہ کالا کیا ہے۔

اس قسم کے سیکڑوں رنگ و بو رکھنے والے اوباشانہ افسانے اور نظمیں ہیں جنہیں فخریہ طور سے نئے ادب کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ تمام دفتر بے معنی فحاشی کے تحت میں آتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جنسیاتی بدعنوانیاں ہمارے معاشرہ میں ظہور پذیر نہیں ہوتیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جنسیاتی بدعنوانیاں بہت ہی مکروہ شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ "جوانی دیوانی" کا مقولہ جنسیاتی خواہشوں کی گدگدیوں اور ان کے خطرناک نتائج ہی کی تفسیر ہے۔ انسانی زندگی کے اس پہلو سے ہر مرد و عورت کا ازدواجی تعلق سے پہلے علمی واقفیت مفید ہے مگر جس ادب کا ذکر کیا گیا

ان کی نوبت ہی نہیں ہے۔ اسے پڑھ کر جنسی مسائل سے واقفیت اگر کسی قدر بہم پہنچتی ہے تو اس سے کہیں زیادہ پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کی رگوں میں جنسیاتی جذبات کی ہیجانی بجلیاں دوڑنے لگتی ہیں۔ یہ ہر وقت کی ہیجانی زندگی انسان کے اعصابی استحکام کے لئے مفید نہیں ہے۔ اس سے اخلاقی نظام کو دھچکا پہنچتا ہے۔ اس قسم کی فحاشی کی بہت سی لفظی تصویریں پرانے ادب میں بھی نظر آ سکتی ہیں ممکن ہے کہیں کہیں ان میں یہ رنگ زیادہ شوخ ہو۔ مگر وہ تصویریں بھی مستحسن نہیں سمجھی جا سکتیں۔ عربی میں امراؤ القیس، ابو نواس وغیرہ کے یہاں فحاشی کے بہت کردہ نمونے ملتے ہیں۔ فارسی میں بھی ابو علید زاکانی وغیرہ کے یہاں یہ چیزیں ہیں۔ بہار دانش کی شرح کی حکایتوں میں یہ عنصر بہت زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ اردو میں بھی مختلف مثنویوں۔ واسوختوں اور غزلیہ شعروں میں فحاشی کی گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ میں ان تمام چیزوں کو ناپسند کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں تو ان نالیوں کا منہ بند کر دینا جن کے ذریعہ سے یہ عفونتیں ہمارے ادب میں پہنچتی رہتی ہیں حقیقی "ترقی پسندی" کا ایک پہلو ہے۔

"انتقام" اور "لب جوئبار" سی عریاں نظموں کی تاویل میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے عالمانہ قسم کی تاویلی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا گیا ہے مگر ان کی اس ذہنی مشق خصوصہ سے "انتقام" و "لب جوئبار" کا بھدا جنسیاتی ننگاپن ڈھکا نہیں جا سکتا۔ ایک اجنبی عورت سے "زنا" کی شکل میں ملک کی غلامی کا قصاص لینے یا ایک دوشیزہ کو پیشاب کرتے دیکھ کر ہاتھوں کی مدد سے جنسی تسلی حاصل کرنے کا تذکرہ اچھا خاصا عریاں ادب ہے۔ اس طرح کی تاویل تراشیوں سے کہ "انتقام" کا مصنف خود اپنے کو طعنہ دے رہا ہے۔ خود اپنے اوپر استہزا کر رہا ہے یا "لب جوئبار" کا مصنف اس عنوان سے سوسائٹی کی حالت پر طنز کر رہا ہے جس میں اسے اپنی جنسی تسلی کا سامان ہاتھوں کے سوا اور کہیں نہیں ملتا فحاشی کا عیب ان سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ بداخلاقیوں کے ارتکاب کا مزہ لے لے کر ذکر کرنا اب خواہ اس حالت میں اپنی اس اخلاقی دناءت پر رسمی طور سے دو آنسو بھی بہائے جائیں اخلاقی زندگی کی تعمیر میں مدد نہیں دے سکتا یوں تو مہمل سی مہمل اور گھنونی سے گھنونی نظم میں سیاسی اور اخلاقی پہلو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ نکالے ہی جا سکتے ہیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ادبی و شعری ذوق سے یکلخت ترک موالات اختیار کر لی جائے اور متعصبانہ نوعیت رکھنے والی باتیں خود فراموشانہ لہجہ میں بیان کر دینا ادبی و شعری اعتقاد کی معراج سمجھ لی جائے۔

ذوق کے اسی پھوہڑپن کا یہ نتیجہ ہے کہ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" میں شعری حسن نظر آ جاتا ہے۔ اور اس فریب نظر میں مبتلا ہو کر کہ "ان کے دل کی گہرائیوں کو کوئی خاص سیاسی مسئلہ چھو رہا ہے"۔ جس سیاسی مسئلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے اسے کون محسوس نہیں کرتا یہ اس دور کا بہت ہی عام مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کے بیان کے لئے پیرایہ اظہار کتنا دلکش اختیار کیا گیا ہے۔ بات تو یہ ہے کہ جب شدت احساس کی بلندیوں کو جوبن والوں کے لٹکوں اور "چناجور گرم" کی بانیوں جیسی شاعری میں محسوس کیا جائے گا تو پھر شاعری کے لئے نغمہ آفریں اوزان، پیچھے متعلق جذبات کی تصویریں اور اسلوب بیان کی رنگینی کی اہمیت کیا سمجھی جائے گی۔ معانی و بیان و بدیع کے نکتے ان کانوں پر بار ہونا ہی چاہیے جن کی نظر میں "جمالیاتی تنظیم" اپنے حقیقی مفہوم سے مسخ ہو کر صرف ان نئے شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہیں جو "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" یا "گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود" جیسی نظموں کے خوشاب لعل و جواہر کے مالک ہیں۔ اگر جمالیاتی تنظیم کا مصداق یہی ہے تو پھر اس سے کہیں زیادہ جمالیاتی تنظیم تو ان مسائل کے متعلق سیاسی خطیبوں کی تقریروں اور سائنس کے خشک مسائل بیان کرنے والوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انہیں چیزوں سے کیوں نہ جمالیاتی تنظیم کا کیف حاصل کیا جائے؟

نئی شاعری اور ادب کا خدا سے ٹھٹول

نئی شاعری پر مذہب، اور خدا سے ٹھٹول کا جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کے جواب میں محمد حسن عسکری صاحب فرماتے ہیں: "آزاد خیالی کے لئے خدا سے انکار اب اتنا ضروری نہیں جتنا دس سال پہلے تھا۔ نئے لکھنے والوں میں زیادہ تر لوگ انکار د اقرار کے مسئلے کو اتنی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ ہمیں انکار یا اقرار دونوں میں سے کسی پر اعتراض نہیں ہے۔ یہی نقطۂ نظر کمیونزم کا ہے۔" لیکن جوش صاحب جو رندان ادب جدید و قدح خواران اشتراکیت کے ایک حیثیت سے پیر مغاں ہیں۔ ایشیا کے اگست نمبر ۱۹۴۳ء میں "ادب اور احتساب" کے مقالہ کے ضمن میں فرماتے ہیں "ترقی پسند ادب مردانہ وار اس کا ذکر کرتا ہے کہ وہ معروف خدا اور مذہب کے باب میں علم رائے سے بالکل مختلف رائے رکھتا ہے۔" "نیا ادب خدا اور مذہب

کے معروف تخیل کے خلاف آواز ضرور بلند کرتا ہے۔" جوش بھی کمیونسٹ ہیں۔ ان کے ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب اور نئے ادب کی حیثیت خدا اور مذہب کے بارے میں تماشائی کی نہیں ہے اس سے معروف خدا اور مذہب کے اقرار پر اعتراض ہے اور وہ مردانہ وار اس کا ذکر کرتا ہے۔ اب کس کی بات مانی جائے اور کس کی نہ مانی جائے۔ بہرحال نئے ادب کی حیثیت انکار یا اقرار کے بارے میں کیا ہے؟ اس تحقیق کی یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ گزارش صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی صاحب خدا کے معروف تصور سے اختلاف رکھتے ہیں تو جب تک کہ یہ چیز سنجیدگی کے ساتھ علمی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے تو یہ محل اعتراض نہیں لیکن جب سنجیدگی کی حد سے ہٹ کر "انکار" کو مشغول اور استہزا کا لباس پہنایا جائے گا تو یقیناً یہ امر اپنی دلآزاری کی وجہ سے قابل اعتراض قرار پائے گا۔ نئی شاعری میں خدا کا جو ذکر کیا جاتا ہے اس کا عنوان استہزا و طنز ہی کا ہوتا ہے "رہی ہے حضرت یزداں سے دوستی میری" اور "خدا ہے تو پشیماں ہو جائے" "بے بسی میرے خداوند کی تھی" کی قسم کی نظموں کا اسلوب بیان "استہزائی نوعیت" رکھتا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان نظموں کا کہنے والا اشتراکی نہیں ہے بلکہ اسلام کے معاشی نظام کو بہترین سمجھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اور زیادہ حیرت خیز ہے۔ اپنے معبود کے ساتھ اس طرح کا استہزا پسندیدہ نہیں ہے۔ اقبال کے طنز کی صورت اور ہے۔ اس کے "شکوے" میں مذہب کی توہین کے عناصر نہیں پائے جاتے اور اگر کہیں کچھ شوخیاں ہیں تو "جواب شکوہ" ان کی تلافی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اقبال کے یہاں ایسی استہزائی شوخیاں پائی جاتی ہیں تو میں اس پر بھی اسی شدت سے اعتراض کروں گا اور انھیں سراہا نہیں جا سکتا۔

نئی شاعری اور ابہام

نئی شاعری پر ابہام کا جو اعتراض کیا جاتا ہے اس کے جواب میں ادعائی باتیں مغربی نقادوں کی تقلید کرتے ہوئے متکبرانہ اسلوب میں دہرائی جا رہی ہیں۔ چنانچہ عسکری صاحب نے ایک خاص قسم کے عجب و تمسخر کے ساتھ فرمایا ہے۔" پھر کسی پڑھے لکھے آدمی کے پاس جا کر پوچھیں تو وہ آپ کو سمجھائے گا کہ تنقید میں معنی سے مراد محض لغوی معنی نہیں ہوتے بلکہ اس مفہوم میں" ارادہ۔ لہجہ۔ فضا اور مزاج" بھی شامل ہیں"۔ تنقید میں معنی کے مفہوم کو وسعت سہی تاہم شعر کے ذاتی حسن کی آئینہ دار یہ معروضی و خارجی چیزیں بہت ہی جزوی طور پر ہو سکتی ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اچھے شعر کے لغوی معنی جان لینے سے شعر کی معنوی لطافت کا ادراک نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے لغوی معنوں کی لطیف پرچھائیوں کا احساس بھی ضروری ہے۔ اس کے لئے ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔ جناب حسن عسکری صاحب کی خود پسندی کے شیشہ کو خواہ ٹھیس ہی لگے مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ خواہ" ارادہ۔ لہجہ۔ فضا۔ مزاج" اور شعر یا نظم کا "پس منظر" کتنا ہی سمجھ ڈالیں مگر لغوی معنی اور ان کی لطیف پرچھائیوں کے احساس کا جب تک آپ کو ذوق حاصل نہیں ہوا ہے آپ کی تنقیدوں سے بدمذاقی ہی کی بو پھوٹتی رہے گی۔ اسی ذوق سے محرومی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ کی تنقیدوں میں ارادہ۔ لہجہ۔ فضا۔ مزاج اور پس منظر کا تذکرہ تو ہوتا ہے لیکن لغوی معنی سے لپٹی ہوئی ہلکی ہلکی پرچھائیوں کے احساس کا کہیں نشان نہیں ہوتا۔ اور ان کی حیثیت بیشتر اس طرح کی ہوتی ہے جیسے کسی نوعروس کے حسن کے اندازے کے لئے حجلہ کی زیبائش و آرائش اور مشاطہ کے چہرے مہرے کا جائزہ لیا جائے۔ آپ اس جائزہ کو بڑے بڑے لفظوں کے سہارے عروس کے خال و خط کے حسن کے اندازے کا صحیح معیار ثابت کرتے رہیں مگر خوش ذوقی آپ کی اس کور ذوقی کو خندۂ تحقیر ہی کا مستحق سمجھے گی۔ ان نئے ادیبوں کو یہ کیونکر سمجھایا جائے کہ مغربی نقادوں کی یہ باتیں جب تک کہ اچھے طریقہ سے سمجھ نہ لی جائیں ماننے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ ان مغربی نقادوں میں بھی ہر طرح کے دماغ پائے جاتے ہیں۔ ناپاک دماغوں کی ان میں کمی نہیں رہی ہے۔ آپ سوچ سمجھ کر ان مغربی نقادوں اور شاعروں سے استفادہ کر سکتے ہیں اور جی چاہے تو اپنی زبان کے مزاج اور لہجہ کا خیال رکھتے ہوئے ان کی تقلید بھی کر سکتے ہیں مگر کچھ تو اپنی "فکری حریت" کا بھی پاس رکھئے۔

مرکزی جذبے کی بہ نسبت ماتحت جذبات اور پھر آگے چل کر ان کے لطیف سایوں اور باریکیوں کی اہمیت تمدن اور ادب کی ترقی کے ساتھ کتنی ہی بڑھ جائے مگر باکمال شاعر اور ادیب جب ان کی مصوری اور نقاشی کرے گا تو اس میں تعقید نہیں پیدا ہوگی۔ یہی حقیقی شاعری کا کمال ہے۔ میراجی وغیرہ کی نظموں میں جو ابہام پایا جاتا ہے وہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے آپ کی زبان میں" اپنے اعصاب کو اکڑا لیا ہے اور احساس پر پہرے بٹھا دیے ہیں"۔ بلکہ یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ شعر و ادب سے ان کھل کھیلنے

والوں نے انھیں نظم کرتے وقت اپنی دماغی مشین کے بہت سے پرزے ڈھیلے کر ڈالے تھے اور اب آپ جو ان شعروں کو مبہم نہیں سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اس قسم کے شعروں پر غور کرتے وقت اپنے دل و دماغ کو قلابازیاں کھلاتے چلتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ قلابازیاں "غازیانِ علم و فضل" کے طبل کی آواز پر اکڑ اکڑ کر کھائی جاتی ہیں۔

آخر میں آپ کھل ہی گئے۔ ابہام جو حقیقت میں تعقید سے مختلف کوئی چیز نہیں ہے آپ کی نگاہ میں کوئی شعری نقص ہی نہیں۔ نئے ادیبوں کی تاویلوں کا جو عنوان ہوتا ہے اسے اگر ان منطقی حدوں تک لے جایا جائے تو دنیا میں کوئی شعری نقص رہتا ہی نہیں۔ کولرج اور ایلیٹ کی رائیں آپ بیکار رٹاتے ہیں۔ انھیں آپ تعویذ بنا کر اپنے ادبی ذوق کے گلے میں ڈالے رہیے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جائیگا کہ ان کے جو اقوال آپ نے نقل کئے ہیں وہ قابلِ نظر ہیں۔

کولرج کا یہ خیال کہ "شعر سے ہم اس وقت زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں جب ہم نے اسے پوری طرح نہیں بلکہ جزوی طور سے سمجھا ہو" اگر کوئی مابعد الطبیعاتی حیثیت رکھتا ہے تب تو خیر، ورنہ اس کے معنی ہی کیا ہوئے کہ جب ہم کسی چیز کو جزوی طور سے سمجھیں تب اس سے زیادہ لطف اندوز ہوں۔ اگر ہم کسی چیز کو پورے طور سے سمجھ لیں گے تو ہماری لطف اندوزی میں آخر کیوں خلل پیدا ہوگا؟ شعر کے معنی اور اس کی پرچھائیوں کا جتنا مکمل احساس ہوگا اسی قدر لطف اندوزی کا زیادہ موقع ہونا چاہئے بشرطیکہ وہ شعر فی الحقیقت کوئی حسین حقیقت رکھتا ہے۔ البتہ اگر شعر کوئی نقص رکھتا ہے تو پھر اس کے معنی اور اس کی پرچھائیوں کے مکمل احساس کے بعد لطف اندوزی میں ضرور کمی ہو جائے گی۔

ایلیٹ کا قول کولرج سے زیادہ محتاطانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسے کہنے دیجئے کہ ہم لغوی معنی سمجھے بغیر بھی شعر کو سمجھ سکتے ہیں۔ آپ خود اپنے عقل و ذوق سے فتویٰ حاصل کیجئے کہ آیا لغوی معنی سمجھے بغیر شعر کو سمجھا جا سکتا ہے؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ میں سنسکرت یا فرانسیسی زبان نہیں جانتا لیکن میں اس کے اشعار کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے تو اپنے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہے۔ نئے ادیب اگر اس فریب میں مبتلا رہنا چاہتے ہوں تو رہیں۔ شاید ٹی ایس۔ ایلیٹ کا مطلب یہ ہو کہ یہ ممکن ہے کہ ہم کسی شعر کے لغوی معنی نہ سمجھتے ہوں مگر اس کے الفاظ کی موسیقیت و ترنم کی وجہ سے ہمارا سامعہ لطف اندوز ہو جائے۔ لیکن اگر یہ مطلب ہے تو حسن عسکری صاحب کے خیال کی اس سے تائید نہیں ہوتی۔ یہ "شعر کا سمجھنا" نہ ہوا الفاظ کے کھنکوں اور روانی سے طرب اندوز ہونا اور بات ہے اور شعر کا سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی دوسری بات۔ ہمارے نوجوان نئے ادیب اسی قسم کے اقوال سے غلط راستے پر پڑ گئے ہیں اور اپنے ادبی ذخیرہ میں ان مہملات و خرافات کو بھر رہے ہیں جن کے ساتھ آگے چل کر وہی سلوک ہونے والا ہے جو انقلاب روس کے بعد والے اُس لٹریچر کا ہوا جو اب سوسائٹی کی نگرانی میں پیدا ہوا تھا۔ نئے ادب ہی کے بیشتر خد و خال اس دور کی شعری کائنات میں بھی پائے جاتے تھے۔ یہی وزن سے دشمنی۔ یہی عریانی یہی ابہام و ژولیدگی و تعقید مگر اس تمام ادب کا حشر روس میں بہت ہی خراب ہوا تھا عطاروں اور پنساریوں کی دکانوں میں اس سے پڑیاں باندھی گئیں بچا کھچا حصہ نذرِ آتش کیا گیا اور اس شعر کے ذخیرہ کے مالکوں کو سائبیریا میں جلا وطن کیا گیا۔ کاش کہ ہمارے نئے ادیب ان باتوں سے عبرت حاصل کریں اور ایسا ادبی سرمایہ مہیا نہ کریں جس سے بعد میں یہی سلوک کیا جائے۔

قندِ پارسی

سید مقبول حسین احمد پوری

دلِ من اندر دو جہاں [illegible] دیدن خواہد
زبانِ [illegible] دیدن خواہد

در ہوائے تو [illegible] آفتاب و [illegible]
[illegible] آوردن خواہد

بہ خلش آمدہ چوں نارِ غم [illegible] دل
یا دلی لذتِ دیرینہ چشیدن خواہد

آتشِ سوزِ محبت زد و نور [illegible]
بر [illegible] طور [illegible] آں نور دمیدن خواہد

نغمۂ روزِ ازل در دلِ من برخیزد
باز آں ناوکِ چشمِ تو خلیدن خواہد

خستہ جان خستہ دل و خستہ جگر گشتہ تو
بفلک کردہ نظر آہ کشیدن خواہد

باز تا خواجۂ دلہا دلِ مقبولِ غریب
بیکس و بے بس و بے مایہ رسیدن خواہد

شفق ٹونکی

عورت کا انقلابی دور

وہ عورت جو کبھی زندانیٔ قندیلِ خلوت تھی — وہ عورت جو کبھی بیگانۂ تخئیلِ جلوت تھی
وہ عورت جس سے بزم و رزم دونوں جلوہ پیرا تھیں — وہ عورت کائناتِ دہر پہ جس کی حکومت تھی
وہ عورت جو نگاہ و روح میں بھرتی تھی رنگینی — وہ عورت زندگی کی سرخوشی جس سے عبارت تھی
وہ عورت جس نے بخشا تھا وقار و اوجِ عالم کو — وہ عورت جو کبھی سرمایۂ توقیرِ عظمت تھی
کبھی جو بزمِ کیف و رنگ میں تھی خالقِ مستی — کبھی جو رزم گاہوں میں ادا دانِ شجاعت تھی
صفا و صدق کا تھا پاک جوہر جس کی فطرت میں — وفا و حسن کی دوشیزگی جس میں امانت تھی
ضیائے ماہ سے بڑھ کر تھی جس کی عصمت آرائی — شمیمِ لالہ و گل سے زیادہ پاک عفت تھی
درخشاں جس سے تھا نور و ضیا کا آئینہ خانہ — کہیں صبحِ صباحت تھی کہیں شامِ ملاحت تھی
حجاب اندر حجاب و جلوہ در جلوہ بہر صورت — کہیں سادہ کہیں رنگیں اک عنوانِ فطرت تھی
امورِ خانگی کافی تھے جس کے دل بہلنے کو — وہ جس کو اپنے گھر کی چار دیواری بھی جنت تھی
ہوا اس میں پرورش اولاد کی یا گھر کی رکھوالی — ادائے فرض پر ہر وقت آمادہ طبیعت تھی
جسے ہر وقت اک کارِ اہم درپیش رہتا تھا — جسے بیکار رہنے کی نہ عادت تھی نہ فرصت تھی
مروت، عزم، جرأت، صلح کوشی و وفا کیشی — کمالِ خلقِ انسانی کی حاصل جس کو دولت تھی
لچک تھی نرم کونپل کی طرح جس کی طبیعت میں — سراسر پیکرِ نزہت تھی انبارِ نزاکت تھی

وہی عورت جو تھی میخانۂ سرشاریٔ عالم
وہی عورت جو تھی ہنگامۂ بیداریٔ عالم

جہاں میں سو طرح سو رنگ سے جنت نشاں بن کر — زمیں کی پستیوں پر ارتقا کا آسماں بن کر
یکایک جانبِ پستی نظر آنے لگی مائل — بنالی روح کی محفل میں اپنی مادی منزل
ترقی سے تنزل کی فضا پر چھا گئی آخر — نحوست اور بلاؤں کے گھن میں آ گئی آخر
سکونِ زیست نے ہر گام پر سو ٹھوکریں کھائیں — ہوئی آسودگی مجروح روحِ امن تھرائی
قیودِ بام و در سے نفرتیں پیدا ہوئیں دل میں — حجابِ مستقل سے وحشتیں پیدا ہوئیں دل میں
سرِ محفل بہ اندازِ حسیں رخ سے نقاب اٹھا — نسائی زندگی میں ایک حشرِ انقلاب اٹھا
زمانے بھر کی نظروں کا نشیمن بن گئی عورت — ہزاروں نو بہ نو فتنوں کا مامن بن گئی عورت
حیا رخصت ہوئی رنگِ شرارت نے جگہ پائی — حقیقت ہو گئی باطل تصنع نے جلا پائی

ازل سے حسن جو عورت کی فطرت کو ودیعت تھا
ہوا قائم تھے سامان سے عنوان ہستی کا
ہوائے مغربی چلنے لگی آندھی کی صورت میں
سکوں جلنے لگا بد امنیوں کی تیز آنچوں میں
ہوئی تہذیبِ نو کی شش جہت میں گرم بازاری
کہیں اب درس شوخی تھا کہیں تعلیم عریانی
نظر بیباک، دل آزاد، سرمستی تکلم میں
لب گفتار ہنگامہ فزائے شورش بدعت
تماشوں کی کہیں رونق کہیں جلسوں کی آرائش
مذاقِ حریت نے ندرتیں پامال کر ڈالیں
ہوئی تھی جو کبھی تعمیر کی توسیع میں کوشاں

وہ جوہر اب بگڑ کر ایک جنسِ بے حقیقت تھا
بڑھا ذہنِ رسا میں بانکپن فیشن پرستی کا
نسائیت نے لیں انگڑائیاں آغوشِ عصمت میں
قدامت رفتہ رفتہ ڈھل گئی جدت کے سانچوں میں
روایاتِ کہن پر جانکنی سی ہو گئی طاری
کہیں قربانگاہِ کفر پر مذہب کی قربانی
کہیں جادو ترنم میں کہیں بجلی تبسم میں
ہر اک کردار آوارہ خلافِ مذہب و ملت
کلب گھر کی کہیں زینت کہیں تھیٹر کی زیبائش
مقدس زندگی کی عظمتیں پامال کر ڈالیں
وہی اب بن گئی تہذیب کی تخریب کا ساماں

فغاں بر ایں ستم ہائے انقلابِ انجمن آرا
سپردی خدمتِ آزادگاں زلفِ چلیپا را

سید الیاس علی (گوالیار)

خوابِ التفات!

میری سوئی ہوئی قسمت کو جگایا تم نے   پردۂ ظلمتِ تقدیر ہٹایا تم نے
خارِ غم سے مرے دامن کو چھڑایا تم نے   داغِ رنجوریٔ دل، دل سے مٹایا تم نے
کل مجھے خواب میں سینے سے لگایا تم نے

ہاتھ میں ہاتھ دیا، ہاتھ بڑھایا تم نے   غرق ہونے سے سفینے کو بچایا تم نے
رحم حالِ دلِ بیمار پہ کھایا تم نے   ایک گرتے ہوئے بیکس کو اٹھایا تم نے
رو رہا تھا دلِ صد چاک، ہنسایا تم نے

مجھ سے پردہ نہ کیا، پردہ اٹھایا تم نے   غیر سمجھا نہ مجھے اپنا بنایا تم نے
رخِ پرنور سے آنچل کو ہٹایا تم نے   منظرِ طورِ تجلا ہوا کو دکھایا تم نے
عرش کو بھی مری نظروں سے گرایا تم نے

جام الفت کا مری سمت بڑھایا تم نے   نشۂ حسن بصد شوق پلایا تم نے
مجھ کو مستِ طرب و عیش بنایا تم نے   دل سے میرے غمِ ایام بھلایا تم نے
کیسا رنگین مجھے خواب دکھایا تم نے

سید طالب علی ایم۔ اے

بغداد کی گلیاں

اداکار

حسان :-	حلوائی	مسرور :-	غلام
سلیم :-	خریدار	اسحٰق :-	ظریف۔ درباری شاعر
دربان :-	...	رفیع درویش :-	باغیوں کا سردار
یاسمین :-	بیوہ معشوق	تمارسک۔ جونیر۔ دلو :-	ملازمین
ہارون الرشید :-	خلیفہ اور بادشاہ	کالی۔ گوری۔ گندمی :-	ناچنے والیاں
جعفر :-	وزیر	پروانہ :-	رفیع کی محبوبہ

پہلا سین

(حلوائی کی دوکان۔ تیسرے پہر کا سمے۔ حسان حلوائی اونگھ رہا ہے۔ سلیم ایک خریدار دکان پر کھڑا ہے۔ لوگ راستہ چل رہے ہیں)

حسان۔ ہائے۔ اف۔ ارے رے رے۔

سلیم۔ یہ رام رٹ کیسی۔ ہوا کیا؟

حسان۔ اوہ۔ ارے باپ رے۔

سلیم۔ جوڑی چڑھی ہے۔ چھاتی میں گھٹن ہے یا پیٹ میں گڑم دگم۔

ح۔ ہائے۔ اوف!

س۔ مُنہ ہے کہ کمرک۔ آنکھیں کھولو۔ مُنہ سے بولو۔ سر سے کھیلو

غم کے ٹکڑے کر کے دو لڈو بنالے بیوقوف

تیری خاطر جمع ہو جائیگی اس تدبیر سے

ح۔ ٹھیک ہے۔ کنتو۔

بیسن بھی لگا یا صابن بھی پر ماتھے کی کالک دھل نہ سکی

تم سمجھے سلیم۔ مجھے پریم ہو گیا ہے۔ عشق کا بھوت سر پر چڑھا ہے

ہائے اف ارے رے رے۔

س۔ پریم؟ عشق؟ ٹاٹ پر پلیتھی مارے بیٹھے ہو۔ کیوں؟ کیا مہارے چکلے اجڑ گئے؟

ح۔ اپنی جیبھ کو لگام چڑھاؤ۔ میں حلوائی حسان سہی۔ پر تو مجھے پریم ہو سکتا ہے۔ میری پیاری بیلی سے ایک سوت بھی کم نہیں ہے اور میں مجنوں ہوں مجنوں۔

س۔ بھی سے چوک ہوئی۔ مجنوں سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا تم گھل گھل کر ہاتھی ہو گئے۔ تمہارے ہردے کی بھٹی بہت تپ گئی ہے

ح۔ میں موٹا ہوں، بوڑھا ہوں، حلوائی ہوں، جل باہر والی مچھلی ہوں۔ اسی سے تڑپ رہا ہوں۔ ہائے اف فودا رے رے رے

س۔ وہ کون سی پری ہے جس نے تم کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ وہ کون سی پنچھی ہے جو بے پر کی اڑتی پھرتی ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔

ح۔ کلیجہ پکڑ لو تو سناؤں۔ آپ بیتی ہے۔ آنکھ دیکھی ہے۔ آج سے کیول تین دن ہوئے۔ ایک سپاٹ برقعہ والی آئی۔ حبشی حلوا خریدا۔ کہا دونا گھر پہنچا دو۔ میں لے چلا۔ جالی سے دونوں آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے شاہی باغ کی دودھ سے بھری دو نہریں۔ آواز تھی کہ بانسری کے بول۔ پتلی لچکدار کمر ایسی بل کھا رہی تھی مانو آندھی میں کھجور کی ٹہنی ہلتی ہو۔ گھر پہنچتے ہی وہ جھٹ سے اندر چلی گئی۔ دربان نے پٹ سے کواڑ بھیڑ دیئے۔ میں دیر تک ڈیوڑھی میں کھڑا سسکیاں بھرتا رہا کسی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

س۔ اور وہ کوٹھی ہے کہاں؟

ح۔ مبارک شاہ والی گلی میں۔

س ۔ میں بوجھ گیا۔ ہو نہ ہو یہ الکھت کی رانڈ ہے جس کو لبھری گیٹ
پر پھانسی دی گئی تھی۔
ح ۔ یہ دیکھو پھانسی کا وہی پھندا میرے گلے میں ہے۔
س ۔ کہو تو تمھیں ٹھیک کردوں۔
ح ۔ کیسے؟
س ۔ تم ٹونے ٹوٹکے۔ اڑن چھو۔ منتر جنتر۔ گنڈے تعویذ مانتے ہو۔
ح ۔ مانتا ہوں تو پھر؟
س ۔ اچھی سی اچھی مٹھائیاں۔ ایک بڑی سی بڑی تھوری (اچار) میں
رکھ کر اپنی پیاری کو بھیجو۔ کسی سے پھونک ڈلوا لو۔
ح ۔ میں تو بے بہرہ ہوں۔ تم بہرا ہو کسی کو بتاؤ۔
س ۔ الوپو سے جگرہ یہودی آیا ہوا ہے۔ اس کی کرامات سے سارا
شہر گونج رہا ہے۔
ح ۔ کیسی کرامات؟
س ۔ بخارا میں کسی نے ایک پتھر کھینچ مارا۔ وہ پتھر ہوا میں لٹک کر
رہ گیا۔ اور پتھر مارنے والا مسٹری بن گیا مسٹری۔ اصفہان کے
شاہی حمام کو اپنی ایک انگلی پر دیر تک نچایا پھر اسی میں نہا دھو کر
اسے اپنی جگہ واپس کردیا۔ قاہرہ میں اس نے تمام درباریوں کو
آدھ گھنٹہ کے واسطے بندر بنا دیا تھا۔
ح ۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔ تو میں جانوں
س ۔ جگرہ کی بیٹھک میں روگیوں کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں۔ پریم
بوتل دس دینار میں دیتا ہے۔ جہاں اس کا ایک گھونٹ بھی گلے
سے نیچے اترا وہاں محبوب ہو یا محبوبہ۔ پریم میں چکنا چور۔
ح ۔ یہ لو دس دینار اس کی ایڑی چوٹی پر نچھاور۔
س ۔ تمھاری یہ دری کتنے کی ہے۔
ح ۔ چھوڑو بھی یہ باتیں۔ دری دری ہے۔ عورت ہے عورت۔
یہ دستک کس کی ہے؟ میں ابھی آتا ہوں۔
س ۔ (اپنے آپ سے) یہ وہ ہے پر کیسی چنچل۔ کتنی سندر۔ راجکماری
ہوگی (قہقہہ) اس کی کوٹھی کا پتہ کیسے چلے گا۔ کیوں چلے۔ پریم
بوتل میں سنی ہوئی امرتیاں مہن بھوگ ہو جائیں گی۔ اب تو
پانچوں گھی میں ہیں۔
ح ۔ (لوٹ کر) بھیہ پارسی تھا۔ بھاؤ پوچھ رہا تھا۔
س ۔ تم نے بتا دیا؟ (مسکراتا ہے)
ح ۔ ہاں۔ اچھا تو پریم بوتل آج ہی آجائے۔

س ۔ میں نائی نہیں۔ مزدور نہیں۔ پیامی نہیں۔ تم آپ ہی کیوں
نہیں جاتے۔
ح ۔ مجھے اس کے لئے مٹھائیاں بنانی ہیں اور سورج ڈوبنے سے
پہلے پہنچانی ہیں۔
(سلیم جاتا ہے۔ حسان مٹھائیاں بناتا جاتا ہے۔ بھٹی پھونکتا
جاتا ہے اور اپنے آپ سے کہتا جاتا ہے)
کاش میں دھنی ہوتا۔ لکھ پتی ہوتا۔ اچھا ہی ہوا کہ ناخن نہیں ملے
میں حلوائی نہ ہوتا تو وہ سندرتا کی مورتی اپنا درشن مجھے کیوں
دیتی۔ اب میں اس کے لئے مٹھائیاں بناؤں گا۔ چنے اور ردتی
کی طرح گلاب اور سورج مکھی کی طرح۔ اور ہر پھول کے
دل میں پریم بوتل کی ایک بوند ہوگی۔

دوسرا سین

(حسان حلوائی ۔ دربان)

ح ۔ میری پیاری ان ہاتھوں تک پہنچ گئی نا؟
د ۔ دیکھئے نا۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔
ح ۔ ان گلابی پنکھڑیوں سے کن پھولوں کی برشا ہوئی؟
د ۔ میری جھولی خالی ہے!
ح ۔ لو میں پھر سے دیتا ہوں۔ ان کے [illegible]
کتنی لذیذ ہیں نا؟
د ۔ کہا پریمی کی آنکھوں پر وار (منہ پر چٹکار) مٹھائی ماتھے سے اچھی ہے
ح ۔ اہا ہا! اب تو سب کام سدھر گئے۔ تم نے کیا کہا۔
د ۔ میں نے کہا حلوائی کا ہر دے چھونے سمان [illegible]
کر کے رکھے ہیں۔
ح ۔ مٹھائیاں چکھیں بھی؟
د ۔ میں کیا جانوں۔ مگر دس منٹ کے بعد تھالی ایسی صاف تھی جیسی
یہ ہتھیلی!
ح ۔ تمہاری رانی کا نام تو بتا دو۔
د ۔ یاسمین!
ح ۔ ہائے یہ چاندنی اور یہ میٹھا نام۔
(دربان کو دروازہ بھیڑ دیتا ہے۔ حسان اپنے آپ سے کہتا ہے)
پریم بوتل نے کایا کلپ کر دیا۔ سورج کو چکر آگیا۔ یہ نرمل چاندنی
لہریں گاتی ہیں۔ پتھر تال دیتے ہیں (بانسری پر گاتا ہے) یاسمین
یاسمین۔ یاسمین۔ (گاتا ہے)۔

لالے کے داغ بنتے ہیں انگارے صبح کو کس آن بان سے
پیغام راز بھیجتا ہے وہ گلاب کو
اور گل بھی اپنے سر کو ہلاتا ہے یاسمیں
لیکن روپہلی بط جب اترتی ہے باغ میں وہ دوستوں کی صف
وہ نام ان کے نازک و شیریں لطیف تر
پڑتی ہے جس کی چار طرف چھوٹ یاسمیں
اپنے سحاب لطف سے برسا دے چند بوند چھٹکی ہے چاندنی
پھول سفید وہ لئے آتا ہے باغباں
پھولوں کی لاش جن کے اٹھائیگا یاسمیں
(یاسمین کھڑکی سے جھانکتی ہے)
اے نے نواز نام ہے میرا بھی یاسمیں
ڈر ہے مگر مجھے کوئی خوشتر ہے اور بھی
موتی یہ جس کے واسطے تو نے لٹائے ہیں

حسان - میری آنکھ میں ایک ہی یاسمین ہے اور وہ تم ہو۔

یاسمین - کیا تمھیں حسان حلوائی ہو؟

ح - ہاں - ہاں - ہاں،

یا - تمھارے بول رس گلّوں سے میٹھے ہیں۔

ح - تمھاری آنکھیں ہیں کہ بادل سے پری جھانک رہی ہے - ذرا نقاب سرکا دو۔

یا - کیسے اکھڑ ہو - انیلے ہو - تم نامحرم ہو۔

ح - جس سے دل مل جائے وہی محرم ہے۔

(صرف آنکھوں تک کھولتی ہے)

لو آنکھیں سینک لو - کلیجہ ٹھنڈا کر لو۔

ح - میں ایسا پیکر نہیں کہ ایک ہی کلمڑ میں ہتی بول دوں۔

یا - بن بادل بجلی کڑک جلئے گی - تم بھسم ہو جاؤگے - ہوشیار یہ لو بے نقاب ہو جاتی ہے، کہو اب بھی پسند کرتے ہو؟

ح - تم بہت سندر ہو؟

یا - مہاکوی - بس!

ح - تم خانہ تاروں کی راجکماری ہو - کہو تو سات سمندر پھاند کر جو چاہو لا دوں - کیا تم بھی مجھ سے پریم کرتی ہو۔

یا - آج تیسرے پہر تک تو مجھے نفرت تھی مگر مٹھائیوں کے بعد کایا پلٹ ہو گئی ہے

ح - کیا تم میری ہو سکتی ہو یاسمین؟



یا ۔ کیوں نہیں، کیا تمہارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ تم انگوری سہی، کلو ہی سہی۔ مٹھائیوں کی دکان بھی تو ہو۔

ح ۔ کیا تمہارے ہونٹ پریم گلاب، گال پریم کنول ۔ اور انکھڑیاں پریم چنبیلی نہیں ہیں۔

یا ۔ ہیں۔ اور میرے بال پریم جال اور کمر پریم کردھنی ہے۔

ح ۔ جیسے میں ہوا میں اڑا جا رہا ہوں۔ وہیں اپنے پاس بلا لو۔

یا ۔ کاش ایسا کر سکتی؟

ح ۔ چاندنی رات ہے اور سڑک سنسان۔

یا ۔ پر میں تو اکیلی نہیں۔

ح ۔ اور کون ہے تمہاری ماں؟

یا ۔ نہیں وہ ہے جسے تم نے بھیجا ہے۔

ح ۔ کون؟ میں نے تو . . . . . .

(سلیم برابر سے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

سلیم ۔ پیارے شر۔ شکریہ۔ تم نے مجھے بیکنٹھ کے رستہ پر لگا دیا۔

ح ۔ (چونک کر) کون سلیم۔

س ۔ ہمیشہ کا خادم

ح ۔ (نفرت اور غصے سے) سلیم!

س ۔ بہکی بہکی باتیں نہ کرو جاؤ جادو کا انڈا ڈھونڈو۔

ح ۔ یہاں تمہارا کیا کام ہے؟

س ۔ گستاخی کے حلوے میں جانچ کی انگلی نہ ڈالو سمجھے چچا۔

ح ۔ چچا کی ایسی کی تیسی، دوستی کیوں چھوڑ دی۔

س ۔ دوستی عشق کے پنجے سے گریزاں یوں ہے
جس طرح باز سے نادان کبوتر بھاگے

ح ۔ کون سا عشق؟

س ۔ جس عشق میں محبوبہ کے کاندھوں پر اس شان سے ہاتھ رکھا جائے

ح ۔ ویسے ٹم ہو جائیں گے۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں گے۔

س ۔ ہائے چچا، میری خطا ۔ اتنے ہو گئے ہو کیوں خفا۔

ح ۔ ذلیل کتے اس کو ہاتھ نہ لگا۔

س ۔ ہاتھوں سے چھونا بھی گناہ ہے۔ یہ مرمریں گلا دیکھو اور یہ ہونٹ

(بوسہ لیتا ہے)

ح ۔ نرک کے کندے۔

یا ۔ کیا میری باہیں یوں گلے کا ہار نہیں ہو سکتیں۔ کیا میرے ہونٹ یوں جواب نہیں دے سکتے (بوسہ لیتی ہے)

ح ۔ یہ بھی شعلہ ہے۔ جہنم کا شعلہ۔ میں لٹ گیا۔ گرا۔ گرا۔

س ۔ چچا ادھر دیکھو۔ یہ سراپا، یہ جوانی، یہ بچپن۔ یہ جوبن۔ تمہارا شکریہ۔ نام کا۔ پتہ کا ۔ اور پریم بوتل نما سے دس فی نیارہ میں سے آدھے کا۔

یاسمین ۔ اور میں بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ تو نے کیا سجیلا گبرو جوان میرے لئے بھیج دیا ہے۔

ح ۔ اف میرا سر۔ مجھے چکر آ رہا ہے۔ میں گرا۔

یا ۔ چچا۔ سر کے بال نچ نہ جائیں۔ (سلیم سے لپٹ جاتی ہے)

ح ۔ شیطان کی اولاد۔ کاش میرا خنجر تمہاری گتھی ہوئی گردنوں پر ہوتا۔

یا ۔ بس سارا پریم کافور ہو گیا۔ مارنا ہی چاہتے ہو تو تھوڑی سی چٹکی ہوئی گلاب جامنیں اور بھیج دینا۔

س ۔ تیل اور پانی سے بھری ہوئی پریم بوتل کا کیا کہنا۔ رات کو آدمی بلا بن کر چاندنی میں ٹہلنے لگتا ہے۔

یا ۔ گھر جاؤ للہ جو بیتی سو بیتی۔

س ۔ گھر جاؤ۔ شعر کہو۔ گاؤ اور بانسری بجاؤ۔

یا ۔ گھر جاؤ۔ آگ جلاؤ۔ کڑاہا چڑھاؤ۔ مٹھائی بناؤ اور جلدی لاؤ۔

ح ۔ میں بھنا جا رہا ہوں۔ میں جلا جا رہا ہوں۔

یا ۔ (ٹھنڈے پانی سے نہلا دیتی ہے) یہ لو ابھی ٹھنڈا پانی دیکھ کر بند ہو جاتی ہے۔

ح ۔ تم دونوں کے کوڑے پڑیں گے۔ کالا منہ کر کے شہر بھر میں گدھے پر سوار کر کے پھرائے جاؤ گے اور پھر کھالیں کھینچ لی جائیں گی۔

تیسرا سین

(خلیفہ (ہارون الرشید) وزیر (جعفر) غلام (مسرور) اور درباری شاعر (اسحق) رات کو بغداد کی گلیوں کا چکر لگا رہے ہیں تاکہ مظلوموں کی امداد کر سکیں۔ بیوہ یتیم اور مسکین کی فریاد سن سکیں۔ چور۔ ڈاکو اور بدمعاشوں سے شہر کو محفوظ رکھ سکیں)

خلیفہ ۔ رات رانی مسکرائے جاتی ہے۔ کروٹیں بدل رہی ہے سفید چاند چمکے جا رہا ہے اور ابھی تک کوئی خاص بات نہیں بنی

جعفر ۔ رات کافی بوڑھی ہو چکی ۔ اب واپس چلنا چاہئیے۔

خ ۔ تم تاجر کب سے ہو گئے؟

اسحٰق - جب سے حکومت کی سب سے بڑی دکان وزارت ہاتھ
لگی - جانوں کا لین دین ہے -
(ایک کوٹھی سے گانے ناچنے کی آوازیں آتی ہیں اور
روشنی بھی دکھائی دیتی ہے -

خ - جعفر ذرا صدا لگاؤ - شاید وہ رحم کرکے ہمیں بھی بلالیں -

ج - اے جنت ارضی والے ہمیں بھی بلالو -
(کھڑکی سے ایک آدمی باہر نکلتا ہے) تم لوگ کون ہو؟

ج - ہم چاروں بیوپاری ہیں - اس شہر میں آج ہی آئے ہیں - ایک
دوست کے مکان سے دعوت کھا کر واپس ہو رہے تھے کہ
راستہ بھول گئے - گھنٹوں سے مارے مارے پھر رہے ہیں
اتفاق سے ادھر نکل آئے - یہاں نغمہ بھی ہے نور بھی -

آواز - تم رنگ شعور ہو سے اندر آجاؤ - مگر سمجھ رکھو کہ تمھاری
زبانیں ہمارے بس میں ہونگی -

ج - یہ مکان ہے یا گورکھ دھندا - کوئی دروازہ ہی دکھائی نہیں دیتا

آواز - تم جیسے ہو - سر در ہو مخمور ہو - بے بس رہے اس محل میں
آنے کے لئے تم کو ٹوکرے میں بیٹھنا ہوگا - سپاہی اوپر
کھینچ لیں گے -
(پہلے خلیفہ زرنگار ٹوکرے میں بیٹھ جاتا ہے اس کے
بعد وزیر پھر مسرور - چوتھی مرتبہ بے ظریف درباری
شاعر اسحٰق کے لئے جونہی ٹوکرا نیچے آتا ہے تو [illegible] دیتے
آواز دیتا ہے) اسحٰق تم آ رہے ہو نا؟

اسحٰق - ذرا ٹھہرو میں آیا - (سوتے ہوئے حسان حلوائی سے) معلوم
نہیں اس کا سینہ کیسے زردے کی طرح اکڑ کیوں گیا ہے؟ پہلو
میں نرگس کی بانسری بھی ہے - شاید سر پر پریم کا بھوت
منڈلا رہا ہے -
(خلیفہ کی آواز آتی ہے) اسحٰق ہم لوگ تمھارا کب تک
راستہ دیکھیں -

اسحٰق - ابھی حاضر ہوا -
(بڑی پھرتی سے حسان حلوائی کو اٹھا کر ٹوکرے میں ڈال دیتا ہے
اور کہتا ہے - بڑے بھاری پڑ میں ہر بھائی - ڈھائی من سے اوپر
ہوگے - لو جاؤ میری جگہ پرستان کا مزا لوٹو)

اگلا سین

(میزبان کا نام رفیع - حسان کو دیکھ کر چونک اٹھتا ہے)
یہی آپ کا بادشاہ دوست ہے یا گدڑیوں کا لال -

خلیفہ جعفر اور مسرور - (ایک زبان ہوکر) یہ ہمارا ساتھی نہیں
ہم نے آج سے پہلے اسے دیکھا بھی نہیں -

رفیع - (دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے) اب تک دھونکنی چل رہی ہے (نوکروں
کو آواز دیتا ہے) الدر - ولو - جونیر - تمارنک - (سب کے
سب حاضر ہو کر سامنے آتے ہیں)

رفیع - اس لنگور کو آدمی بنا دو - نہلاؤ - دھلاؤ - ریشمی کپڑے پہناؤ
عطر لگاؤ تب یہاں لاؤ -
(بہت خوب کہہ کر چاروں حسان کو لے جاتے ہیں)

خلیفہ - ایسی تنگ گلی میں اتنا عالیشان مکان -

رفیع - یہ باغیوں کا محل ہے - کسی دیوار کو چھو کر دیکھئے سارا محل کانپنے
لگے گا محل لرزاں بھی ہے -

خلیفہ - (عمدہ دبیز قالین پر بیٹھنے کے بعد) گانے بجانے کا دور کیوں
نہیں چلتا - رک کیوں گیا؟

رفیع - ہم مہمان کے اشاروں پر چلتے ہیں - آجاؤ -
(کورس)

دو پاؤں کے مالک جو ہیں آئیں مل جل ناچیں
اچھلیں کودیں جست لگائیں
جن کے پاؤں نہیں ہیں بیچارے رقص کے کرتب وہ کیا جانیں
آئیں مل جل کر سب گائیں
اچھیں گائیں گائیں ناچیں
بغدادی درویش ہیں یا ہم سب
ہونٹ ہیں شہد بھرے دانت ہیں کھڑکی ننگے کبڑے یا دیوانے
بغدادی درویش ہیں ہیں

کالی - جیسے سحر کو گلاب آپ ہی آپ ہنس پڑے
گوری - جیسے شفق شام کی آگ سے بھر دے فضا
گندمی - کس گاؤں سے کس راہ سے آئے ہیں یہ کہتے
کرتے ہیں جو چھوتے ہی جھلس پاؤں ہمارے
کالی - بھاگو مری بہنو نہیں ہو جاؤ گی گھائل
ہٹ چھوڑ مرے پانوں اے گرد کے بچے
رفیع درویش - اے صبح کی شہزادی پڑ جائے اگر گرد
دامن کو جھٹک دو مگر آئینہ نہ بن جاؤ
(رقص و سرود ختم ہوتے ہی ہزاروں سپاہی فقیروں کے بھیس

میں آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ رفیع کپتان تقریر کرتا ہے۔)

"بھول ہونے کو ہے سپاہیو۔ تم شیر ببر ہو۔ پھاڑ کھاؤ۔ تم اژدر ہو نگل جاؤ۔ ہم باغی ہیں۔ وطن کے سپوت سپاہی ہیں۔ دولت کے بغدادی کتے ابھی تک خراٹے لیتے ہوں گے۔ تم آج تک دبتے آئے۔ آج ابھر جاؤ۔ آگ لگا دو۔ لوٹ لو۔ سلطنت کے پرزے پرزے اڑا دو۔ تلواریں سونت لو۔ نیامیں توڑ ڈالو۔ عیش خانے کے کتنے مزے سے سو رہے ہیں۔ ہم ان سب کے منہ میں تلواریں ٹھونس دینگے۔ جو کچھ لوٹ میں آئے گا سب تمہارا ہوگا یہاں تک کہ لڑکیاں بھی۔ مگر ایک لڑکی جس کا حلیہ تم کو بتا چکا ہوں وہ میری ہوگی۔

جعفر ۔ جہاں پناہ (خلیفہ سے) اب چلئے (رفیع سے) ہم رخصت چاہتے ہیں۔

رفیع ۔ (ہنسکر) خوب۔ ہماری سالہا سال کی سازش پہ پانی پھیرنے کے لئے۔ تم نے نیچے اترتے ہی زبان ہلادی اور محل لرزاں کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔

جعفر ۔ ہم لوگ بالکل چپ رہیں گے۔ زبان دیتے ہیں۔ ہم عزت والے ہیں۔

رفیع ۔ کاش تم بھی ہماری طرح چور اچکے ڈاکو ہوتے۔ تمہاری عزت تم کو شاہی دربار تک لیجا کر عہد شکنی کرائے گی اور بہانہ یہ ہوگا کہ باغیوں سے جبری عہد و پیمان تھا۔ کچا دھاگا ۔ ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔

(حسان داخل ہوتا ہے)

"ہائے اف۔ ارے رے رے۔ حسان اب کہاں وہ تو مٹی کا ڈھیر ہوچکا ہڈیاں بھی چورنہ ہوگئی ہونگی۔ میں عالم برزخ میں ہوں۔ یہ جنات ہیں کہ روحیں۔

رفیع ۔ یہ میرے بہادر باغی سپاہی ہیں۔ جو آج ہی مجھے تخت خلافت پر بٹھائیں گے۔ میرا مکان موصل کی پوربی جوتی پہ ہے۔ میری شادی پروانہ سے طے تھی۔ بارات کے دن والئی موصل نے چھاپہ مارا قتل وغارت کرکے پروانہ کو اٹھا لے گئے۔ سنا ہے کہ وہ محلسرا میں ہے۔ جب تک اس سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے نہ اڑا دوں۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

جعفر ۔ اور ہمارا حشر؟

رفیع ۔ ہم لوگ مہمانوں کا بال بھی بیکا ہونے نہیں دیتے۔ تم اسی دسلاخ والی آہنی دیواریں کھٹا کھٹ گر کر مہمانوں کو جکڑ لیتی ہیں) پنجرے میں شام تک آرام سے رہو گے اور شام کو شاہی محل میں ہمارے ساتھ دعوت کھاؤ گے۔

(مسرور، جعفر اور خلیفہ تلواریں کھینچ لیتے ہیں مگر رفیع اپنے سپاہیوں کو لیکر روانہ ہوجاتا ہے)

خلیفہ ۔ اب تو پاؤں کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی۔ حسان تم کیا کر رہے ہو۔

حسان ۔ اس دمشقی غالیچہ کے تانے بانے پر غور کر رہا ہوں۔ میں حلوائی جو ٹھہرا۔

خلیفہ ۔ اس کو پھاڑ کر ہمیں نکلوا دو۔ ہمیں بھی نکالو۔

حسان ۔ یہ لیجئے کوئلہ اور یہ ہے کاغذ کا پرچہ۔ لکھئے اور انھیں سلاخوں کے اندر سے اڑا دیجئے۔

اگلا سین

(شب گرد سپاہیوں کا دستہ)

اسحٰق ۔ میں نے اس سوتے ہوئے لنگور کو اپنی جگہ ٹوکری میں بٹھا کر اوپر کھنچوا دیا تھا۔ اب یاد بھی نہیں کہ مکان کون سا تھا۔ یہاں سب کے سب ایک ہی جیسے ہیں (پرچہ اڑتا ہوا دیکھ کر لپک کر لیتا ہے اور سب کو سناتا ہے)

دوسرا سین

یاسمین ۔ (اپنی کھڑکی سے) سلیمہ وہ دیکھو لوگر سنبھولا دل سے سامنے والا آہنی مجرہ توڑ رہے ہیں۔ اب نہ گڈا ہے نہ بچا ہے۔

سلیمہ ۔ کھڑکی سے ہٹ آؤ بیوی۔ بد وقت ہو یا ڈاکہ۔

یاسمین ۔ تم تو ڈرتے ہو رہا چلے سلیمہ۔ سنو تو کیا آوازیں آرہی ہیں (سپاہی پنجرہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ پولس کپتان کہتا ہے)

جہاں پناہ! یہ شرف پولس ہی کو حاصل ہوا کہ وہ سب سے پہلے حضور تک پہنچی۔

فوجی کپتان ۔ غلط۔ یہ سعادت فوج کی قسمت میں تھی۔ سب سے پہلے میں یہاں پہنچا۔

یاسمین ۔ سلیمہ یہ کیا ماجرا ہے۔ خلیفہ نظر بند تھے۔ اور حسان حلوائی کو تو دیکھو۔ ٹھاٹ بدل کر نواب ہوگیا ہے۔

خلیفہ ۔ حسان یہاں آؤ۔

حسان ۔ حاضر حضور

خلیفہ ۔ تم آج سے وزیر بازار مقرر کئے جاتے ہو۔

مجمع ۔ مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔

اسحٰق ۔ کیا تمہیں ٹوٹی بانسری والے مبارک انسان ہو جسے میں نے اپنی جگہ اوپر بھیجا تھا؟

خلیفہ ۔ ہاں ہاں وہی ہے ۔ میں جاتا ہوں تم اسے درباری آداب سکھاؤ۔

(خلیفہ مع حشم و خدم کے جاتا ہے)

یاسمین سلیم کو نوچتی ہے اور کہتی ہے۔ "کافر۔ بھک منگے ۔ تو نے کل رات مجھے ابھار کر کہیں کا نہ رکھا ۔ میں نے حسان کو برا بھلا کہا ۔ ذلیل کیا ۔ آج دولت اور عزت دونوں اس کے قدموں میں کھیل رہی ہے ۔ اور تو وہی موچی کا موچی ہے ۔ میں تو لٹ گئی ۔ خیر اب تو یہاں سے اپنا منہ کالا کر ۔ (بہت سے گلاب کے پھول حسان پر برساتی ہے)

حسان ۔ یہ بلبل کی طرح کون چہکا ۔ یہ گلاب کی بارش کس نے کی ۔ شاید ہوگی ۔ (سونگھ کر) یہ تو خون اور زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں

یاسمین ۔ میں بھی صدقے میرے گلاب بھی نچھاور۔

اسحٰق ۔ یہ پریم کے بول نہیں ۔

حسان ۔ یاسمین دیکھ ۔ میں ان پھولوں کو ابھی مسلے دیتا ہوں ۔ روندے ڈالتا ہوں ۔ یہ لے ۔ دیکھا ان پھولوں کی یہی کائنات تھی رات میں غریب تھا ۔ مٹھائیاں نذر کیں تو پانی برسایا گیا ۔ آج دولت ملی تو گلاب کی بارش ہونے لگی ۔ دل کا آئینہ ایک ہی بار ٹوٹتا ہے ۔ پھر نہیں جڑتا ۔

یاسمین ۔ ہائے اُف ۔ میں لٹ گئی ۔ لُٹ گئی ۔ میں گری ۔ گری ۔

رات کا سین

(حسان نوکروں کے جھنڈ میں اپنے محل میں داخل ہوتا ہے الدر ۔ تمار سک ۔ جو ہر وغیرہ

حسان ۔ خوب، یہ ہوا مہمان خانہ اور یہ؟

الدر ۔ یہ خلوت خانہ ہے ۔

حسان ۔ شیشے کی الماری میں کیا ہے؟

الدر ۔ حضور کے بڑے چھوٹے کپڑے ۔

حسان ۔ اور یہ مسہری پر بیچ میں آماس کیا ہے ؟

الدر ۔ پہلو گرم کرنے والی خاتون ۔

(چادر سرکتی ہے)

یاسمین ۔ پیارے حسان!

حسان ۔ تو ہے یاسمین!

(نوکر ادب سے باہر چلے جاتے ہیں)

یاسمین ۔ میں آئی ۔ میں پہنچی ۔ میں گھڑیوں سے راہ تکتی رہی ۔

حسان ۔ کیوں؟

یاسمین ۔ تمہیں بتاؤ ایک جوان عورت ایک گبرو کے بستر میں کیوں چھپی ہے؟

حسان ۔ اس لئے کہ خنجر اس کے سینہ میں دستہ تک اتار دیا جائے ۔

یاسمین ۔ مجھے تم پر اپنی جان بھی چھڑکنے میں .....

حسان ۔ بس چپ رہ ۔ جا سلیم کے پاس جا ۔

یاسمین ۔ اسے میں چھوڑ چکی ۔

حسان ۔ کل یہی میرے لئے بھی کہو گی ۔

یاسمین ۔ ہرگز نہیں ۔ یہ دیکھو، یہ جوانی، یہ حسن، یہ چہرہ، سینہ، یہ بازو، یہ سراپا صرف تمہارے لئے ہے ۔ ایسا بے داغ انمول مال اور تمہارے لئے قیمت کا کوئی سوال نہیں ۔

حسان ۔ میرے لئے کوڑیوں کے مول بھی یہ مال مہنگا ہے ۔ دھیلا ۔ باسی ۔ جوٹھا ۔

یاسمین ۔ پیارے کھلاڑی، تم بالکل الھڑ ہو ۔ لو مجھے پرکھ لو ۔

حسان ۔ جا یہاں سے بھاگ جا ۔ تیری کل کی حرکتیں مجھے یاد ہیں

یاسمین ۔ میں خود جو موجود ہوں ۔ انتقام لو اور دل کھول کر لو ۔ کتنا میٹھا ۔ کیسا پیارا اور کس قدر مزیدار انتقام ہوگا ۔

ح ۔ مانگ جو کچھ مانگنا چاہے ۔ تو دولت کی بھوکی ہے اور میں اسے ٹھیکری سمجھتا ہوں ۔

یا ۔ تم برف کی طرح ٹھنڈے اور مورتی کے سمان پتھر ہو ۔

ح ۔ تم آگ سے زیادہ گرم اور لُو سے زیادہ جھلسانے والی ہو ۔

یا ۔ تمہارے ہونٹوں سے محبت کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی ہے ۔ نہیں تو میں چلی جاتی ۔ میں مست ہوئی جاتی ہوں ۔ آؤ تمہیں میں سے زیادہ اچھے گیت سناؤں ۔

ح ۔ ہائے ۔ اف فوہ ۔ ایسے ریسے رہے اب چلی جاؤ ۔

یا ۔ سبزہ زار میں لالے لہک رہے ہیں ۔ چمن میں گلاب کِھل رہے ہیں ۔ سب ایک جیسے، ایک جیسے ۔ مگر میرا جسم اس دنیا میں آپ اپنی مثال ہے ۔ یہ ابرو، یہ آنکھیں، یہ طوطا پری ناک، یہ کِھلے کِھلے ہونٹ، یہ نازک بازو ۔ یہ دلربا تل، یہ سنہرے روئیں ۔ یہ رگیں ۔ یہ خون کی دوڑ ۔ یہ گوشت، یہ رنگ، یہ سینہ، یہ کمر، یہ آگ میں تپا ہوا ۔ خمخانہ میں پلا ہوا چکنا جسم

اشاروں میں چلیں لیٹاٹ دیکھو تو ادھر چھیڑو تو ذرا۔

حسان ۔ ادھر دیکھو اس تلوار کا خم ۔ اس کا آب اس کا رنگ، اس کی باڑھ، اس کی کاٹ، اس کا گھاٹ، اس کی لچک، اس کے جوہر بے نظیر ہیں۔ میں ابھی تم کو دو حصوں میں بانٹے دیتا ہوں۔

یاسمین ۔ شرط یہ ہے کہ آنکھ سے آنکھ لڑی رہے ۔ لو یہ کیا ہوا؟ تلوار چھن سے چھوٹ گئی ۔ بس ہار لیا۔

دوسرا سین

(دربار شاہی میں باغیوں کی پیشی)

خلیفہ ۔ تم لوگ بھکاری ہو یا باغی۔

قیدی ۔ ہم سب بھکاری ہیں۔

خلیفہ ۔ رفیع! بغاوت کے زہریلے کو مُنہ بند کلی ہی میں مسل ڈالنا چاہیئے ورنہ یہ بیل منڈھے چڑھ جاتی ہے۔

رفیع ۔ کیا بھوک سے کبھی آپ کے شہر میں کچاؤ اور پیاس سے حلق میں کانٹے پڑے ہیں؟

خلیفہ ۔ میں پوچھتا ہوں تم ۔ تم کیتے ہو اعلیٰ ۔ کیا تم کو بغاوت سے انکار ہے؟

سارے قیدی ۔ ہم باغی بنے پیٹ کے لئے ۔ ہم نے سازش کی روٹیوں کے واسطے ۔ ہم رفیع کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔

خلیفہ ۔ اچھا یہ سب معاف کئے جاتے ہیں ۔ ان کی فہرست بنا لو اور ان کو مختلف کارخانوں میں کام پر لگا دو ۔ بھکاریوں کے بے تاج راجہ کو اور قریب لاؤ۔

رفیع ۔ اے بغداد کے تاجور سلام۔

خلیفہ ۔ تیرے لہجہ میں اب بھی نوابی کی بُو ہے مگر تیری ساری رعایا کارخانوں میں کام کر رہی ہے۔

رفیع ۔ کاش مجھ پر رات ہی کو اپنے بہانوں کی حقیقت کھل جاتی۔

مسرور ۔ گُدّی سے کھینچ لونگا زبان دراز کو۔

رفیع ۔ مگر ے ... تو ... کر ... نہ والا ویلا

[illegible]

خلیفہ ۔ کیا تم پروانہ کو بھول گئے؟

رفیع ۔ میری ہستی کا ذرہ ذرہ اسے پکار رہا ہے۔

(پروانہ آتی ہے)

رفیع ۔ اے جہاں پناہ رحم،

خلیفہ ۔ کیوں ساری محبت کافور ہو گئی؟

رفیع ۔ پروانہ وہ چشمہ ہے جس میں آگ کی موجیں ہیں اور خون کے بلبلے ۔ کاش میں اندھا ہو جاتا ۔ پروانہ شاہی آغوش میں کھیل کر نکھر گئی ہے۔

خلیفہ ۔ تم تو اسی پروانہ کے انتقام کے لئے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے تھے۔

رفیع ۔ مگر عصمت دری کے داغ ظالم کے خون سے دھونے کے لئے

خلیفہ ۔ کیا میں نے اپنے باغ کا ہر پھل چکھا ہے ۔ کیا میں اپنے نوکر کے ہر فعل کا ذمہ دار ہوں۔

رفیع ۔ کیا آپ سچ بول رہے ہیں ظل اللہ؟

پروانہ ۔ یہ ہتھکڑی میں جکڑا ہوا کون ہے ۔ یہ اپنی ہتھیلیوں سے اپنا مُنہ کیوں ڈھانپ رہا ہے؟

(پروانہ بڑھتی ہے رفیع سکڑ جاتا ہے)

پروانہ ۔ یہ تو میرے ڈر سے چھوئی موئی ہوا جاتا ہے۔

رفیع ۔ پروانہ میں سر سے پاؤں تک گناہوں سے اٹا ہوا ہوں ۔ میرے پاس نہ آؤ ۔ تم بھی میلی ہو جاؤ گی۔

پروانہ ۔ ادھر دیکھو ۔ میں سب باتیں بھول گئی۔

رفیع ۔ میں نے تمہارے لئے بغاوت کی ۔ ایک ہزار کی فوج اکٹھا کی۔

پروانہ ۔ میرے لئے؟

رفیع ۔ صرف تمہارے لئے؟

پروانہ ۔ میں اب بھی ویسی ہی ہوں ۔ جیسی اپنے گھر میں تھی۔

رفیع ۔ رحم مسلمانوں کے خلیفہ رحم ۔ مجھے اپنے جرموں کا اقرار ہے۔

خلیفہ ۔ میں جذبات کی رو میں بہہ کر انصاف کا خون نہیں کر سکتا۔

پروانہ ۔ (پاؤں پر گرتی ہے) پناہ دیجئے ظل اللہ اسے چھوڑ دیجئے۔

خلیفہ ۔ جلاد منتظر ہے ۔ صلیب تیار ہے۔

پروانہ ۔ میں اس کے بجائے ساری سزائیں بھگتنے کو تیار ہوں۔

خلیفہ ۔ صرف مجرم کو جرم کی سزا مل سکتی ہے دوسرے کو نہیں۔

پروانہ ۔ میں ہی سب جرموں کی جڑ ہوں ۔ اصل مجرم میں ہوں۔

خلیفہ ۔ اچھا تم ... نظر بند رہیں ۔ فیصلہ اس وقت ہوگا۔

دوسرا سین

(کٹہرے میں رفیع و پروانہ نظر بند ہیں)

رفیع ۔ کس غضب کا سناٹا ہے گھنٹہ بھر میں شام ہو جائیگی۔

پروانہ ۔ سورج دیوتا چلتے نہیں رینگ رہے ہیں دیوار دل پر اب تک ہلکی ہلکی دھوپ ہے۔

رفیع ۔ کیا تم بھی میرے ساتھ موت کے گھاٹ اترو گی؟

پروانہ ۔ (جواب میں ہونٹوں پر بوسہ کی مُہر لگا دیتی ہے) ہاں۔

دوسرا سین

(دربار میں ہلچل)

خلیفہ ۔ کہو کیا فیصلہ ہے!

پروانہ اور رفیع ۔ ہم دونوں مجرم ہیں فیصلہ جہاں پناہ کے ہاتھ ہے خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حسان ۔ یہ بالکل سچ کہتے ہیں۔

خلیفہ ۔ تم دونوں آزاد کیے جاتے ہو۔ پروانہ تم آج سے تعلیم نسواں کی صدر اور رفیع تم مالیات کے وزیر بنائے جاتے ہو۔

حسان ۔ اور میں؟

خلیفہ ۔ تم قند و شکر شہد و شیرینی کے مہتمم

دوسرا سین

سلیم ۔ حسان حسان، گھوڑے بیچ کر سو رہے ہو۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے اور تمہارے خوانچے کم نہیں ہوتے۔ کل محفل جس رہی ہے تاؤ خراب ہو رہا ہے۔ اٹھو جلدی سے پانچ سیر گلاب جامنیں تول دو۔ ہوش کرو ہوش۔

حسان ۔ (آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے) خلیفہ۔ یاسمین۔ پروانہ۔ رفیع مسرور۔ ہائے اُف ہائے اُف ارے رے رے یاسمین!

سلیم ۔ یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے گلاب جامنیں چاہئیں گلاب جامنیں

حسان ۔ دیتا ہوں بھائی۔ تولتا ہوں بھائی ـــ یاسمین یاسمین یاسمین یاسمین ـــ!

عبدالکریم ثمر

جولانی!

یہ سوزِ داغِ محبت ہے التہاب نہیں
خود آفتاب ہے تصویرِ آفتاب نہیں

نبردِ عشق نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں
جلالِ خالدؓ و حسنینؓ و بوترابؓ نہیں

مری نگاہوں میں پھرتی ہے عظمتِ فاروقؓ
وہ جس کے عدل و مساوات کا جواب نہیں

ترے خیال میں پہنچا ہوں اس بلندی پر
جہاں تصور و تخئیل باریاب نہیں

کسی کے دردِ محبت میں موت بھی نہ ملی
دعائے زیست بھی کی تھی وہ مستجاب نہیں

یہ اک نمونۂ عبرت ہے میری تشنہ لبی
مرے نصیب میں اک قطرۂ سراب نہیں

یہ اقتضائے محبت ہے بے رخی تیری
میں جانتا ہوں تجھے مجھ سے اجتناب نہیں

ریاضِ خلد کی تاریکیاں معاذاللہ
نظر فروز ستاروں کا اکتساب نہیں

شرار و برق کی رَو ہے یہ گرم جولانی
ہلال میرے لئے حلقۂ رکاب نہیں

کمال اس میں نہیں ہے کہ "لاشریک ہے تو"
کمال یہ ہے "مرے درد کا جواب نہیں"

نگاہِ لطف سے تیری ہے اک زمانہ خراب
ترے ستم سے تقاضائے جہاں خراب نہیں

ستم شعار زمانے کی چیرہ دستی ہے
ریاضِ حسن کے گیسو بھی مشکناب نہیں

ازل سے حیلۂ پرویز کامیاب رہا
ازل سے تیشۂ فرہاد کامیاب نہیں

اب ان غلاموں کی بستی میں روح لرزاں ہے
اب ان غلاموں سے میرا ثمر خطاب نہیں

سریر کابری مینائی

ماتمِ شفق

رباعیات

عالم میں جو لاجواب ہو جاتا ہے   ہر حال میں کامیاب ہو جاتا ہے
سنتا ہوں چراغِ زیست ہر اہلِ کمال   بجھتا ہے تو آفتاب ہو جاتا ہے

۲

ہر سانس حوادث سے لدی ہوتی ہے   ہر لمحے کے دامن میں بدی ہوتی ہے
ہو جاتا ہے زندہ مر کے نامِ شاعر   موت ان کی حیاتِ ابدی ہوتی ہے

۳

ہر شاعرِ حال و ماسبق کو دیکھا   ہر طرح کے مضمونِ ادق کو دیکھا
ہر صنفِ سخن میں جسے حاصل تھا کمال   دیکھا تو فقط ایک شفق کو دیکھا

۴

رنگینیٔ طبع دے رہی تھی یہ سراغ   اک پھول کی آغوش میں ہیں سیکڑوں باغ
اللہ رے فیضِ عامِ تعلیمِ شفق   روشن ہوئے اک چراغ سے کتنے چراغ

۵

علامہ شفق سرآمدِ اہلِ کمال   تھے فخرِ امیر و داغ و تسلیم و جلال
اٹھتا ہے جہاں سے جس زباں کا شاعر   پڑ جاتا ہے اس کا سنگِ بنیادِ زوال

قطعات

ریاض و مضطر و نسیم و کوثر کے غم میں اب رو رہے تھے
کہ اپنی تابانیوں کو دکھلا کے اخترِ خوشنوا سدھارا
ابھی تو بینائیوں کی آنکھوں سے آہ سوکھے بھی تھے نہ آنسو
شفق کے داغِ فراق سے اشکبار ہے آج ملک سارا
ہمیشہ رنگینیٔ سخن سے رہیگا دنیا میں نام روشن
فنا کی بدلی میں ڈوب کر بھی رہیگا تابندہ یہ ستارا
ہیں ملک میں باکمال جتنے وہ سب کے سب ان کو مانتے ہیں
کہ مشقِ شعر و سخن میں سارا زمانۂ زندگی گزارا
سرآمدِ اہلِ فن سمجھتے تھے ملک کے شاعرانِ کامل
سخنورانِ بہار کا آج یہ بھی رخصت ہوا سہارا
خدا کرے چھپ کے ان کی تصنیف ملک میں ہاتھوں ہاتھ نکلے
اگرچہ دریائے آرزو کا ہوا بہت دور اب کنارا
جو مصرعۂ سالِ عیسوی کی تلاش تھی اے سریر مجھکو
نزولِ رحمت سرِ مزارِ شفق رہے - دل مرا پکارا

۱۹۴۴

دیگر

سنتا ہوں چل بسا شفقِ نکتہ داں سریر   اب شاعری شفق کی کہاں اب کہاں شفق
بیساختہ ہے از سرِ ابجد سنِ وفات   چھپ ہے عدم میں شاعرِ جادو بیاں شفق

۱۹۴۴

دیگر

کلیمِ طورِ سخن خضرِ وادیٔ الہام   پیمبرانِ معانی میں تھا شمارِ شفق
جہانِ نظم پہ قبضہ تو کر لیا تو نے   چلا نہ موت کے مضموں پہ اختیارِ شفق
وہ بے ملے ہوئے جانے کبھی نہ سوئے جناں   امیر و داغ کو لیکن تھا انتظارِ شفق
ڈھکا ہے حور کے دامن سے گوشۂ تربت   تنی ہے نور کی چادر سرِ مزارِ شفق
سریر باعثِ عزت ہے کفش برداری   نہ جانشینِ شفق ہوں نہ یادگارِ شفق
یہ مصرعِ سنِ ہجری کہو ز روئے تبا   نزولِ رحمتِ باری سرِ مزارِ شفق

۱۳۶۳ ھ

حامد حسن قادری
(پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ)

امیر مینائی کے ایک شعر کا مقدمہ

ستمبر سنہ ۳۴ء کے "عالمگیر" میں ایک مضمون (مولانا شادی کا مقدمہ) نظر سے گزرا۔ اتفاق ہے میں نے اس سے پہلے مضامین "ہماری زبان" اور "عالمگیر" میں نہیں دیکھے۔ اس موضوع پر پہلا مضمون یہی نظر آیا اس لئے میں دوسرے مباحث پر اس وقت نظر نہیں ڈال سکتا۔ البتہ امیر مینائی کے ایک شعر کو جس طرح معرضِ بحث میں لایا گیا ہے اس سے مجھے دلچسپی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ اس لئے کچھ عرض کرتا ہوں۔

مولوی غلام مصطفٰے خاں صاحب نے فارسی کی غلط اضافت کی سند میں امیر مینائی کا یہ شعر پیش کیا تھا ؎

بخیے کا دیا حکم تو بوسے دہنِ زخم
سلواتے ہو کیوں قابلِ سیون تو نہیں ہم

اور یہ فرمایا تھا کہ محققین سے بھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے جیسا کہ اس شعر میں امیر صاحب نے ایک ہندی لفظ سیون کو مضاف الیہ بنا لیا ہے۔

اس پر کوئی مولوی وجاہت علی صاحب ہیں انھوں نے یہ فرمایا کہ امیر مینائی جیسے محقق ہندی لفظ کو مضاف الیہ بناتے تو قابلِ سلائی کہتے قابلِ سیون نہیں کہہ سکتے تھے۔

اس کے جواب الجواب میں مولوی غلام مصطفٰے صاحب نے فرمایا ہے کہ "اس سے یہ ظاہر ہوا کہ سیون کے معنی سلائی نہیں ہیں"۔ اور نور اللغات کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اس میں سیون کے معنی سلائی موجود ہیں۔

مولوی وجاہت علی صاحب نے اپنے جواب میں امیر مینائی کی غلط اضافت کے لئے اپنے نزدیک ایک صحیح بدل (قابلِ بخیہ) تجویز فرمایا تھا۔ لیکن مولوی غلام مصطفٰے صاحب کے نزدیک "بخیہ" کے معنی یہاں چسپاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ قابلِ سیون کی تائید میں مولوی عبدالباری صاحب آسی لکھنوی کو اور ان کے مرتب کردہ مراۃ الغیب کے نسخہ کو پیش کرتے ہیں کہ آسی صاحب کی رائے میں بھی امیر مینائی نے ہندی مضاف الیہ کا استعمال کیا ہے۔

اب تک امیر مینائی کے شعر پر جو مقدمہ قائم ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ تھا جو میں نے عرض کیا۔ اس کے بعد گزارش ہے کہ غلطی استادوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی غلطی کے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے نقاد کو سخن فہمی سے کام لینا چاہیے جس کے لئے غلطی کی نوعیت، غلطی کرنے والے شاعر، اس کے کلام، اس کے زمانے، اس کی روایات سب کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق بلا تامل دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ امیر و داغ سے یہ غلطی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً کئی سال ہوئے کسی رسالے میں ایک صاحب نے "نظر آئے" "اثر آئے" کی زمین میں داغ کا ایک مطلع لکھا تھا جس میں "صبر آئے" منظوم ہوا تھا۔ اور مقالہ نگار نے لکھا تھا کہ داغ نے صبر کو نظر کا قافیہ باندھا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی سخن ناشناسی تھی کہ داغ سے ایسی غلطی کا امکان فرض کر لیا۔ داغ کے کسی دیوان میں وہ مطلع موجود نہیں ہے۔ اور ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا کہ داغ صبر کو فتح اوسط کے ساتھ نظم کر دیں۔

میری رائے میں قابلِ سیون بھی ایسی ہی غلطی ہے جو امیر مینائی کے قلم سے وجود میں نہیں آ سکتی۔ اگر ان کے دیوان مراۃ الغیب کے پہلے ایڈیشن میں ایسا ہی چھپا ہے تو کاتب کی غلطی ہے۔ امیر صاحب کی غلطی نہیں۔ امیر مینائی اتنے بڑے استاد اور محقق تھے کہ ان سے اس غلطی کا ہرگز امکان نہیں ہے۔ اس کے وجوہ دو ہیں۔

(۱) قابلِ سیون میں ہندی کا مضاف الیہ ایسی صریح غلطی ہے جس کو امیر مینائی جائز نہیں رکھ سکتے تھے۔

(۲) جیسا کہ مولوی وجاہت علی صاحب کا خیال ہے یہاں "سیون" کا لفظ "سلائی" کی جگہ محاورے کے خلاف ہے۔ اگر ہندی مضاف الیہ جائز ہوتا تو "قابلِ سلائی" کہہ سکتے تھے۔ لیکن "قابلِ سیون" نہیں کہہ سکتے۔ مولوی غلام مصطفٰے صاحب نے اہلِ زبان کے محاورے پر غور نہیں فرمایا اور نور اللغات کا حوالہ دے دیا۔ کسی لغت کا حوالہ صرف لغوی معنی کے لئے سند ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہاں "سیون" کے لغوی معنی "سلائی" سے انکار نہیں۔ بلکہ اس موقع پر اس مفہوم کے لئے سیون

کے استعمال سے انکار ہے۔ کوئی چیز سینے کے قابل نہ ہو تو اہل زبان یہ نہیں کہتے کہ "سیون" کے قابل نہیں ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ "سلائی" کے قابل نہیں ہے۔

ان دونوں اسباب سے امیر مینائی کے شعر میں قابل سیون نہیں ہے اس جگہ کوئی اور لفظ ہے جو کاتب [illegible] سے غلط ہو گیا۔ اور اب مولوی غلام مصطفےٰ صاحب۔ مولوی [illegible] ہمت علی صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا [illegible] یہ لفظ کچھ بھی ہو یہ یقینی ہے کہ شیون کا لفظ نہیں ہے جو مولوی وجیہ ہمت علی صاحب نے تجویز فرمایا ہے۔ "شیون" کا یہاں کوئی مفہوم نہیں۔ پھر وہ کون سا لفظ ہو سکتا ہے؟

میری رائے میں ممکن ہے کہ "قابل سوزن" ہو اور شعر اس طرح ہو

بخیے کا دیا حکم تو بولے دہن زخم ۵
سلواتے ہو کیوں قابل سوزن تو نہیں ہم

یعنی زخموں نے یہ کہا کہ ہم اس قابل تو نہیں ہیں کہ ہم کو سوئی سے چھیدا جائے۔ یہ سزا اور یہ توہین تو ہمارے لئے زیبا نہیں۔

بہرحال اس مسئلہ کے متعلق میری یہ رائے اور تجویز ہے۔ صاحب ذوق اہل زبان اور ارباب نقد و نظر محاکمہ فرما سکتے ہیں۔

بہسار کوٹی

سوز و ساز

مستی میں غم شیشہ و صہبا سے گزر جا
پستی میں ہر اک عالم بالا سے گزر جا
تو آج ہی اندیشۂ فردا سے گزر جا
آنکھیں ہیں تو ہر جلوۂ پیدا سے گزر جا

ہر موج کی آغوش میں طوفان شرر دیکھ
دامانِ شبِ تار میں پنہاں ہے سحر دیکھ
کھا جائے نہ دھوکا کہیں تیری بھی نظر دیکھ
پابندیٔ آدابِ تماشا سے گزر جا
آنکھیں ہیں تو ہر جلوۂ پیدا سے گزر جا

تو عین حقیقت ہے حقیقت پہ نظر رکھ
انسان ہے انسان کی فطرت پہ نظر رکھ
رحمت بھی کوئی چیز ہے رحمت پہ نظر رکھ
یہ بھی تو ہے اک درد مداوا سے گزر جا
آنکھیں ہیں تو ہر جلوۂ پیدا سے گزر جا

دے کام اگر جذبۂ کامل ہی بہت ہے
رہرو کو نشانِ رہِ منزل ہی بہت ہے
ہنگامۂ محفل کے لئے دل ہی بہت ہے
سجادہ و تسبیح و مصلا سے گزر جا
آنکھیں ہیں تو ہر جلوۂ پیدا سے گزر جا

سوزِ غم پنہاں کا جو حامل نہیں ہوتا
ہم دل نہیں کہتے اُسے وہ دل نہیں ہوتا
طوفاں کبھی آسودۂ ساحل نہیں ہوتا
جینا ہے تو جینے کی تمنا سے گزر جا
آنکھیں ہیں تو ہر جلوۂ پیدا سے گزر جا



شفیق بانو نجیب آبادی

دو چنگاریاں

"بہن؟ میری شہنا ——؟"

"ہاں بھائی —— !"

"کیوں خاموش بیٹھی ہو؟ تمھیں خاموش دیکھ کر مجھے وہم ہونے لگتا ہے۔ بس تم تو ہر وقت ہنستی مسکراتی رہا کرو۔"

بھائی کے ان محبت بھرے الفاظ کو سن کر میں سچ مچ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ بھائی نے دونوں ہاتھوں سے میرے بکھرے ہوئے بال درست کیے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے کھانے کی میز پر لے گئے۔

کتنی محبت سے ہر چیز میرے سامنے کرتے رہتے ہیں۔ گویا میرے ساتھ کھانے سے ان کا پیٹ بھریگا ورنہ نہیں۔

بھلا جس کے دنیا میں صرف ایک بھائی ہو اور وہ اُسے بہت چاہتا ہو اس سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے؟ اب ذرا بھائی کا ایک ہلکا سا عکس بھی بتاتی چلوں تاکہ اُلجھی ہوئی زندگی آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ پتلے دبلے —— خیالی دنیا —— قد خاصا —— گندمی رنگ —— آنکھیں شاعرانہ —— گریبان اکثر کھلا رہتا ہے۔ بال سیدھے الجھے ہوئے اوپر کو۔ شغل صرف کتب بینی اور بچوں کی طرح مختلف چیزیں جمع کرنی۔ عادت بھی بس ایک معصوم بچے کی طرح —— خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میرے دو بھاوجیں ہیں۔ ایک تو سب گھر والوں کی کوششوں، ارمانوں، طوفانوں کا تحفہ ننھے منے پیارے بچوں کی اماں۔ دوسری رومانی شادی ——!

بہرحال شادی ہر حال میں شادی ہی کہلائی جائے گی۔ خواہ شرعی ہو، قانونی ہو، رومانی ہو یا طوفانی، دوسری شادی کے لئے کم از کم میرا تو یہ نظریہ ہے کہ ہمارے بھائی نے یہ شادی نہیں کی۔ بلکہ ہماری نئی بھابی نے ہمارے بھائی کو بیاہا۔ مطلب یہ کہ سب کچھ جانتے ہوئے۔ پہلی بیوی کی واقفیت رکھتے ہوئے "ہاں" کر لی۔ خیر صاحب یہ قصہ تو ہو چکا۔ اب دونوں میری بھابیاں ہیں۔ دونوں کو میں برابر چاہتی ہوں لیکن روزمرہ کے سین میرا دم بولائے دیتے ہیں۔ چونکہ میں بھیا کی چہیتی بہن ہوں لہٰذا ہر ایک مجھے اپنے لئے وقف کرنا چاہتی ہے۔ مثلاً میرے ہوا سر میں درد۔ اب جناب دونوں کا دل تڑپ اٹھا۔ دونوں کے ہاتھ میرے بالوں پر چلنے لگے۔ میرا سر ما فتور ہاتھوں کی گرفت میں پناہ مانگنے لگا۔ میرا دل اندر سے تو بہت خوش ہوتا ہے کہ میری دو چاہنے والیاں ہیں لیکن میں ظاہر پرستی سے بہت گھبراتی ہوں۔ اگر کسی دن ایک بھابی سے کچھ بات کر لی تو جناب دوسری کا حسین چہرہ سُرخ انگارہ بن گیا۔ ادھر سے ہٹ کر اُدھر دوسری سے ذرا رومانی انداز میں کہا —— "میری اچھی بھابی! —— تم کتنی اچھی ہو۔ ہمارا ایک کام کر دو گی" تو لیجئے قیامت آگئی۔ اب دوسری کی بھنویں تن گئیں۔

میں حیران سوچتی رہ جاتی ہوں۔ یا اللہ! یہ بھائی کیا کرتے ہوں گے؟ کیسے دو دلوں سے دلی ایک ساتھ کھیلتے ہوں گے؟ کیونکر اپنے دل کا سکون قائم رکھ سکتے ہوں گے جب کہ مجھ بہن کا یہ حلیہ ہے کہ ہر منٹ مداری کے بندر کی طرح یا کٹ پتلی کے تماشہ کی طرح دونوں کے درمیان مبتلا رہتی ہوں۔

کبھی کبھی تو جل بھن کر چیخ اٹھتی ہوں۔ "توبہ ہے۔ بھائی نے میرے لئے یہ ماما حوا کی دو حسین بیٹیاں بھاوج بنائی ہیں یا میرے دل کو پھونکنے کے لئے دو شعلے یا دو چنگاریاں —— میرے دل کا سرمایہ لوٹ لینے کے بعد بھی دونوں باری باری یہی پوچھتی ہیں —— "سچ کہنا —— تمھیں ہماری قسم۔ بھلا تم کسے زیادہ چاہتی ہو۔ بڑی بھاوج سے تو فوراً چپکے سے کہہ دیتی ہوں۔ "بھلا تم بھی کیسی بیوقوفی کی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہو؟ خود اپنے دل سے پوچھو تم سے زیادہ میں کیوں کسی کو چاہوں گی۔ میری نظر میں تم مقدم ہو بچوں کی ماں ہو، عزت ہو۔ ہاتھ اختیار تمھارا ہے۔ بچے اب ماشاء اللہ جوان ہو چلے ہیں۔ بھائی کے دل میں بھی جو تمھاری محبت ہے۔ وہ کسی اور کی کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟"

جس وقت چھوٹی بھاوج تنہائی میں میری محبت کا امتحان کرتی ہیں اور بہت ہی اہتمام سے کوئی اچھی چیز پکا کر کھلاتی ہیں اور

بقیہ صفحہ

بیچ بیچ میں یہ ضرور کہتی جاتی ہیں۔ "دیکھنا شہنا خدا کی قسم نہ جانے کیوں میرے دل میں تمھاری محبت زیادہ ہے۔ میرے حلق سے کوئی اچھی چیز اترتی ہی نہیں —— اچھا بھئی ایمانداری سے بتانا تمھیں میری محبت زیادہ ہے کہ بڑی بھاوج کی؟"

ایسے منحوس موقعہ پر کہ جب چمچہ سے مزیدار چیزیں اپنے حلق میں اتار رہی ہوں بھلا ایمانداری سے کیا بات بتاؤں؟ نہایت بھولپن چہرے پر پیدا کر کے سادگی سے کہتی ہوں۔ "بھابی تم نہیں سمجھ سکتی ہو کہ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں؟ بلے مد —— بس یہ سمجھ لو کہ میرے دل کے ہر کونے پر تمہارا تخیل ہے۔ لیکن دنیا میں برتاؤ تو سب کے ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔"

یہ کہہ کر کھڑکی کی طرف نظریں نیم وا اُٹھاتی ہوں اور دور درختوں کی جانب شاعرانہ انداز سے مسحور تکنے لگتی ہوں۔ بیچاری بھابی اور زیادہ خاطر میں لگ جاتی ہیں —— دوسرے دن میری پسندیدہ چیزیں خرید کر ڈھیر لگا دیتی ہیں۔ میرے میز پر وہ ساری چیزیں جمع کر دیتی ہیں جو برسوں کی کوشش سے بھی مجھ سے نہ ہوں۔ اچھے اچھے ہلکے ہلکے نیلگوں لفافے اور پیڈ۔ چھوٹا سا بجلی کا لیمپ۔ کسی مصنف کی تازہ ترین مختلف کتابیں۔ نام لکھا ہوا فاؤنٹن پن —— افسانے لکھنے کے لئے چکنے کاغذ کی خوبصورت جلد والی موٹی موٹی کاپیاں۔ خوشنما رنگ کی پنسلیں وغیرہ وغیرہ —— یہ سامان خوشامد سے دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ بس محبت خرید لی اور اب بڑی کی کیا طاقت جو بات بھی کرے۔ گویا یہ تحفے محبت کے سربمہر جسٹر کا غذات سمجھو۔ بڑی بھابی یہ چیزیں دیکھ کر جل جاتی ہیں۔ "اسے یہ بھی کچھ موئی الا بلا چیزیں ہیں۔ خاک نہ دھول بچائیں کے پھول —— " زیرلب یہ فقرے کہتی ہوئی مسکراتی ہیں۔ میں سمجھ جاتی ہوں کہ کوئی بہت سخت قسم کا ارادہ ہے۔

دوسرے ہی روز میرا پسندیدہ رنگ زرد جو قدرے سنہری کی ادا رکھتا ہے میرے لئے دل ہی دل میں بڑی بھابی منتخب کر لیتی ہیں اور شام تک میرے پلنگ پر فخر کے ساتھ مختلف چیزوں کو پٹکتے ہوئے کہتی ہیں۔

"لو شہنا —— ادھر دیکھو، اسے کہتے ہیں اصلی محبت - یہ ساری تمام بازار میں بس ایک ہی تھی۔ گویا بس دکان کی جان —— رنگ تمھارے تصور کے مطابق۔ اور یہ پیٹی کوٹ ایک "جاپانا مین" سے لیا۔ بہترین دستکاری کا نمونہ ہے۔ یہ گرم بلاؤس بنگالی وضع کا سلا ہے۔ اور یہ سینڈل پیر میں ڈال کر دیکھو۔ نیا فیشن ہے بہترین ساہر کے ہیں —— اور یہ پور اسٹ "ایوننگ ان پیرس" کا ہے۔ صابن۔ سینٹ۔ پوڈر۔"

میں اپنی تمام مسکراہٹیں چہرے پر قائم کر کے شکریہ کے ساتھ ساری چیزیں لے لیتی ہوں۔ "اے ہے بھابی! آپ کتنی مجھ سے

محبت کرتی ہیں اس کا اندازہ شاید کبھی نہ ہو سکے گا۔ اوہ کتنی اچھی ہے یہ ساری اور اس کا بارڈر کتنا بہترین ہے؟ آرٹ کا مکمل نمونہ ـــ" یہ ایکٹنگ کرنے کے بعد میں ہنستے ہوئے اطمینان کا سانس لیتی ہوں ـــــ

یا اللہ بھائی کیسے اپنے دل کو برابر سے تقسیم کرتے ہوں گے یا پھر قدرت کی ستم ظریفی سے دو دل ہوں گے۔ ڈاکٹری "ایکسرے" ہو تو یقینی صحیح جانچ ہو سکے۔

ایک دن بچوں بچوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بڑے بچے نے چھوٹی بھابی کی بچی کو سر سے اونچا کیا۔

"بول اب سے میرے پڑھتے میں بال نوچ کر بھاگے گی۔ چڑیل چھپکلی کہیں کی ـــــ"

"اوں اوں ـــــ ہائے رے مری ـــ امی امی ـــــ نوچونگی سو دفعہ نوچوں گی۔"

"اچھا چڑیل تو میں تجھے ایسے ہی بس رسی میں لٹکائے دیتا ہوں بول کر توبہ ـــــ توبہ کئے بغیر شام تک یونہی ٹانگ دونگا کہیں۔"

منظر تو یہ ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کو بیساختہ ہنسی آ جائے۔ لیکن جناب دونوں بچوں کی ماؤں کو ذرا رقابت کا تاؤ آ گیا۔ بڑی بھابی نے چپل اتارا اور ان گنت بیچارے کی کھوپڑی پر جڑ دیئے اور چھوٹی نے اپنی بچی کو مار مار کر ادھ موا بنا دیا۔ میں بے ساختہ دوڑی ـــــ "تم دونوں کیا آگرہ جانے کی تیاری کر چکی ہو۔ جو بالکل حواس میں نہیں ہو۔ بھلا غضب خدا کا بچوں کی اتنی اتنی سی بات میں الجھنا کس بیوقوف نے بتایا ہے؟" بڑی بھابی ہانپتے ہوئے بولیں۔ "میری قسمت خراب نہ ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ جلاپے میں رات دن سوختہ ہو کے رہ گئے۔" چھوٹی بھی تیز ہو کر بولیں۔ "اوہو جلاپا کس بات کا؟ ہر چیز برابر ملتی ہے۔ سسر بھی ساری کمائی تمھارے حوالے کرتے ہیں۔ بچے بھی کھانے والے ٹھونسنے والے تمھارے سات ہیں۔ میرے تو یہی ایک کیڑا سی بچی ہے جسے سارے دن دُر دُر پھٹ پھٹ تمھارے بچے کرتے رہتے ہیں۔"

بڑی بھابی تڑخ کر بولیں ـــــ "اے ہے تمھارے منہ میں خاک میرے بچوں کو کیوں نظر لگاتی ہو؟ خصم تو قبضہ میں کر لیا اب کیا بچوں پر بھی کل کل کرو گی۔ شرم نہ آئی بچوں والے، بیوی والے سے نکاح کرواتے ہوئے ـــــ کہیں سے پیغام ہی اللہ کے فضل سے نہ جڑتا ہوگا۔"

"کیوں نہ میرا کوئی پیغام آتا۔ ہزاروں گھر کے ایک سے ایک اچھے پیغام تھے۔ میری تو قسمت پھوٹنے کو تھی۔ میں کیا خود ڈولی چڑھ کر آ گئی تھی۔ ہزاروں خوشامدیں ابا جان کی کیں۔ لاکھوں خط بھیجے جب جا کر نکاح ہوا ـــــ"

"اے تو تم بول اٹھی ہوتیں۔ شرع میں تو حکم ہے۔ کیوں میرے گھر کو آگ لگانے آ دھمکی۔ بس میرا ہی میاں رہ گیا تھا۔ دنیا میں اور کوئی ٹھکانا نہ ملتا۔ ڈھکی چھپی بیوی تو میں نہ تھی۔"

"دیکھو ذرا زبان سنبھال کر بولو۔ ورنہ آتے ہوں گے میں تمھارے یہ سب اعمالنامے کہہ دونگی۔"

"کہہ دو۔ میں کیا ڈرتی ہوں ـــــ پندرہ برس کی بیاہی ہوں۔ تو اب چار دن کی آئی میرے کیا منہ لگے گی۔"

لڑتے لڑتے دوپہر سے تیسرا پہر ہو گیا۔ بھائی کے آنے کا وقت ہو گیا۔ میں دونوں کی باتیں سن کر مزے لے رہی تھی۔ اب ذرا بھائی کی گوفت کا خیال کرتے ہوئے اٹھی ـــــ

"اے ہے توبہ ہے کیا مصیبت آ گئی ـــــ دنیا میں اور بھی ہزاروں گھروں میں دو دو ہیں۔ کہیں یہ آفت نہیں دیکھی۔ خدا کی قسم تم دونوں کی ہائے ہائے میں میرے بھائی تو آدھے ہو کر رہ گئے وہ بات ہی نہ رہی۔ ہر وقت بس پریشان صورت، برباد زندگی بنے رہتے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی محبت کا گیت گا گا کر کیوں اور زیادہ انھیں برباد کرتی ہو۔ وہ تو خود ہی اپنی ہستی سے بیزار رہتے ہیں۔ چھٹی کے روز بھی گھر سے دہشت زدہ دور دور رہتے ہیں سچ کہتی ہوں اگر اب سے تم دونوں ذرا بھی لڑیں تو میں کھٹ سے افسانہ لکھ دوں گی۔"

افسانے کا نام سن کر دونوں شرما گئیں۔ بس یہ واحد ترکیب لڑائی ختم کرنے کی مجھے معلوم تھی۔ گو میں خواہ مخواہ سروپ نکھا (راون کی بہن) بنی ہوئی ہوں مگر اخبار اور رسالے کے نام سے خوفزدہ تھیں ـــــ

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے آوارہ و منتشر اڑ رہے تھے۔ ایسے میں میرا خیال نہ جانے کہاں سے کہاں پرواز کر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے کسی بیکس کی ٹھنڈی آہوں کی طرح دل میں پیوست ہوئے جا رہے تھے ـــــ دل یونہی کچھ غمگین تھی میں ڈوب سا رہا تھا۔ ایسے میں میں کوچ پر ایک طرف سر رکھے چھت کی چھپکلی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک بھائی نے اپنا ہیٹ میز پر رکھ دیا اور زنانہ اخبار میری طرف پھینکتے

ہوئے بولے۔ "تم بالکل اچھی خاصی احمق ہو۔ اُلّو ہو۔ گدھی ہو۔۔۔ نالائق ہو۔۔۔ بدتمیز ہو۔۔۔"

"ہائیں ہائیں۔ یہ بے قصور خطاب کیوں بخشے جا رہے ہیں۔۔۔ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔۔۔"

"سلمٰی کا اشتہار پڑھو۔۔۔ اور چلو۔۔۔ دونوں بھاوجوں کو ضرور دکھاؤ۔۔۔؟"

خیر صاحب سب کو تیار کر لیا۔ اور چل دیئے۔۔۔ کچھ دیکھتے وقت دونوں بھابی دم بخود تھیں۔ بھائی کا مذاق سمجھ گئیں۔ واپسی پر میں بولی۔۔۔ "بھائی تو بس بھیا تم بھی حج کا ارادہ کر لو۔"

"تمہارے بھائی نے چلیں گے تو چلوں گی۔۔۔"

بھائی جل کر بولے۔ "چھوڑو خالہ بلّی مرغا اللہ دا ہی جیئے گا۔ خواہ مخواہ تم دونوں کے ساتھ حج بھی اکارت کروں۔۔۔ نیت کہیں۔ دل کہیں۔ سکون ہی نہ ہوگا۔ تو حج بھی صحیح نہ ہوگا۔ ہاں یہ ارادہ ضرور ہے کہ تم دونوں کی ٹھر ٹھر لو جنگ نے خدانخواستہ جنگ میں اور ترقی کی تو بس تنہا کو لے کر چلا جاؤں گا۔ تم لڑ لڑ کر محلہ والوں کی منٹنگ کرتی رہنا۔"

موسم سرما کی ایک انتہائی ٹھنڈی بات تھی۔ میں عموماً ان طویل راتوں کو ناول پڑھ پڑھ کر ختم کیا کرتی ہوں۔ اچانک بڑی بھابی کے کمرے سے غصہ کی لہریں اٹھنے لگیں۔ جیسے کسی نے ریڈیو کھول دیا۔۔۔ میں غور سے سننے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔ بھابی کی سسکیاں، بھائی کے شکوے۔ چیخ۔۔۔ میں متفکر ہو گئی۔ بیچارے بھائی آجکل ویسے ہی بیمار ہیں۔ ان کی سمجھ پر کیا مصیبت آگئی تھی جو یہ دوسرا عذاب خریدا۔ بھابی کہہ رہی تھیں۔۔۔

"تم تو دنیا دکھاوے کو میرے کمرے میں رہتے ہو ورنہ تمہارا دل تو بس چھوٹی بیگم میں اٹکا رہتا ہے۔ یہ میری محبت ہوتی تو میرے اوپر یہ ظلم ڈھاتے۔ اب سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ تمہیں کیا خبر میرے دل پر کیسا کیسا دھواں انتشار رہتا ہے۔ میری ہستی تو ایک نوکرانی سے بھی بدتر ہے۔ پہلے تو ساری رات محبت کی باتیں کرتے گزار دیتے تھے۔ اب تو کتے سے بھی بدتر اوقات سمجھ رکھی ہے؟"

بھائی غصہ سے کہہ رہے تھے۔ "افسوس تمہاری حالت پر۔۔۔ میں بھلا بیماری کی حالت میں کیسے ساری رات محبت کا راگ الاپ سکتا ہوں۔ اور پھر وہ وقت بھی گزر چکا اب تو سکون سے سانس لینے دو۔ بیکار کی باتیں ہر وقت مجھ سے بکی نہیں جاتیں۔ پہلے لاکھ کہتا تھا کہ تم صاف رہو۔ گھر صحیح رکھو۔ بچے اچھی طرح رکھو۔ میری طبیعت کو پہچانو تو جواب ملتا تھا کہ ہم تو ایسے ہیں اور ایسے ہی رہیں گے۔ میری نیکیوں سے تم سر پر چڑھ گئیں۔ مجھے نوکر سے

بدتر سمجھتی تھیں۔ غلام سے بھی کمتر۔ اب جناب نے ہوش سنبھالا جب تیر کمان سے نکل چکا۔ اب اگر زیادہ بک بک کی تو کل سے گھر آنا چھوڑ دونگا۔ پڑا رہونگا کسی مسافر خانے میں۔"

بھابی شاید روتے روتے چپکی ہو رہیں۔ مجھے کوفت سی ہونے لگی یہ بھائی کی زندگی ہے یا اچھی خاصی زبردستی کی ایکٹنگ؟ صبح بھائی چلے گئے دفتر تو میں نے بھابی سے قصہ چھیڑا۔ کیا بات تھی؟ انھوں نے الف سے لیکر ی تک دکھڑا سنایا۔ میں نے بہت دیر سمجھایا۔ دیکھو غلطی تمھاری تھی۔ بھائی کی طبیعت میں کچھ وحشت اور شاعرانہ پن تھا۔ اور طبیعت بے انتہا حساس تم نے سیدھے منہ بات کرنا بھی کفر سمجھا۔ اب جبکہ دوسری شادی کرلی تو تم نے اپنی اور ان کی جان اجیرن کرلی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ غلطی تو بھائی کی ہے لیکن آخر غلطی کا کچھ نہ کچھ علاج بھی ہونا لازمی ہے۔ خالی ہائے ہائے سے کیا بن سکے گا۔ اب بچوں پر ترس کھاؤ اور جس کو چاہتی ہو اس کے لئے جذبات کی قربانی دو۔"

بھابی افسردہ سنتی رہیں اور آنکھوں میں آنسو لیئے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ دوسرے روز پھر نئی مصیبت۔ آج چھوٹی بھابی کے کمرے سے وہی سسکیاں، آہیں، وحشت کی آوازیں: بھائی کی مجبور چیخیں—جیسے کہ عاجز ہو چکے ہوں۔ میں بیساختہ کہہ اٹھی لاحول ولاقوۃ، لعنت ہے اس محبت کے رومان پر۔ اگر میں مرد ہوتی تو سرے سے شادی ہی نہ کرتی۔ صبح کو چھوٹی بھابی کی کان پکڑی کی۔ کیوں بھابی! یہ رات کیا مصیبت اٹھ رہی تھی کیا تم دونوں نے ایکا کرلیا ہے کہ سکون کو اپنے گھر سے بہت دور بھگا کر سانس لوگی غضب خدا کا دو تین مہینہ ہو گیا بھائی کو جاڑا بخار آتے ہوئے اس قدر تو کمزور ہو گئے ہیں۔ بھلا جب ہی اچھا نہ ہو تو تم لوگوں سے کیا ہنسی دلگی کی باتیں کریں اور پھر کہاں تک— اب عمر میں وہ کمسنی نوجوانی تو دور جا پہنچی۔ اب تو دماغ میں تفکرات کا غلبہ ہے اخراجات بڑھ چکے۔ بچے ماشاء اللہ سمجھدار ہو چلے۔ تعلیم کا فکر، تھیں اور تمھارے سارے کنبے کو خبر تھی کہ بھائی شادی شدہ ہیں پھر بھلا ایسی جگہ ہامی کیوں بھرلی اور اگر بھرلی تھی تو اب بہادری سے دل کی تباہی پر مسکرا کر۔ اور فرائض کو پہچانو محض محبت پرستی تو صرف خیالی قسم کے شاعروں کے دل میں خدا نے بھر دی ہے۔ یہ روز کا بھلا تم نے کیا جھگڑا نکالا—؟ توبہ توبہ!"

بھابی بیچاری کچھ شرمندہ سی ہوکر کتاب کے ورق الٹنے لگیں۔

"شہنا بہن—!"

"ہاں بھائی—!"

"ذرا میرے ہاتھ پاؤں تو دبا دو۔"

"کیوں کیسا جی ہے آپ کا—؟"

"جاڑیاں آ رہی ہیں۔ باری کا دن ہے نا"

"آپ کونین کیوں نہیں پیتے؟"

"بھئی مکسچر بہت کڑوا ہے؟"

"تو پھر گولی کھا لیجئے۔ یہ کب تک تکلیف اٹھائیے گا۔"

میں آہستہ آہستہ پاؤں دبانے لگی۔

بھابی نے آواز لگائی۔ "میں آؤں پاؤں دبانے؟" بھائی جل کر بولے۔ "بس خاکسار کو معاف دیکھئے۔ تم دونوں تو پاؤں اس طرح دباتی ہو گویا اکھاڑے میں دو پہلوان کشتی لڑ رہے ہوں۔ کوشش تو یہ کرتی ہو کہ ہم ایک دوسرے سے بازی لے جائیں: در پاؤں تمھاری مشق ستم سے توبہ کرا اٹھتے ہیں۔"

دونوں بھابی منہ چھپا کر مسکرا پڑیں۔ اور میں تو بے اختیار ہنس پڑی۔

"اچھے بھائی آپ نے کتنی بڑی بیوقوفی کی۔ بھلا کسی سے صلاح تو کر لیتے!"

بھائی نے میری کمر پر گھونسہ لگا دیا۔

"چپ چاپ بیٹھی پاؤں دباتی رہو مولانا!— میرے تو دل میں خود ہی یہ آتا ہے کہ بس فقیری لے لوں۔ اور کہیں دور جنگل میں اپنا جھونپڑا بنا کر چلا جاؤں—۔ اس ہائے ہائے سے—"

میں ہنستے ہوئے بول اٹھی۔

"جنگ کا زمانہ ہے— کپڑے کم ہیں اور جنگل بہت دور—!"

آلم مظفرنگری

قندِ پارسی

الحذر از جلوۂ ما ظلمتِ کاشانہ ایم
شمع را مانیم لیکن شمعِ ماتم خانہ ایم

از کجا آریم کیفِ زندگی شامِ فراق
از مآلِ آہ و تاثیرِ فغاں بیگانہ ایم

کارِ دیگر جز حضورِ شمع ناید در ظہور
جز تپیدن سوختن مردن کہ ما پروانہ ایم

جاہا در گردش آوردیم در بزمِ ازل
ایں چہ می گوئی کہ ما از لطفِ مے بیگانہ ایم

داستانِ قیس آوردن بہ پیشِ ما چہ سود
در جہانِ عاشقی خلاقِ صد افسانہ ایم

جز ملال و درد لطفِ زیستن از ما مجو
از سر و سامانِ عشرت سر بسر بیگانہ ایم

مست می داریم دیر و مسجد و بتخانہ را
ہر کجا بینی مآلِ گردشِ پیمانہ ایم

مختصر گیرید ذکرِ صحبتِ دشت و چمن
خود جنوں از ما گریزد آں قدر دیوانہ ایم

بسکہ دارد اے آلم شعرِ شمارنگِ جنوں
پس چہ می گوئید با عالم کہ ما فرزانہ ایم

نازش پرتاپگڈھی

آہِ خاموش

رگ رگ سے دل کی طاقتِ گفتار لی گئی
جب جاکے داستانِ محبت کہی گئی

تفصیل سے حکایتِ الفت کہی گئی
سننے کو لوتو ایک ہی ہچکی سنی گئی

اللہ رے وہ لمحۂ آغازِ دردِ عشق
میرے جہانِ دل کی فضا جھوم سی گئی

آنکھیں بھی نم ہیں دوش پہ بکھری ہے زلف بھی
کیوں اس قدر مرے لئے تکلیف کی گئی

وہ شاخ ابر و برق سے تھا جس کا ربط و ضبط
اس شاخ پر بنائے نشیمن رکھی گئی

اے چشمِ یار تیری نوازش کا شکریہ
خوش ہوں کہ مجھ سے ساری خوشی چھین لی گئی

توبہ کہ جا رہے ہیں اسی سمت پھر قدم
دنیائے عقل و ہوش جہاں لوٹ لی گئی

پھر کیا کرے جو اٹھ نہ چلے بزم ناز سے
وہ غم نصیب جس کو تسلی نہ دی گئی

اب تک مری زباں پہ ہے لبیک کی صدا
کیا جانے کس طرح مجھے آواز دی گئی

اک ناتواں کے دوش پہ سر ہو گیا تھا بار
اے موت تجھکو اس لئے تکلیف دی گئی

ہلکی سی چاندنی تھی فضا میں خوش تھیر
نازش اسی سکوت میں اک آہ کی گئی

نوشتہ:- مصطفیٰ المنفلوطی

ترجمہ:- حافظ عبدالرشید احمد ارشد
(بی۔ اے (آنرز))

درندے

میرا ایک دوست تھا جو محض اپنی علمی اور ادبی قابلیت کی وجہ سے میرا مرکزِ التفات و محبت تھا اور اسی قابلیت کی بنا پر میں اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی شرافت یا اخلاقی حالت کا جائزہ لینے کی کبھی کوشش نہ کی۔ کیونکہ میرے دل میں یہ کبھی خیال نہ آیا کہ میں اس سے علوم شریعت یا اخلاق کے سبق سیکھوں۔ کیونکہ یہ سبق میں نے پہلے سے کافی سیکھ رکھے تھے۔

اس کی صحبت میں میں نے ایک طویل عرصہ گزارا اور اس دوران میں میں نے اس کی جانب سے کوئی ناپسندیدہ فعل سرزد ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ اسے میری طرف سے کسی قسم کی شکایت کا موقع ملا۔ اسی اثنا میں میں قاہرہ سے ایک طویل سفر پر روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو ہم میں خط و کتابت جاری رہی مگر آخرکار اس کے خطوط میرے پاس پہنچنے بند ہو گئے۔ ایسی حالت میں مجھے اس کے بارے میں سخت تشویش پیدا ہونے لگی۔ چنانچہ جب میں قاہرہ واپس آیا تو میرا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ میں اس سے جلد ملاقات کروں۔ اس سلسلے میں میں نے ان تمام مقامات پر اسے تلاش کیا جہاں میں اس سے ملنے کی توقع رکھ سکتا تھا۔ مگر اس کی ملاقات سے محروم رہا۔ میں اس کے گھر بھی گیا۔ مگر اس کے پڑوسیوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس گھر کو مدتوں سے خیرباد کہہ گیا ہے اور وہ خود اس کی جائے قیام سے ناواقف ہیں ایسی حالت میں کچھ عرصہ تک تو میں امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یاس امید پر غالب آتی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ مجھے یقین آ گیا کہ میرا مخلص دوست گم ہو گیا اور یہ آئندہ کبھی اس سے ملاقات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ اس ناامیدی کے بعد فرطِ غم سے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور حقیقت میں وہی آنسو بہا سکتا ہے جس کے وفادار دوست گم ہو گئے ہوں اور وہ زمانہ کے تیرِ حوادث کا نشانہ بن چکا ہو۔

ایک دفعہ میں مہینے کی آخری اندھیری راتوں میں گھر واپس آ رہا تھا کہ سخت ہیبت ناک تاریکی میں راستہ بھول کر وحشت ناک اور ویران گلیوں میں گھس گیا۔ ایسے وقت میں دیکھنے والا ان گلیوں کے بارے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ یا تو جنات کا مسکن ہیں یا غول بیابانی کا ٹھکانہ۔ بہرحال مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک سیاہ سمندر دو اونچے پہاڑوں کے درمیان لہریں مار رہا ہے اور اس کی موجیں آگے پیچھے سے مجھے محیط ہیں۔ میں اس گلی کے عین درمیان میں پہنچا ہی تھا کہ ان ویران گھروں میں سے آدھی رات کے وقت کراہنے کی دردانگیز آواز آئی۔ میں نے کان لگا کر سننا چاہا تو وہ آواز لگاتار میرے کانوں میں پہنچی۔ جس نے میرے دل پر بہت زیادہ اثر کیا۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا "خدا کی شان ہے کہ یہ رات اپنے سینے میں کتنے مصیبت زدہ اور غم نصیب انسانوں کے بھید چھپائے ہوئے ہے" چونکہ میں نے خدا سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب کبھی کسی غم نصیب انسان کو دیکھوں تو حتی الامکان اس کی امداد کرنے کی کوشش کروں گا یا بصورت عجز و ناکامی اس پر دو آنسو ضرور بہا لوں گا۔ اس بنا پر میں نے اس گھر کی طرف جانے کے لئے راستہ ٹٹولا (جہاں سے دردبھری آواز آ رہی تھی) وہاں پہنچ کر میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس کے بعد میں نے زور سے دستک دی تو ایک چھوٹی لڑکی نے جس کی غالباً ابھی دس سال کی عمر بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ آ کر دروازہ کھولا۔ اس مدھم چراغ کی مدد سے جو اس کے ہاتھ میں تھا، مجھے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں یوں نظر آتی ہے جیسے چھٹے ہوئے بادلوں میں سے چاند جھانک رہا ہو۔ میں نے اس سے کہا "کیا تمہارے ہاں کوئی مریض ہے؟" اس پر اس نے

ایسا گہرا سانس لیا کہ قریب تھا اس کے دل کے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ کہنے لگی "اے شخص! میرے باپ کو دیکھ جو سکرات موت میں مبتلا ہے" یہ کہہ کر وہ میرے آگے ہو گئی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چھوٹے دروازے کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں جا پہنچا۔ جب میں اس میں داخل ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے زندوں کی دنیا سے مردوں کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ چنانچہ یہ کمرہ قبر کی مانند اور مریض ایک لاش کی مانند نظر آیا۔ اس کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ہڈیوں کا ایک پنجرہ ہے جس کی سانس کی آمد و رفت بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح کانٹے کے ایک برج میں ہوا حرکت کر رہی ہو۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور میرے چہرے کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور نہایت ہی پست آواز میں اس نے یہ الفاظ کہے "خدا کا شکر ہے کہ میرا دوست مجھے مل گیا" اس کے یہ الفاظ ابھی پوری طرح ادا نہ ہونے پائے تھے کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا دل گھبراہٹ اور بے چینی کی وجہ سے میرے سینے سے باہر نکلا چاہتا ہے۔ یہ حال مجھے معلوم ہو گیا کہ میں نے اس گمشدہ چیز کو حاصل کر لیا ہے جسے میں عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا حال دریافت کیا۔ اس کے جواب میں ایسا معلوم ہوا کہ میری محبت نے اس کی زندگی کے گل ہونے والے چراغ کو تھوڑی سی روشنی دے دی ہے۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا جس سے مراد یہ تھی کہ وہ اٹھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا جس کے سہارے وہ بیٹھ گیا اور اپنا قصہ ان الفاظ میں بیان کرنے لگا۔

"میں برسوں سے میں اور میری والدہ ایک ایسے گھر میں مقیم تھیں جس کے پڑوس میں ایک نہایت ہی خوشحال اور دولت مند شخص کا گھر تھا۔ اس کا عالی شان محل ایک ایسی نوجوان دوشیزہ کو چھپائے ہوئے تھا جو حسن و جمال میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ میں اس پر اس طرح والہانہ انداز میں فریفتہ ہوا کہ صبر و شکیب کھو بیٹھا اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار میں نے اس کے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کیا جس سے اس کی سرکشی دور ہو گئی اور وہ میری طرف ملتفت ہونے لگی۔ چنانچہ میں نے ایک ہی

دن میں اس کے قلب اور شرافت دونوں چیزوں کو لوٹ لیا اور تھوڑے دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ کوئی چیز اس کے اندر گردش کر رہی ہے۔ میں حیران رہ گیا اور اس بات پر غور کرنے لگا کہ ایفائے وعدہ کروں یا اس کے رشتۂ محبت کو توڑ دوں۔ بالآخر میں نے موخر الذکر طریقہ کو ترجیح دی اور اپنے قدیمی مکان کو چھوڑ کر اس گھر میں رہائش اختیار کر لی جہاں آپ سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس کے بعد اس دوشیزہ کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے تھے کہ ایک دن بذریعہ ڈاک میرے پاس ایک خط آیا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک بوسیدہ زرد خط نکالا جسے میں نے پڑھا۔ وہ مندرجہ ذیل تھا

"میں تمھیں اس لئے خط نہیں لکھ رہی ہوں کہ میں عہد شکستہ یا قدیم محبت کو تازہ کروں کیونکہ اگر یہ خیال میرے ذہن میں ہوتا تو میں تمھیں ایک سطر نہ لکھتی۔ کیونکہ میں پورے یقین کے ساتھ جانتی ہوں کہ تم جیسے غدار آدمی کے وعدے اور تمھاری جھوٹی محبت ذکر تک کرنے کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے اس کے منقطع ہو جانے کا بالکل افسوس نہیں ہے۔ چہ جائیکہ میں تجدید محبت کی خواہش کروں —

تم خوب جانتے ہو کہ جب تم نے مجھے چھوڑا تھا، اس وقت میرے دل میں آگ بھڑک رہی تھی اور میرے پیٹ میں ایک نئی مخلوق حرکت کر رہی تھی ایک طرف مجھے گزشتہ واقعات پر افسوس تھا تو دوسری طرف مستقبل کا خوف بھی دامنگیر تھا مگر تم نے ان باتوں کی قطعاً پروا نہ کی اور مجھ سے راہ گریز اختیار کی یہاں تک کہ تم نے اپنی غلطی کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی جس کے ارتکاب کے تم خود ذمہ دار تھے۔ تم نے ان آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کی جو تمھارے ہی بہائے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی میرے لئے یہ ممکن تھا کہ میں تمھیں ایک شریف آدمی سمجھوں؟ نہیں میں تمھیں ایک معمولی انسان سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی کیونکہ تم نے جانوروں اور وحشی درندوں کی کوئی خصلت بھی باقی نہیں چھوڑی بلکہ ان کے تمام وحشیانہ اوصاف کو اپنی ذات میں جگہ دے دی ہے۔

تم اپنے اس دعوے میں بالکل جھوٹے تھے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تمھیں صرف اپنی ہی ذات سے محبت تھی اصل حقیقت

یہ بھی کہ تم نے اپنے ہی نفس کو خوش کرنا چاہا اور حظوظ نفس ہی کے لئے میرے پاس آیا کرتے تھے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم میرا دعا نہ کھٹکھٹاتے نہ میرا چہرہ ہی دیکھتے۔

تم نے دغابازی کی جب تم نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا مگر اس خیال سے وعدہ خلافی کی کہ تم ایک مجرم اور بدنام عورت سے شادی کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ مگر یہ جرم اور یہ بدنامی تمہارے ہی کرتوتوں کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ اگر تم مجھے نہ بہکاتے تو نہ میں مجرم بنتی اور نہ اس قدر ذلیل عورت ٹھہرائی جاتی۔ میں نے ہر ممکن کوشش کے ساتھ تمہارا مقابلہ کیا مگر آخرکار تم سے عاجز آگئی اور تمہارے آگے اس طرح گر گئی جس طرح ایک چھوٹا بچہ ایک زبردست ظالم کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

تم نے میری عصمت و عفت پر ڈاکہ مارا اور میں ذلیل و رسوا ہو کر سراپا غم بن گئی۔ کیونکہ زندگی میرے لئے بارِ گراں ہو گئی اور میں موت کا انتظار کرنے لگی۔ کیا اس عورت کو اپنی زندگی میں کوئی خوشی حاصل ہو سکتی ہے جو نہ تو کسی کی شریک حیات بن سکے، نہ کسی بچے کی ماں کہلانے کی مستحق ہو، بلکہ وہ انسانوں کی محفلوں میں اپنا منہ بھی دکھانے کے قابل نہ رہی ہو، سوا اس کے کہ تن تنہا سر نگوں بیٹھی رہے اور اپنی آنکھیں بند کئے اپنے چہرے کو اپنی ہتھیلی پر رکھے ایک گوشہ میں پڑی رہے تاکہ اس کا جسم اور قلب طعنہ دینے والوں اور ہنسی اڑانے والوں کے طعن و تشنیع سے ہر وقت لرزتا اور پگھلتا رہے۔

تم نے میرا سکون قلب اور آرام چھین لیا۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد میں اپنے اس عالی شان محل سے جہاں میں والدین کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا رہی تھی، بھاگ جانے پر مجبور ہوئی اور عیش و عشرت کے تمام وسیع ساز و سامان کو چھوڑ کر ایک گمنام اور ایک اجنبی محلہ میں ایک خراب و خستہ گھر میں آگئی جہاں مجھے کوئی نہ پہچانتا تھا۔ تاکہ میں اپنی زندگی کے باقی ایام وہاں گزار سکوں۔

تم ہی نے میرے والدین کو قتل کیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ مر گئے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کی موت میری گمشدگی اور میرے نہ ملنے کی ناامیدی کی بنا پر ہوئی۔

میرے قاتل بھی تم ہی ہو۔ کیونکہ وہ تلخ زندگی جس کے گھونٹ میں نے تمہارے پیالے سے پئے ہیں اور رنج و غم کی وہ طویل گھڑیاں جو تمہاری بدولت میں نے گزاری ہیں میرے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر گئی ہیں کہ میں اب بستر مرگ پر ٹمٹماتی ہوئی شمع کی مانند ہوں اور میرا خیال ہے کہ خداوند کریم نے میری دعائیں قبول کر لی ہیں۔ اس نے تکالیف اور سیاہ بختی کے سیاہ خانے سے مجھے ابدی زندگی کے مسرت بخش گھر کی طرف منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

تم جھوٹے، دغاباز اور خونی چور ہو اسی لئے مجھے یقین ہے کہ وہ قادر مطلق میرا انتقام لئے بغیر تمہیں نہیں چھوڑے گا۔

میں نے یہ خط تمہاں تجدید عہد محبت کے لئے نہیں لکھا ہے کیونکہ میرے ساتھ اپنے تعلقات کو بخوبی جانتے ہو۔ علاوہ ازیں میں قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی ہوں اور اس زندگی کی اچھی بری، خوش نصیبی اور بدبختی کی سب چیزوں کو خیرباد کہنے والی ہوں ۔۔۔ بلکہ میں تمہیں یہ خط اس لئے تحریر کر رہی ہوں کہ میرے پاس تمہاری ایک امانت ہے وہ تمہاری لڑکی ہے۔ لہٰذا اگر رحم و محبت کے اوصاف فنا کر دینے کے بعد تمہارے اندر پدری شفقت کا کچھ عنصر باقی رہ گیا ہے تو اسے آ کر لے جاؤ تاکہ اسے بھی اس بدبختی کا سامنا نہ کرنا پڑے جس میں اس کی ماں مبتلا ہو گئی تھی۔"

میں اس خط کا مطالعہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہ رہی ہیں۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس نے کہا: "جونہی میں نے یہ خط پڑھا میں نے محسوس کیا کہ میرے تمام جسم پر لرزہ چھا گیا ہے اور یوں معلوم ہوا کہ جیسے فرط غم سے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ بہرحال میں فوراً اس کے گھر پہنچا۔ اور وہ یہی گھر ہے جس میں تم مجھے اب دیکھ رہے ہو۔ یہاں آ کر میں نے اسے اسی کمرہ میں اسی چارپائی پر غیر متحرک بے جان جسم پایا۔ اس کی لڑکی اس کے پاس آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور اس بے ہوشی میں میرے تمام جرائم وحشی درندوں اور سیاہ لپٹے ہوئے ناگوں کی مانند نظر آنے لگے۔ درندے اپنے ناخنوں سے مجھ پر حملہ آور تھے۔ اور سیاہ ناگ اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خدا سے یہ عہد کیا کہ میں اس کمرے سے باہر نہیں نکلوں گا جسے میں نے کلبۂ احزان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ میں نے یہ

معصمم عزم کیا کہ میں اسی خاتون کی طرح یہیں زندگی گزار دوں گا اور اسی طرح یہیں جان دے دوں گا۔

آج میں خوش اور مطمئن ہو کر دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں کیونکہ میرا دل میری رہنمائی کرتا ہے کہ خدا نے میرے گناہ میری ان تکالیف اور بدبختیوں کی بدولت جو میں نے برداشت کی ہیں معاف کر دیتے ہیں "

وہ یہاں تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ اس کی زبان بند ہو گئی اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور فوراً ہی وہ اپنے بستر پر گر گیا۔ آخرکار یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی "اے میرے دوست میری بیٹی" تھوڑی دیر تک میں اس کے پاس بیٹھا رہا اور ایک دوست کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد میں نے اس کے دوستوں اور شناساؤں کو خطوط لکھے۔ وہ سب اس کے جنازے میں حاضر ہوئے۔ اس دن رونے والوں اور ماتم کرنے والوں کا جو دل خراش نظارہ تھا۔ وہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ خدا جانتا ہے کہ میں اس کا افسانہ تحریر کرتے وقت اپنے آنسوؤں اور حسرت ناک جذبات کو ضبط نہیں کر سکا اور جب تک میں زندہ ہوں اس کی آواز اور اس کے اس قول کو فراموش نہ کر سکوں گا جبکہ وہ زندگی کے آخری سانس ختم کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"میرے دوست! میری بیٹی"

آخر میں افسانہ نگار منفلوطی یہ کہتا ہے: "اے طاقتور مردو! ان کمزور دل عورتوں پر رحم کرو جس وقت تم ان کی شرافت، عفت و عصمت کو دغا بازی سے لوٹ لیتے ہو، اس وقت تمھیں خبر نہیں ہوتی کہ تم کتنے دلوں کا خون کرتے ہو اور کتنے لوگوں کا خون بہاتے ہو۔

(النظرات)

افسانہ

کمال احمد صدیقی

کلرک!

"یہ کیا ستم ظریفی ہے۔ آگ لگانے والی ہی کو خبر نہیں کہ اس نے میرے دل میں ایک ایسی آگ روشن کر دی ہے جس کے شعلوں کی لپٹیں میری روح تک کو جھلسائے ڈال رہی ہیں۔ اور شاید میں اسی آگ میں جل کر خاک ہو جاؤں گا۔ لیکن اسے نہ معلوم ہو پائے گا کہ یہ آگ اسی کی لگائی ہوئی تھی جس نے مجھے پھونک ڈالا!"

پھر اس کے ذہن میں آیا ــــ "لیکن اس میں اس بے چاری کی کیا غلطی۔ غلطی تو سب میری ہی ہے۔ وہ تو بالکل معصوم ہے۔ وہ تو جانتی تک نہیں کہ میں نے اس سے کیا کیا امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں ــــ وہ جانتی بھی کیسے! ــــ میں نے کبھی کوئی اظہار نہیں کیا۔ اس سے صرف ایک ہی بار تو ملا ہوں اور وہ ملاقات بھی ایک حادثہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ کیا محض ایک حادثہ پر محبت کے محل کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے؟۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ بہتوں کا خیال ہے کہ "محبت" وہی ہے جو پہلی نظر میں پیدا ہو جائے۔ لیکن ایک حادثہ "حادثہ" ہی ہے۔ "حادثہ" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں تو اس سے متاثر ہوا۔ ممکن ہے وہ نہ ہوئی ہو۔ یا کیا معلوم وہ بھی ہوئی ہو ــــ ہر ایک آگ پینے جانے والے کو پیغمبری نہیں مل جایا کرتی"۔

اور وہ ماضی کے دھندلکوں میں اپنی زندگی کا پہلا اور آخری حسین رومان ٹٹولنے لگا۔ جس نے اس کی دنیا ہی بدل دی۔

چھ سال پہلے جب وہ بی اے میں پڑھتا تھا۔ مہیش اس کا کلاس فیلو تھا اور اس کے علاوہ اس کا "جگری" دوست بھی۔ ایک شام کو وہ مہیش کے گھر پر گیا لیکن وہ موجود نہ تھا۔ وہ دن بھی "اتوار" ہی تھا اور آج بھی "اتوار" تھا۔

"کہیں گئے ہیں"، ایک لڑکی نے کوٹھے کی کھڑکی سے چہرہ نکال کر کہا۔ جس کو اس نے پہلی بار مہیش کے گھر پر دیکھا تھا۔

"کہاں گئے ہیں؟"

"کچھ بتا کر نہیں گئے"۔

"کب تک لوٹیں گے؟"

"یہ بھی کہہ کر نہیں گئے۔ آپ اپنا نام بتا دیجئے۔ میں کہہ دوں گی"۔

"راج کمار ہے میرا نام۔ کل یونیورسٹی میں تو ملیں گے ہی"۔

بس اتنی سی بات تھی۔ حادثہ ہی تھا۔ وہ مہیش کے یہاں بہت زیادہ آنے جانے لگا لیکن پھر کبھی لڑکی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ لڑکی کا نام تھا رجنی۔ وہ مہیش کی چھوٹی بہن تھی جو چند دن کے لئے گاؤں سے آئی ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ تھوڑے دن بعد وہ پھر گاؤں واپس چلی گئی۔ چھ مہینے کے بعد ایک آس، ایک امید جو ہو سکتی تھی وہ بھی ٹوٹ گئی۔ کیونکہ مہیش "آئی سی۔ ایس" کی تعلیم حاصل کرنے ولایت چلا گیا۔

"اسی زمانہ میں اگر وہ شادی کی کوشش کرتا تو شاید کامیاب بھی ہو جاتا۔ لیکن اب ذرا مشکل تھا۔ کیونکہ وہ چالیس روپیہ ماہوار پانے والا کلرک تھا۔ اور رجنی اب ایک "آئی۔ سی۔ ایس" کی بہن تھی۔

اس کے خیالات نے ایک اور رخ بدلا ــــ "یہ بیسویں صدی ہے۔ اٹھارویں صدی نہیں جب عشق ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اب تو عشق کیا جاتا ہے۔ اپنے حسب حیثیت جس سے چاہے عشق لڑا لو۔ کیا واقعی میں پاگل ہوں! چالیس روپیہ کا کلرک "آئی سی ایس" کی بہن سے عشق کرے! لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے تو شروع ہی سے کوشش کی کہ اسے اپنے دل میں جگہ بنانے نہ دوں۔ لیکن دل ہی خود بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا گیا اور وہ میری ہستی پر چھاتی ہی چلی گئی۔ شاید یہ سری محبت۔ بیسویں صدی کا معاشقہ نہیں"۔

پرسوں شام کو وہ فائلیں بغل میں دبائے ہوئے دفتر سے لوٹ رہا تھا۔ اپنی زندگی میں دوسری بار اس نے رجنی کو دیکھا۔ اس وقت وہ مہیش کے ساتھ موٹر پر جا رہی تھی اور وہ امین آباد کی دکانوں کے برآمدہ میں تھا۔ اس نے سوچا کہ مہیش کو آواز دے۔ لیکن اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔ اگر مہیش اسے دیکھ لیتا تو خود موٹر روک کر اس سے ملتا، لیکن شاید نہ ملتا اور دیکھنے کے بعد بھی اس طرح دوسری

طرف اپنی توجہ ظاہر کرتا جیسے اُس نے دیکھا ہی نہیں اور پھر چند
سکنڈ میں تو موٹر کہیں کا کہیں ہوتا ہے۔ اب وہ "انڈین سول سروس"
کا ایک افسر تھا۔ اور پھر ولایت پہنچکر اُس نے ایک خط بھی تو اپنے
جگری دوست کو نہیں لکھا تھا: "آئی۔ سی۔ ایس" قلم کے بعد لگنے سے
پہلے ہی ہندوستان کے نوجوانوں کی طبیعت میں غرور آجاتا ہے
مگر ان میں غرور پیدا نہ آئے تو پھر کن میں آئے؟ اور اگر وہ معمولی
انسانوں سے برابر والوں کی حیثیت سے ملیں تو "آئی۔ سی۔ ایس"
اور غیر آئی۔ سی۔ ایس میں کیا فرق رہ جائے؟ کچھ نہ کچھ انفرادیت
تو ہونا چاہئے جو سماج میں اُنھیں سب سے بلند، سب سے اونچا، معمولی انسانوں
سے الگ ایک درجہ دے۔

آٹھ گز لمبی "سول لسٹ" کی ورق گردانی کے بعد اُسے
پتہ چلا کہ مہیش ڈپٹی کلکٹر ہے۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ سول لسٹ
کتنی کار آمد چیز ہے۔ ٹیلیفون ڈائرکٹری نے پتہ کی بھی مشکل آسان
کر دی۔ اگر تانگہ والے سے کہہ دیا جائے کہ بند ریا باغ میں مہیش
کمار ڈپٹی کلکٹر کے بنگلے پر جانا ہے تو وہ پہنچا دیگا۔

اُس نے انگڑائی لیکر جسم پر کی چادر ٹانگوں سے پھینک دی
اور تکیہ کے نیچے سے "ڈی بکس" کی ڈبیا اور دیا سلائی نکالی۔ لیٹے ہی
لیٹے اُس نے دبی ہوئی سگرٹ انگلیوں سے دبا کر گول کی اور پینے لگا۔
سورج کی کرنیں کھڑکی سے ہوکر اُس کے مُنہ پر آرہی تھیں اس لئے
وہ بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

(دو بجے دن کو)

"اگر آج اس سے نہ مل پاؤں گا تو ایک خط اُسے ضرور ہی
لکھ دونگا۔ لیکن خط اگر مہیش کے ہاتھ لگ گیا؟ — یا اُس نے مہیش
سے شکایت کر دی تو......" اور "تو" کے آگے وہ کچھ اور نہ
سوچ پایا۔ کیونکہ وہ خیالات کے دھارے میں بہا جا رہا تھا اور
اُس کے ذہن سے بالکل ہی اتر گیا کہ وہ "شیو" کر رہا ہے اور
آج نیا ہی "سیون۔ او۔ کلاک" تھا۔ ہاتھ میں ذرا سی لرزش ہوئی
جسم میں ذرا سا رعشہ پیدا ہوا اور اُس کا گال ٹھوڑی کے پاس سے
کٹ گیا۔ بہت دیر تک وہ مدھم آئینہ میں اپنا آدھا شیو کیا ہوا
چہرہ دیکھتا رہا اور قمیص کے دامن سے خون پونچھتا رہا۔ خیالات
کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

"سوٹ کوئی ہے ہی نہیں — گانے سے بکنے تین کوٹ۔ دو خاکی
اور دو سفید زین کی پتلونیں۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں۔ نہ دھوتی بھی کوئی
عمدہ کلف دار نہیں ہے۔ ہسل والی سلک کی شیروانی ضرور
ایک ہی بار تو پہنی ہے۔ چوڑی دار پاجامہ اچھا رہے گا لیکن قمیص؟
...... وہ پہلی سے جو کرتا کاڑھ کر دیا تھا وہ تو رکھا ہی ہے —
کرتے کے نیچے بنیائن کی بھی تو ضرورت ہے — ویسے تو کئی
بنیائنیں ہیں لیکن رخنہ دار اچھی نہیں رہیں گی خیر ابھی وقت
ہے۔ امین آباد سے ایک بنیان خریدی جا سکتی ہے۔ کرتے پر
تو سینڈ وکٹ ہی اچھی رہے گی۔ چار ہی پانچ آنے تو جائیں گے مگر بڑی
نیکی چیز "ڈیسنٹ" ہوگی۔ اور پھر پشاوری اچھی ہے۔ ایک ڈبیا
"کیوی" بھی لونگا چمک جائے گی۔ پشاوری پر موزہ نہ پہنا تو قطعی،
اور وہ خود کو بنا سنورا دیکھنے لگا لیکن فوراً ہی اُس کی نظر سامنے رکھے
ہوئے آئینہ میں آدھے شیو کئے ہوئے چہرے پر پڑی صابن خشک
ہو چکا تھا۔ جلدی جلدی برش سلائٹ کی پتی پر رگڑ کر وہ اپنے گال
پر پھیرنے لگا۔

آئینہ ہاتھ میں لیکر ایک "آرٹسٹ" کی نظر سے اُس نے اپنا چہرہ دیکھا۔
اُسے خود حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا اچھا شیو کر سکتا ہے۔

"شاید اتنا "کلین شیو" تو حضرت گنج کا پارکن سلیمان والا بھی نہیں کر سکتا جو
ایک شیو کے آٹھ آنے چارج کرتا ہے" سلائٹ کی پتی لیکر وہ نہانے کیلئے
چلا۔ دروازے کے پٹ پڑے ہوئے گرد آلود شیشہ میں اُسے اپنے
چہرے کے عکس کی جھلک دکھائی دی۔ وہ ٹھہر گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔
لیکن عجیب بدنما چہرا تھا۔ ناک لمبی ایک طرف کا گال پھولا ہوا اور بائیں طرف
کی آنکھ بھینگی تصویر لیتے وقت اگر کیمرہ یا آدمی ہل جائے تب بھی اُس سے
اچھا ہی فوٹو کھینچے گا۔ اُس کا چہرہ اسی کو منہ چڑھا رہا تھا۔ "کیا واقعی میں
ایسا ہوں؟" گھبرا کر وہ آئینہ کی طرف لپکا اور اپنا خوبصورت چہرہ دیکھکر مسکرانے لگا۔

تانگہ والے کو ایک روپیہ دینا اُسے کھل گیا لیکن "جھک جھک" کرنا اُسے
مناسب نہ معلوم ہوا۔ شہر ہی کے اڈے تک پیدل آکر اُس نے تانگہ اسی لئے
کیا تھا کہ کرایہ کم دینا پڑے لیکن یہ اسی کی غلطی تو تھی جو وہ پہلے طے کرنا بھول گیا۔

"آپ کس سے ملئے گا؟"

"مہیش سے۔"

"اسوقت کلکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔" چپراسی نے تیز نظروں
سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے انھیں سے ملنا ہے اسوقت ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی؟" اُسنے ناک بھوں سکیڑ کر کہا۔

"آپ کس کام سے آئے ہیں؟"

"کہہ تو دیا کہ ملنے آیا ہوں۔"

"کیوں؟" چپراسی روپیہ اینٹھنے کی فکر میں تھا۔

"کیوں؟ کا کیا مطلب؟"

"کلکٹر صاحب کا حکم ہے کہ اس وقت وہ کسی سے نہ ملیں گے۔ آپ اُن کے رشتہ دار ہیں یا آپ سے اُنھوں نے ملنے کو کہا تھا؟"

"میں دوست ہوں" "ایک پرچہ پر اپنا نام لکھ دیجئے"

اُسے یاد آیا کہ بڑے آدمیوں سے ملنے کیلئے "وزیٹنگ کارڈ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ چپراسی نے کاغذ اور پنسل دے دی۔ "راجکمار یور کلاس فیلو" لکھ کر اُس نے چپراسی کو دے دیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"اماں یار تم یہیں ہو؟" جلدی ہی مہیش کمرہ میں آگیا اور اس سے لپٹ گیا۔ "ابتک کیوں نہیں ملے؟" "مجھے فرصت ہی نہیں ملی"

"واہ کیا فرصت ہے آپکی؟ ایسے کاموں کیلئے فرصت کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"کل ہی تو مجھے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو"

"اور میں سمجھتا تھا کہ تم کہیں باہر ہو" اور اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپراسی فوراً داخل ہوا۔

"دیکھو 'ٹی' لاؤ"

"آجکل کر کیا رہے ہو؟" مہیش پھر اُس کی طرف مخاطب ہوا۔

"ڈائرکٹر آف ایگریکلچر کے آفس میں کلرک ہوں"

"کیا گریڈ ہے؟"

"۴۰ — ۳ — ۶۵"

"میرے آفس میں سپرنٹنڈنٹ کی پوسٹ 'وکینٹ' ہے۔ اگر 'فیل' نہ کرو تو وہاں 'ریزگنیشن' دیکر یہاں 'جوائن' کر لو"

"لیکن میں تو اب اوور ایج' ..."

"ڈونٹ کیئر" میں گورنمنٹ سے 'اکسپشن' 'آبٹین' کر لوں گا"

"تم اکیلے ہی رہتے ہو یہاں؟" ایک دم سے اُس نے موضوع بدلا۔

"نو نو، رجنی بھی میرے ساتھ رہتی ہے"

چائے کی ٹرے آگئی۔ مہیش نے چائے بنائی اور دونوں پینے لگے۔

"یہ سینڈوچیس لو۔ تم تو تکلف کر رہے ہو" مہیش بولا۔

"تھینک یو، میں چائے پی کر آیا تھا۔ پھر شام کا کھانا رہ جائے گا"

"یہ تو بہت 'لائٹ' ہیں کوئی 'ہارم' نہیں کریں گی"

"پرسوں شام کو میں نے تمھیں دیکھا تھا" اُس نے سینڈوچ اٹھالی۔

"میں نے تمھیں نہیں دیکھا۔ تم نے مجھے روکا نہیں۔ بڑا غضب کیا"

"میں ذرا 'ہری' میں تھا"

ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کمرہ میں داخل ہوا۔ مہیش نے تعارف کرایا۔

"آپ میرے پرانے دوست اور کلاس فیلو مسٹر راجکمار ——— اور آپ مسٹر چندر کمار سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ 'نیو فرینڈ' مائی سسٹر رجنی۔ 'ہی از ہر ہسبنڈ'۔"

چندر کمار نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس کے معصوم دل میں پہلی بار حسد کا جذبہ پیدا ہوا۔

"مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"

"یہ میری خوش قسمتی ہے جو آپ سے نیاز حاصل ہو گیا۔ مجھے دلی مسرت ہوئی۔" لیکن اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا تھا۔

"تمھارا ایڈریس ہی نہیں معلوم تھا۔ ورنہ 'انویٹیشن' بھیجتا۔ ابھی 'ریسنٹلی میرج' ہوئی ہے۔ بڑا لطف رہا۔" مہیش نے کہا۔

"اچھا اب مجھے اجازت دیجئے"

"اماں اتنی جلدی۔ ابھی آئے ہی ہو۔ کتنا ٹائم ہوا ہے ابھی تو آدھی 'ٹی' تمھارے 'کپ' میں ہے"

"مجھے صاحب کے بنگلے پر جانا ہے۔ انہوں نے بلوایا تھا"

"بڑا افسوس ہوا۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھتے ——— لیکن اب روک بھی نہیں سکتے۔ آج سنیما کا پروگرام بھی تھا۔ چلئے"

"پھر حاضر ہوں گا!"

"گڈ بائی"



تاریخ ہند کا سب سے بڑا باغی

جس نے آج سے دو صدی پیشتر بے انصافی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا جس کے کیریکٹر کی بلندی کے سامنے شاہانہ جاہ و جلال ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تاریخ آج بھی اُس کی بیخوفی پر مسکرا رہی ہے

پربھات کا تاریخی معجزہ

رام شاستری

پروڈیوسر: فتح لال داملے

ڈائریکٹر: جاگیردار

گیت مکالمے: قمر جلال آبادی

جسے دیکھ کر آپ اپنے وطن، اپنی تاریخ اور اپنی قومیت پر فخر کریں گے

اداکار

جاگیردار - اننت مراٹھے - للتا پاور - میناکشی - سدھا آپٹے - بے بی شکنتلا - وٹھل

پربھات لاہور اور منروا دہلی

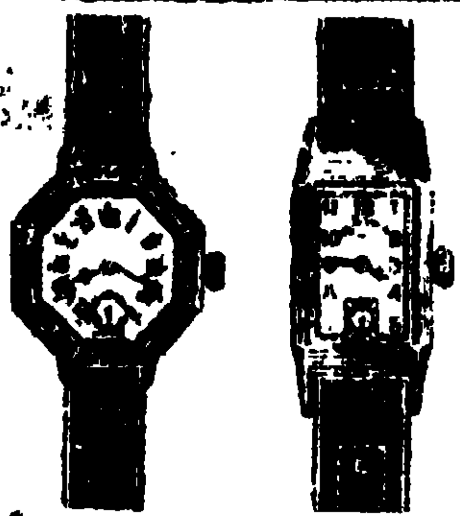
میں

دکھایا جا رہا ہے



ستارہ فلم لمیٹڈ - ریلیز

دس ہزار روپیہ کی گھڑیاں مفت انعام



ہماری کمپنی نے اپنی مشہور فائدہ مند دوائیوں کی مشہوری کے لئے ہر شیشی کے خریدار کو ایک نفیس مفت رسٹ واچ اور ایک انگوٹھی (سونا) لنڈن نیو گولڈ مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔
جلد منگائیں اور فائدہ حاصل کریں!

بال عمر بھر نہیں اُگتے

ہماری مشہور و معروف دوائی اصلی جوہر حسن (رجسٹرڈ) کے لگانے سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتے ہیں۔ اور پھر زندگی بھر دوبارہ اس جگہ بال کبھی پیدا نہیں ہوتے۔ جگہ ریشم کی طرح ملائم، نرم اور خوبصورت نکل آتی ہے۔ قیمت فی شیشی صرف دو روپے آٹھ آنے (Rs 2/8/-) تین شیشی پورا کورس کی رعایتی قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے (Rs 6/8/-)۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک نفیس میوٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت ہے اور ایک انگوٹھی (سونا) لنڈن نیو گولڈ بالکل مفت بھیجی جاتی ہے۔

ضروری نوٹ ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک بالکل معاف اور چار انگوٹھی لنڈن نیو گولڈ اور چار عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام دی جاتی ہیں۔ جلدی کریں۔ ورنہ یہ موقعہ بار بار ہاتھ نہ آئے گا۔

بال کالا تیل نمبر ۱

یہ تیل عام تیل کی شکل میں ہے جو ہاتھوں پر مل کر بالوں پر لگایا جاتا ہے۔ یہ بالوں کو جڑ سے کالے کرتا ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے بال ہمیشہ کے لئے سیاہ رہتے ہیں۔ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔ بالوں کو لمبا اور گھنا بناتا ہے اور چمکدار بناتا ہے۔ جہاں بال اُگتے ہوں از سر نو پیدا کرتا ہے یعنی گنجا پن کو دور کرتا ہے۔ دماغ کو طاقت دیتا ہے اور حافظہ کو تیز کرتا ہے۔ ہر قسم کی دماغی کمزوری مثلاً چکر، بادٹ سر کا چکرانا، نیند کم آنا اور سر درد کو فوراً دور کرتا ہے۔ بینائی کو بڑھاتا اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ نہایت اعلیٰ خوشبودار ہے جس سے پرندے تک مست ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی شیشی صرف دو روپے آٹھ آنے (Rs. 2/8/-)۔ تین شیشی (پورا کورس) کی رعایتی قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے (Rs 6/8/-)۔ اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک نفیس میوٹ واچ جو کہ نہایت خوبصورت ہے اور ایک انگوٹھی (سونا) لنڈن نیو گولڈ بالکل مفت بھیجی جاتی ہے۔

ضروری نوٹ ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جاتی ہے۔ تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک بالکل معاف اور چار انگوٹھی لنڈن نیو گولڈ اور چار عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام دی جاتی ہیں۔ جلدی کریں۔ ورنہ یہ موقعہ بار بار ہاتھ نہ آئے گا۔

ملنے کا پتہ:- **لنڈن کمرشل کمپنی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۵/165 لاہور (پنجاب)**

Address: LONDON COMMERCIAL Co., Post Box No. 165, Lahore

جوانی کا بہترین راز

جو نوجوان اپنی جوانی کو بری باتوں کے ذریعہ ختم کر چکے، اور بعد کو پچھتا رہے تو اسکو دوبارہ جوانی دینے کا راز معلوم کر لیا ہے۔

ری جووِن کورس ایک ایسی ایجاد ہے کہ جس سے نا مکمل انسان سولہ دن میں مرد بلکہ **جوانمرد** بن جاتا ہے۔ اگر طاقت بالکل ہی ختم ہو گئی ہو۔ رگوں پٹھوں میں خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ دل، دماغ اور جسم کمزور ہو گیا ہو، کمر تک درد ہو۔ اور اعضائے رئیسہ میں سستی چھا گئی ہو، تو اس آسان علاج سے فائدہ اٹھائیے۔ صرف آٹھ روز تک پرہیز کرنا پڑے گا۔ علاج پورے سولہ دن کا ہے۔ بیشمار کمزور انسانوں کو اس علاج سے فائدہ ہو چکا ہے۔ اس علاج میں ایک دوا کھانے کی ہے۔ اور دوسری لگانے کی ہے۔ قیمت پانچ روپے ہے، محصول ڈاک (۱۱)

(یہ کورس صرف ان لوگوں کو بھیجا جائے گا، جو صبر سے کام لینے کا اقرار کرینگے)

اکسیری دواخانہ کلاں محل، بکس نمبر ۴۱ (اے، ایل) دہلی

جریان خطرناک مرض ہے

اگر کسی نوجوان مرد کو دھات گرنے کی بیماری لگ گئی ہے۔ اور اسکو پیشاب کے ساتھ یا پہلے یا بعد کو قطرہ آتا ہو، احتلام کی کثرت ہو، دل، دماغ میں کمزوری محسوس ہو رہی ہو، ہاتھ پیروں میں سستی رہتی ہو، اور طاقت دھات گرنے کی وجہ سے کم ہو رہی ہو تو

اس مرض کو دور کرنیکی ترکیب یہ ہے

کہ فوراً **جریانین** دوا کی ایک شیشی منگا کر استعمال کریں اور پھر اس دوا کی پہلی ہی خوراک کا اثر دیکھ لیں، گرتی ہوئی دھات کو بند کر دیتی ہے احتلام اور قطرہ گرنے کی شکایت ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتی ہے۔ پندرہ دن کا مکمل علاج ہے۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ اس سے بہتر دوا جریان اور احتلام کو بند کرنے والی آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے لاکھوں مریضوں کو اس دوا نے فائدہ پہنچایا ہے۔

قیمت پندرہ دن کی دوا کی صرف دو روپے ہے، محصول ڈاک گیارہ آنے (۱۱)

اکسیری دواخانہ کلاں محل، بکس نمبر ۴۱ (اے، ایل) دہلی

ایجنسی کی کتابیں

عالمگیر بک ڈپو لاہور میں اچھے اچھے مصنفوں کی دلچسپ ترین کتابیں دوسرے پبلشروں سے خرید کر اکٹھی کی گئی ہیں۔ تاکہ قارئین کو جگہ جگہ آرڈر بھیجنے کی بجائے ایک ہی مرکز سے تمام کتابیں بکفایت اور بسہولت مل جائیں۔ فی الحال حسب ذیل مطبوعات موجود ہیں۔

بھیگی باتیں - ایم اسلم کا تازہ ترین ناول۔ ضخامت ساڑھے تین سو صفحات۔ قیمت تین روپے

رنگین نظارے - ایم اسلم کے دس تازہ افسانے ضخامت تقریباً چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

منتخب افسانے - ترقی پسند افسانہ نویسوں کے شاہکار۔ مرتبہ قمر تسکین قیمت دو روپے

پتھر سے ہیرا - دلچسپ سبق آموز ناول ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ قیمت دو روپے۔

شام و سحر - ماں کی ممتا کی سبق آموز کہانی اور ایک پیشہ ور جفاکاروں کا خوفناک افسانہ قیمت [illegible]

اشک و شرر - کوثر چاندپوری کے رقت انگیز افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے بارہ آنے

اذبلا - عربی زبان کے بہترین تاریخی ناول کا ترجمہ از محمد سعید دہلوی۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

دل کی باتیں - افسانے سید کاظم دہلوی دو روپے

چاند سورج کی چوری - سراغ رسانی کا ناول - از مجمن دہلوی۔ قیمت دو روپے

باغی لڑکی - ۲۳ بہترین افسانے شفیق بانو شفیق۔ قیمت صرف دو روپے

صحرا نورد کے رومان - صحرا نورد کے خطوط کا دوسرا حصہ میرزا ادیب قیمت تین روپے

اَن دیوتا - افسانے میرزا ادیب قیمت اڑھائی روپے

[illegible] - ڈائری میرزا ادیب قیمت دو روپے

موت کا راگ - افسانے میرزا ادیب قیمت دو روپے

مہر و ماہ - افسانے احسان بی اے قیمت دو روپے

رباب شکستہ - یورپی افسانے۔ مترجمہ جمیل احمد کندھاپوری۔ قیمت صرف دو روپے

افکار نو - ناول، افسانہ اور ڈراما کے آرٹ پر بحث۔ از جمیل احمد کندھاپوری قیمت ایک روپیہ چار آنے

یادگار حشر - آغا حشر کے آرٹ پر بحث از جمیل قیمت [illegible]

میرا بچپن - ٹیگور کی خود نوشت ڈائری ایک روپیہ چار آنے

گیتانجلی - ٹیگور کی نوبل پرائز کتاب مع تشریح قیمت [illegible]

سرگوشیاں - ٹیگور کی مشہور کتاب "سرے بردہ" کا ترجمہ۔ از جمیل احمد کندھاپوری۔ قیمت بارہ آنے

ماسٹر جی - ٹیگور کا ایک بہترین افسانہ مترجمہ احسان بی اے [illegible]

شوخیاں - ٹیگور کا ایک اچھوتا ناول مترجمہ احسان بی اے [illegible]

خاموش حسن - ٹیگور کے دس افسانے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ڈاک گھر - ٹیگور کا ایک زندہ جاوید ڈراما از جمیل بارہ آنے

کون کسی کا - ٹیگور کا ایک دلچسپ ناول احسان بی اے [illegible]

پھول اور کلیاں - ٹیگور کے کچھ افسانے قیمت دو روپے

کمودنی - ٹیگور کی مشہور تصنیف کا ترجمہ کمودنی ایک روپیہ آٹھ آنے

الجھن - ٹیگور کے بہترین ناول "بیک" کا ترجمہ۔ دو روپے آٹھ آنے

زمانہ ساز - شرت چند چیٹرجی کی انقلاب آفریں تصنیف [illegible]

دیہاتی سماج - بنگال کی غیر فانی کتاب قیمت دو روپے

رقاصہ - سوز و گداز سے لبریز داستان ایک روپیہ بارہ آنے

آخری تحفہ - منشی پریم چند آنجہانی کے آخری تیرہ افسانے [illegible]

وفا کی دیوی - آخری تحفہ کا سستا ایڈیشن قیمت دس آنے

قاتل - منشی پریم چند کی کہانیاں قیمت دس آنے

کاروانِ حیات - ناول سیتا دیوی چودھری مترجمہ جمیل۔ دو روپے

جنت و جہنم - سیتا دیوی کے آٹھ افسانے مترجمہ جمیل دو روپے

آنسو - سیتا دیوی کا ایک ناول مترجمہ لقمان بی اے۔ قیمت [illegible]

دنیا کی رنگین مزاج عورتیں - از راجہ مہدی علی خاں دو روپے

ستارۂ صبح - دنیا کے بہترین افسانے۔ قیمت دو روپے

کملا - ایک بنگالی ناول کا ترجمہ۔ قیمت دو روپے

شمعِ حرم - نامور افسانہ نویسوں کے افسانوں کا مجموعہ قیمت [illegible]

غریبوں کا بہشت - ہندوستان کی تمام زندہ ادبی زبانوں کے افسانوی شاہکار۔ قیمت ایک روپیہ دو آنے

طلوعِ سحر - مختلف موضوع پر آٹھ نامور افسانہ نویسوں کے افسانے [illegible]

[illegible] - دکھی دل کی پکار۔ درد ناک ناول قیمت ایک روپیہ چار آنے

ایکٹرس کی آپ بیتی - المناک داستان ایک روپیہ چار آنے

فلمی پریوں کی داستان - ایکٹرسوں کی کہانیاں قیمت [illegible]

نور و نار - ایک عورت کی داستان الفت از شیام سندر دو روپے

دھڑکن - ناول شیام سندر پرویز۔ قیمت دو روپے

اس کی کہانی - ناول شیام سندر پرویز۔ قیمت دو روپے

برف کا دیوتا - سیاح ستاری کے افسانے ایک روپیہ چار آنے

کچے انار - انور کمال ایم اے کے افسانے قیمت ایک روپیہ

پیاسی - انور کمال ایم اے کا ایک ناول قیمت ایک روپیہ

[illegible] - دو طویل افسانے مترجمہ بیدار جالندھری قیمت [illegible]

رابندر ناتھ ٹیگور - سوانح حیات از احسان بی اے۔ قیمت [illegible]

سقراط - سوانح حیات
مسولینی - سوانح حیات
ڈی ویلیرا - سوانح حیات
از [illegible] قیمت [illegible]

بکھرے سپنے - تنویر نقوی قیمت ایک روپیہ

عالمگیر بک ڈپو - بازار سید مٹھا لاہور